معاشرتی نفسیات

برائے اہل پاکستان

علاؤالدین اختر
رینڈولف سیلر

مجمع البحرین
۴۔ میکلوڈ روڈ لاہور

جمالی

بادستیابی

معاشرتی نفسیات

(برائے اہل پاکستان)

علاؤالدین اختر  رینڈولف سیلر

مجمع البحرین - ۲ میکلوڈ روڈ - لاہور

بار اول ۱۰۰۰

قیمت .... ۳ روپے

۱۹۵۸ء

طابع

علمی پرنٹنگ پریس ، لاہور

پیش لفظ

زیر نظر مجموعہ کا نام کچھ غیر معمولی بڑا ہے یعنی "معاشرتی نفسیات برائے اہل پاکستان" ۔ لیکن اس نام کے تجویز کرنے میں مصنفین کے پیش نظر یہ بات ہے کہ پاکستانی قارئین پر واضح ہو جائے کہ کتاب مذکور خاص طور پر ان کے لیے تصنیف کی گئی ہے اور کسی غیر ملکی کتاب کی نقل نہیں ہے ۔

"معاشرتی نفسیات" موضوعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے اور ہر موضوع وضاحت طلب ۔ لیکن اس مجموعہ میں صرف ان ہی موضوعات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو مصنفین کے خیال میں زیادہ اہم اور ضروری ہیں ۔ نفس موضوع یعنی "معاشرتی نفسیات" کے متعلق دوسرے ممالک میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ہمارے ملک میں اب تک اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی حالانکہ موضوع اتنا اہم اور دلچسپ ہے کہ اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے ۔

کسی شے کے مطالعہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس شے کا ہر زاویہ سے بغور مشاہدہ کیا جائے اور دوران مشاہدہ اس شے کی ماہیت ، نوعیت اور دیگر اشیا کے ساتھ اس کا تعلق اور اس کا صحیح مقام مقرر کرنے میں جو دشواریاں پیدا ہوں ان کا حل تلاش کیا جائے اور اس سے متعلق نئے مسائل پیدا ہونے کے امکانات پر بھی غور کیا جائے ۔ ممکن ہے زیر نظر مجموعہ میں مختلف مسائل کے جو حل پیش کئے گئے ہیں وہ ناکافی اور معیاری نہ ہوں یا قارئین کو مصنفین کے مشاہدات قابل وثوق اور صحیح نظر نہ آئیں تو اس کا رد عمل یہ ہونا چاہئے کہ قارئین خود ان مسائل پر غور و فکر کریں اور مختلف زاویوں سے ان کا مشاہدہ کریں اور بہتر حل اور نتائج پیش کرنے کی سعی کریں ۔ لیکن اس سلسلہ میں اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ رائیں نجی ، داخلی کیفیات کی آئینہ دار اور تخیلی نہ ہوں بلکہ تحقیقات اور مشاہدات پر مبنی ہوں ۔ ہر فرد کی یہ کوشش ہونی چاہئے

کہ وہ یہ معلوم کرے کہ کسی مسئلہ کے متعلق کن حقائق کی ضرورت ہے اور اس کا خاطر خواہ حل کیونکر حاصل ہو سکتا ہے ۔

گنتی کے چند موضوعات پر اس کتاب میں جو بحث کی گئی ہے وہ بھی سیر حاصل نہیں کہی جا سکتی مثلاً بنی نوع انسان کے توارث کے متعلق ہم نے جو مواد فراہم کیا ہے وہ ممکن ہے نا کافی ہو اور اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نظر آئے اور اس سے متعلق بعض مستثنیات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہو ، کتاب مذکور کی حیثیت صرف ایک راہ نما نقشہ کی سی ہے جس پر صرف چند اہم نقاط نمایاں کر دیئے گئے ہوں تاکہ ان کی مدد سے قاری مقررہ راہوں کا سراغ پا سکے اور نئی راہیں نکال سکے ۔

کتاب کی زبان بھی حتی الامکان سلیس اور سادہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری کا ذہن فوراً معانی تک پہنچ سکے ۔ اگر اس کتاب کا مطالعہ قارئین کو مزید تفکر کی دعوت دیتا ہے اور وہ مندرجہ مضامین کو تحقیق کے لیے مشعل راہ بناتے ہیں تو ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے ۔

کتاب کو بہتر بنانے اور اس کی افادیت میں اضافہ کرنے کے سلسلہ میں مصنفین ہر قسم کا مشورہ قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں ۔ قارئین اپنے مشورے ، رائیں اور مواد جو کچھ بھی عنایت فرمانا چاہیں اسلامیہ کالج لائل پور کے پتہ پر ارسال کریں ۔ ہم ممنون ہوں گے ۔

علاؤالدین اختر
ایم ۔ اے (پنجاب) پاکستان
صدر شعبہ نفسیات
اسلامیہ کالج ، لائل پور

رینڈولف سیار
ایم اے ، پی ایچ ڈی هارورڈ (امریکہ)
صدر شعبہ نفسیات
ایف سی کالج ، لاہور

اظہار تشکر

اس کتاب کی تدوین و ترتیب کے مختلف مراحل پر جن حضرات نے ہماری معاونت فرمائی ان کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی ۔

جناب اقبال احمد خان لکچرار فارسی اور جناب اقبال صاحب لکچرار تاریخ ایف سی کالج لاہور کے ہم خاص طور پر شکر گزار ہیں جو اگرچہ اپنی مصروفیات کے باعث کتاب کی آخری تشکیل میں ہمارا ساتھ دینے سے معذور رہے لیکن فراہمی مواد اور ترتیب مضامین میں انہوں نے بیش بہا مدد فرمائی ۔ وہ اگر ہمارے ساتھ بطور مصنفین شامل ہو سکتے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی ۔

جناب پروفیسر حامد خاں بھٹی صدر شعبہ حیاتیات ایف سی کالج لاہور اور جناب محمود احمد صاحب سی ایس پی کے بھی ہم ممنون ہیں جنہوں نے کتاب کے پہلے اور نویں باب کا مطالعہ کیا اور انہیں بہتر بنانے کے سلسلہ میں مفید مشورے دیئے ۔

جناب میاں اقبال احمد آفیسر حبیب بنک لمیٹڈ لائل پور بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جن کے کار آمد مشوروں سے ہم وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہے ۔

ہم پروفیسر سراج احمد صاحب علوی صدر شعبہ فارسی و اردو اسلامیہ کالج لائل پور کے بھی سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے پورے مسودے کو بالاستعیاب دیکھنے اور زبان و بیان کے سقم دور کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی ۔ اس کے باوجود اگر زبان و بیان کی کوئی خامی باقی رہ گئی ہو تو اس کی تمام تر ذمہ داری کتاب کے پاکستانی مصنف پر عائد ہوتی ہے ۔ امریکی مصنف اس سے بری الذمہ ہیں ۔

آخر میں ہمیں جناب ڈاکٹر محمد اجمل صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے باوجود عدیم الفرصت ہونے کے دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارا کی ۔

دیباچہ

پاکستان میں نفسیات کی ترقی میں دو مشکلیں حائل ہیں ۔ (۱) یوں تو فلسفہ تمام علوم کی ماں ہے لیکن نفسیات کے ساتھ اسے ایک خاص لگاؤ اور یگانگت رہی ہے ۔ یہی یگانگت جہاں ابتدائی منازل میں نفسیات کی نشو و نما کا باعث تھی اب یہی ربط نفسیات کی ترقی میں حارج ہو رہا ہے ۔ نفسیات اپنے داخلی منطق کے تحت مشاہدہ اور تجربہ کرنے پر آمادہ ہے ، فلسفہ اسے قیاس آرائی اور فکری موشگافیوں میں مبتلا رکھنے پر خوش ہے ۔ نفسیات سائنس بننا چاہتی ہے ، فلسفہ اسے فلسفہ بنانا چاہتا ہے ۔ ماں اور بیٹے کی یہ آویزش مغربی ممالک میں مدت ہوئی ختم ہو چکی ۔ بیٹے نے اپنی بلوغت اور خود اختیاری کا اعلان کر دیا ہے اور سنا ہے کہ ماں اب نفسیات سے روٹھ کر " زبان " کے پیچھے پڑ گئی ہے ، لیکن ہمارے ملک میں فلسفہ اور نفسیات ابھی تک ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں ۔ نہ جانے یہ محبت کا الجھاؤ ہے یا عداوت کا ۔ اس کا انجام ایک ہی نظر آتا ہے کہ فلسفہ کی گرفت ڈھیلی ہو کر رہے گی اور نفسیات اپنی دو چار اینٹوں کی مسجد علیحدہ بنائے گی ۔ (۲) نفسیات کی تعلیم میں دوسری مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم مغربی مصنفین کی ان کتابوں کو '' حرف آخر '' سمجھے ہوئے ہیں جو مغربی معاشرے کے متعلق لکھی گئی ہیں ۔ ہم بھی تو معاشرہ میں رہتے ہیں ۔ ہمیں بھی تو حواس خمسہ تفویض ہوئے ہیں ۔ ہمارے ہاں بھی تو عقل و عشق کی چشمکیں ہوتی ہیں ۔ ہم بھی معاشرتی بندھنوں میں جھکڑے ہوئے ہیں ۔ رسم و رواج ، عہدہ و منصب ، قیادت و پیروی کے کرشمے روز ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم ان ہی کا مطالعہ کریں ؟ اپنی ذات کا ذاتی مشاہدہ کیوں نہ کریں ؟ مغرب کے ماہرین نفسیات کے مشاہدات اور تجربات کے چراغ سے اپنا چراغ جلائیں لیکن اپنی راہ آپ ڈھونڈھیں اور اپنی منزلیں خود متعین کریں ۔

ڈاکٹر سیلر اور علاؤالدین اختر نے اس کتاب میں ان دونوں ضرورتوں کو ملحوظ رکھا ہے ۔ انہوں نے نظریاتی بحثوں سے حتی الامکان گریز کیا

ہے کیونکہ وہ اکثر فلسفیانہ پیچ و خم میں کھو جاتی ہیں ۔ دوم یہ کہ انہوں نے معاشرتی نفسیات کو پاکستانیوں کے لیے ایک زندہ مضمون بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں خاصے کامیاب رہے ہیں ۔ انہوں نے مثالیں ہمارے معاشرے سے لی ہیں اور ہر جگہ ہمیں فکر و تدبر پر اکسایا ہے ۔ ہم خود سوچیں کہ ہم پاکستانی کیا ہیں ؟ ہمارے معاشرتی تعلقات کی نوعیت کیا ہے ؟ فرد اور جماعت کی کشمکش ہمارے ہاں کون سی صورت اختیار کر چکی ہے اور کر رہی ہے ؟ اپنی حالت پر خود سوچ بچار کی یہ دعوت ہی اس کتاب کو ایک منفرد اور ممتاز حیثیت عطا کرتی ہے ۔

یہ مطالعہ معروضی ہے اور معروضی مطالعہ کا مطالبہ بھی ہے لیکن معاشرتی نفسیات میں معروضی مطالعہ بھی چند بنیادی اقدار پر ہی استوار ہو سکتا ہے چنانچہ اس کتاب میں جا بجا اخلاقی اصولوں کا بھی ذکر آتا ہے ۔ جمہوریت ، انفرادی آزادی ، آزادئ نسواں ، دیانت اور صداقت وہ بنیادی اقدار ہیں جن کی جابجا اس کتاب میں تلقین بھی نظر آتی ہے ۔ یہ تلقین کسی سائنسی اصل الاصول کے متناقض نہیں ۔ کیونکہ ان اقدار کے بغیر کوئی معروضی مطالعہ ایک قدم نہیں چل سکتا ۔ اگر جمہوریت ، انفرادی آزادی ، دیانت اور صداقت نہ ہوں تو کسی معروضی مطالعہ کی نوبت ہی نہیں آ سکتی اور آخر یہ اقدار بھی تو انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں ۔ ان کی کمی یا ان کا انحطاط ایک نہایت اہم معاشرتی مسئلہ ہے ۔ اس زوال کے اسباب پر غور کرنا پاکستان کے ہر فرد کے لیے لازم ہے ۔ یہ غور و فکر محض ذہنی تعیش یا رونق بزم کی خاطر نہیں بلکہ حالات کو بدلنے کی خاطر ہونا چاہئے ۔ ان حالات میں ہم اور آپ سبھی شریک ہیں ۔ کیوں نہ ہم اپنی ذات کو سمجھنے سے ابتدا کریں اور ان حالات کے لیے اپنی ذمہ داری کا شعور حاصل کریں ۔ اپنی ذات کے ذریعے اپنی معاشرت اور اپنی معاشرت کے ذریعے اپنے آپ کو سمجھیں ۔ اپنی ذات پر زور دینے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم فقط اپنی شخصیت کی الجھنوں میں گرفتار رہیں ۔ بلکہ یہ کہ اپنے آپ کو معاشرہ کے آئینہ میں دیکھیں اور اپنے معاشرہ کو اپنی افتاد طبیعت اور رجحانات کے پیدا کیے ہوئے تعلقات کا مجموعہ سمجھیں ۔ ہم اپنے معاشرہ سے علیحدہ نہیں ہیں ۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایک غیر جانب دار ناظر کی طرح اپنے معاشرہ کی خرابیاں گنوائیں ، اپنے سماج

کی بد عنوانیوں کا ڈھنڈورا پیٹیں - اس ڈھنڈورے کا فقط ایک ھی مقصد ھے اور وہ یہ کہ ھم اپنے ضمیر کی اس دھیمی آواز کو خارجی شور و غوغا میں ڈبو دیں جو ان خرابیوں اور بد عنوانیوں کو ھمیں اپنی شخصیت میں ٹٹولنے کی دعوت دیتی ھے - ایک چینی مقولہ ھے " وہ میں ھوں " یہ قول اور کہیں عائد ھوتا ھے کہ نہیں، فرد اور سماج کے تعلقات پر ضرور عائد ھوتا ھے - ھمارے معاشرہ کی خوبیاں اور برائیاں ھماری خوبیاں اور برائیاں ھیں - ھم اپنے معاشرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے -

ھمارے ملک میں ڈاکٹر سیلر غالباً واحد ماھر نفسیات ھیں جنہوں نے اپنے شاگردوں اور ھم کاروں میں یہ سوجھ بوجھ، یہ طرز فکر پیدا کرنے کی کوشش کی ھے - ڈاکٹر سیلر کے زیر اثر علاؤالدین اختر میں یہ طرز فکر اس طرح رس بس گیا ھے کہ ان کی شخصیت کا لازمی جزو معلوم ھوتا ھے - یہ کتاب ان دونوں کی محنت کا نہایت صحت مند اور صحت بخش ثمر ھے - میرا بس چلے تو میں اس کتاب کا مطالعہ ھر پاکستانی کے لیے لازمی قرار دے دوں -

محمد اجمل

ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (لندن)

گورنمنٹ کالج - لاھور

فہرست مضامین

پہلا باب

انسان اشرف المخلوقات کی حیثیت سے

ابتدائیہ دُنیا میں حیوانات کی ہزاروں لاکھوں قسمیں پائی جاتی ہیں جو ڈیل ڈول شکل وصورت اور طرزِ زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان میں سے بعض تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں جیسے بلی اور سانپ بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے ہیں جیسے کتے اور گیدڑ اور بعض بہت بڑے بڑے گروہوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ مثلاً پرندے۔ شہد کی مکھیاں اور مچھلیاں وغیرہ ان مختلف قسم کے حیوانوں کی اپنی اپنی مخصوص فطرت اور جداگانہ اجتماعی نفسیات ہوتی ہے۔ جو حیوان تنہائی پسند ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور جو گروہوں میں رہنے کے عادی ہیں وہ تنہائی سے گھبراتے ہیں۔

انسان بھی انہی حیوانوں میں سے ایک ہے لیکن وہ دوسرے تمام حیوانوں سے حیرت انگیز حد تک مختلف ہے۔ اس کی معاشرتی نفسیات بہت پیچیدہ ہے وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اس کے اشرف المخلوقات کہلانے کی معقول وجوہات ہیں۔ اس باب میں دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے حیوانوں سے کس طرح مختلف ہے۔ اور اس اختلاف کی نوعیت

کیا ہے۔

انسان اور حیوان

انسان اور باقی دوسرے حیوانوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دوسرے حیوان ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور خود ماحول میں ڈھل جاتے ہیں لیکن انسان ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی بجائے اس کو اپنی ضروریات کے مطابق بدل ڈالتا ہے۔ جانور محض قدرت کی فراہم کردہ گھاس پھونس کھا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انسان اپنی غذا کے لئے زمین سے غلہ اگاتا ہے۔ پرندے خشک گھاس یا تنکوں کو جمع کر کے اپنا گھونسلا بناتے ہیں مگر انسان جنگلوں کو صاف کر کے اور پہاڑوں کو کاٹ کر اپنے لئے اینٹ گارے اور سیمنٹ سے مکان بناتا ہے۔ جانور ایک دوسرے سے چمٹ کر اپنے بدن کو گرمی پہنچاتے ہیں اسکے برعکس انسان سردی سے بچنے کے لئے گرم کپڑے آگ اور ہیٹر کا سہارا لیتا ہے اسی طرح جسم کو ٹھنڈک پہنچانے کیلئے اس نے برف پنکھے اور ایئر کنڈیشنر ایجاد کر لئے ہیں۔

حیوان۔ پنجے دانت اور جسمانی قوت سے کام لیتے اور اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ انسان جسمانی قوت کے علاوہ مصنوعی آلوں اور ہتھیاروں سے بھی کام لیتا ہے۔ حیوان اپنے بچوں یا شکار کو منہ میں دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں، انسان نے نقل و حرکت کے لئے سڑکیں، موٹریں، ریل گاڑیاں، طیارے اور بحری جہاز تک بنا لئے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے آلات کی مدد سے پوری پوری مشینیں بنانا سیکھیں اور پھر ان مشینوں کے ذریعے اور مشینیں بنائیں حتیٰ کہ بجلی، ٹیلیفون، ریڈیو، سینما اور دوسری بیسیوں ایسی چیزیں بنا ڈالی ہیں جن سے اسکی ساری طرزِ زندگی بدل گئی ہے۔

حیوان جیسا کہ ابھی ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ماحول کو جس حالت میں پاتے ہیں اسے بعینہٖ قبول کر لیتے ہیں۔ انسان اپنی جسمانی قوت اور ذہنی صلاحیت سے بنجر زمین کو سرسبز و شاداب کھیتوں میں بدل دیتا ہے۔ وہ لق و دق بیابانوں جنگلوں اور ویرانوں کو بڑے

بڑے خوبصورت اور بارونق شہروں میں تبدیل کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ علاوہ بریں ہر حیوان کی ایک مخصوص طرزِ زندگی ہوتی ہے جو کسی خاص ماحول یا آب وہوا ہی کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ اگر اس آب وہوا یا ماحول میں تبدیلی پیدا ہو جائے تو یا تو یہ حیوان ختم ہو جاتے ہیں یا انہی میں سے کوئی دوسری نوع پیدا ہو جاتی ہے جو خود کو نئے ماحول کے مطابق بدل ڈالتی ہے لیکن انسان بلا کسی جسمانی تبدیلی کے ہر طرح کے ماحول اور آب وہوا میں رہ سکتا ہے۔ برفستانی علاقے ہوں یا تپتے ہوئے ریگستان، گھنے جنگل ہوں یا ہرے بھرے میدان وہ ہر علاقہ اور ہر خطہ میں آباد ہے زمین کا شاید ہی کوئی چپہ اس کی دسترس سے بچا ہوگا۔ پھر حیوان عموماً سال ہا سال تک ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ انکے سینکڑوں سال پرانے محفوظ ڈھانچوں سے پتہ چلتا ہے کہ انکی طرز زندگی جیسے پہلے تھی قریب قریب ویسی ہی آج بھی ہے۔ اسکے برخلاف انسان کے رہنے سہنے کے طریق بالکل مختلف اور جداگانہ ہیں کہیں اسکا مسکن غاروں پہاڑیوں اور جھاڑیوں میں ہے۔ تو کہیں وہ کشتیوں، جھونپڑوں اور خیموں میں رہتا ہے کہیں سیدھے سادے مکان اسکی قیام گاہ ہیں تو کہیں عالیشان کوٹھیاں کہیں وہ رنگ برنگ کی پوشاک اور مختلف وضع قطع کا لباس پہنے نظر آتا ہے۔ تو کہیں مادر زاد عریاں کہیں وہ کچے گوشت سبزی ترکاری سے اپنا پیٹ بھرتا ہے تو کہیں قورمہ۔ پلاؤ۔ شامی کباب اسکے دسترخوان کی زینت بنتے ہیں کہیں وہ مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے تحت زندگی بسر کرتا ہے تو کہیں وہ ابھی نیم وحشیانہ زندگی گذار رہا ہے کہیں اپنے آبا و اجداد کے رسوم و رواج پر سینکڑوں سالوں سے جما ہوا ہے تو کہیں تھوڑے سے ہی عرصے میں وہ اپنا سارا طریقِ زندگی بدل ڈالتا ہے غرضیکہ انسان ایک ایسا حیوان ہے۔ جسکے رہن سہن کے طریقے وقت اور مقام کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ایک ہی معاشرہ اور ایک ہی بستی کے مختلف افراد کی زندگی مختلف نظر آئے گی۔ اور انکے رسوم ورواج اور پیشوں میں نمایاں فرق ملے گا

بہ الفاظ دیگر انسان ایک ایسا حیوان ہے جو تمدن کو جنم دیتا ہے۔ تمدن ان ہزاروں مادی چیزوں اور ذرائع و وسائل کا نام ہے جو انسان نے اپنی ضروریات کیلئے بنائے ہیں۔ اس میں وہ تمام عادات، اطوار رویے، مشاغل، سرگرمیاں اور رسم و رواج شامل ہیں۔ جو مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے ممتیز کرتے ہیں۔ مثلاً اسکیمو کے تمدن میں اسکے برف کے مکان، اسکے کتے، مچھلی پکڑنے میں اسکی مہارت، اسکے تفریحی مشاغل اور کہانیاں سبھی کچھ آجاتے ہیں، اسی طرح لنڈن کے لوگوں کا تمدن انکے لباس عمارتوں اسکولوں، اخباروں، کھیلوں اور انکے طرزِ زندگی پر محیط و مشتمل ہے۔ بعینہ ایک پنجابی کسان کا تمدن اسکے ہل۔ شادی بیاہ کے طریقوں۔ اسکے حقہ پینے کی عادت لسی سے غیر معمولی رغبت اور ایسی کئی دیگر چیزوں، پسند و ناپسند اور رسوم پر مشتمل ہوگا۔ جسکی وجہ سے اس کے لیل و نہار اسکیمو اور انگریز کی زندگی سے مختلف ہیں۔

ایک دوسرا فرق حیوان اور انسان میں یہ ہے کہ حیوانوں کی زندگی بڑی حد تک محض جبلی زندگی کہی جاسکتی ہے اگر جانوروں کے کسی ریوڑ کو پالتو جانوروں کیطرح بچپن ہی سے کسی خاص ماحول میں رکھنے کے بعد آزاد کردیا جائے تو کچھ مدت کے بعد ان کے طریق زندگی پر اس تربیت کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا رہن سہن میں وہ اپنی جنس کے دوسرے جنگلی جانوروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی بن مانس کے بچے کو بالکل اپنی اولاد کیطرح پالے تو کیا اس بن مانس کے بچے سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کی اسی طرح پرورش کرے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ کسی جانور کو کوئی خاص تربیت نہ دی جائے وہ مخصوص فطرت کے مطابق ہی عمل کرتا ہے اکتسابی عادات اور اطوار کو وہ اپنی اولاد میں منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا انسان کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ انسانی فطرت فی الحقیقت کیا ہے اس کے متعلق کوئی قطعی حکم لگانا تو مشکل ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی تمام تر زندگی جبلی قطعاً نہیں وہ ہر طرح

کا طریقِ زیست سیکھ سکتا ہے اور جب کوئی طریقِ زندگی اپنا لیتا ہے تو اسے جاری رکھنے اپنی اولاد میں اسے منتقل کرنے اور نئے ماحول کو حسبِ منشا ڈھالنے کی اسے بڑی قدرت حاصل ہو ممکن ہے بعض خاص قسم کے جانوروں میں تمدن کی کچھ ابتدائی نشانیاں یا جھلکیاں مل جائیں مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ اس میں اور انسانی تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ انسانی تمدن وہ تمدن ہے جو تقریباً گذشتہ پچاس ہزار سال سے پروان چڑھ رہا ہے۔ اس مدت سے پہلے انسان نے حیوانوں کی ایک نوع کی حیثیت سے آہستہ آہستہ جسمانی ترقی کرنا شروع کی اسی وقت دوسری انواع بھی اپنے اپنے مخصوص انداز میں نشو و نما پا رہی تھیں۔ حیوانی زندگی کی اس ترقی اور ارتقا کو ایک بہت بڑے درخت اور اسکی نشو و نما سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یہ درخت آج سے قریباً پانچ کروڑ سال پہلے اس وقت لگایا گیا ہوگا۔ جب اس زمین پر زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ کسی عظیم حیاتی قوت کے اثر ہی سے یہ درخت پروان چڑھا ہوگا۔ اس درخت کی ہر شاخ حیوانوں کی کسی بڑی نوع کو ظاہر کرتی ہے گویا سب سے نچلی شاخیں حیوانوں کی سب سے زیادہ سادہ قسموں کا پتہ دیتی ہیں۔ ان سے ذرا اوپر مچھلیاں اور پرندے، ان سے اوپر دودھ پلانے والے جانور اور ان سے اور اوپر بندر بالآخر درخت کی نشو و نما اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور وہ نوع وہ شکل اختیار کر لیتی ہے جیسی کہ وہ آج ہمیں نظر آتی ہے چنانچہ انسان اس درخت کی وہ آخری اور سر بلند ٹہنی ہے جہاں تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں کوئی اسکا شریک نہیں۔ اسی مقام پر پہنچ کر اسنے تمدن کو جنم دیا اور اسے نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنیکی صلاحیت حاصل کی ہے

ورثہ وہ تمام جسمانی صلاحیتیں اور تمدنی رسوم جو نسل بہ نسل منتقل ہوتی ہیں ورثہ کہلاتی ہیں۔
ورثہ کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ حیاتیاتی ورثہ ۲۔ معاشرتی ورثہ۔ حیاتیاتی ورثے سے مراد وہ جسمانی خصوصیات ہیں جو والدین سے اولاد کو ملتی ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ خصوصیات خون کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں۔ حقیقتاً یہ ان تولیدی خلیوں کے ذریعہ آتی ہیں جو بچے کے

وجود کا باعث بنتے ہیں حیاتیاتی ورثے کے تحت یہ یقینی ہے کہ گائے کا بچہ گائے اور انسان کا بچہ انسان ہو۔ جو بچہ جس نسل سے تعلق رکھتا ہے وہ اسی نسل کی حیاتیاتی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اور یہ حیاتیاتی ورثے کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ بچے شکل وصورت، رنگ روپ اور ذہانت میں دوسروں کی بہ نسبت اپنے والدین سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

معاشرتی ورثے میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جو پیدائش کے بعد بچہ اپنے ماحول اور زندگی کے تجربوں سے حاصل کرتا ہے۔ مثلاً زبان رسم ورواج۔ عادات اور اطوار وغیرہ۔ اس ورثے کے طفیل بچہ اپنے والدین کا تمدن حاصل کرتا ہے۔ گویا جس طرح سویڈن میں پیدا ہونے والا بچہ ورثہ میں بال اور جلدی رنگت حاصل کرتا ہے اسی طرح ان سے وہ یہ صلاحیت بھی حاصل کرتا ہے کہ انکی زبان کی سلاست اور روانی بھی سیکھ لے یہ بات البتہ کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بچے کی شخصیت کی تعمیر میں حیاتیاتی اور معاشرتی دونوں قسم کے ورثے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ افراد کے تولیدی خلئے مختلف ہو سکتے ہیں مگر پشت ہا پشت تک کسی گروہ کے تولیدی خلئے بالکل ایک سے رہتے ہیں۔ وہ جسم کے ایک خاص حصے میں اسطرح محفوظ رہتے ہیں کہ زندگی کے تجربات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کوئی گروہ اپنے رہن سہن کے طریقوں میں خواہ نمایاں تبدیلی کرلے اور اپنی طرز زندگی کو بدل ہی کیوں نہ ڈالے انکے تولیدی خلئے پچیس ہزار یا پچاس ہزار سال پہلے کے آبا واجداد کے تولیدی خلیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس لئے دنیا میں تمام نو زائیدہ بچے ماسوائے چند جزئی جسمانی صفات کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں نوع انسانی کا حیاتیاتی ورثہ مشترک ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس قابل ہوتا ہے کہ کسی بھی قسم کے تمدن کی تشکیل کرلے یا اسے اپنا لے۔ یہ معاشرتی ورثہ ہی ہوتا ہے جو کسی ایک گروہ کو کسی دوسرے گروہ سے نمایاں طور پر مختلف بناتا ہے۔ تمدنی اختلاف معاشرتی ورثہ کے باعث ہی پیدا ہوتا ہے۔ اگر پیدائش کے فوراً بعد بچوں کا تبادلہ کچھ اس طور پر ہو جائے

کہ کسی افریقی بچے کی پرورش روس میں کی جائے، امریکی بچے کی ہندوستان میں اور اسکیمو بچے کی عرب میں تو ان میں سے ہر بچہ اپنے والدین کی بجائے اپنے منہ بولے والدین کا طریق زندگی سیکھ لے گا۔ اگر کسی ملک کے دو مماثل توام بچوں کو پیدا ہوتے ہی ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور ان میں سے ایک کو لاہور کے کسی امیر گھرانے میں، اور دوسرے کو جاپان کے کسی دیہاتی کنبے میں پہنچا دیا جائے۔ تو چند ہی سال میں انہیں نمایاں فرق پیدا ہو جائے گا۔ نہ وہ ایک دوسرے کی زبان سکھیں گے۔ اور نہ ایک دوسرے کا کھانا پسند کریں گے حتی کہ ان کے کھانے پینے کے طور طریقے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔ ایک ہاتھ سے لقمہ کھائے گا تو دوسرا بانس کی تیلیوں سے۔ غرضیکہ ان کے رسوم و رواج۔ خیالات۔ مذہبی عقائد اور دلچسپیاں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جائینگی۔ اگر انہی دونوں بچوں کو دس گیارہ سال کی عمر میں ہی ایک دوسرے کے ماحول میں تبدیل کر دیا جائے۔ تو وہ تھوڑے ہی عرصے میں نئے ماحول سے کم وبیش مطابقت پیدا کر لیں گے لیکن یہ دونوں بچے اگر بیس بائیس سال تک مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے رہیں گے اور پھر انہیں نئے ماحول میں تبدیل کر دیا جائے تو انکے لئے اپنے اپنے ماحول اور اسکے تمدن کو اپنانا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشرتی ورثے سے متعلق متعدبہ چیزیں طفولیت اور بچپن کے چند سالوں ہی میں خوبی اور آسانی سے سیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی بچے کو جو آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے مرا تھا کس طرح

نوٹ۔ توام بچے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ماں کے دو بیضوں سے بنتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ماں کے ایک ہی بیضہ سے بنتے ہیں۔ یہ بیضہ بار آور ہونے کے بعد کسی نامعلوم سبب سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اسطرح جو جوڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں انہیں مماثل توام بچے کہا جاتا ہے۔ یہ بچے ہمیشہ یکساں وراثتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہم جنس ہوتے ہیں شکل وصورت میں وہ اتنے مشابہ ہوتے ہیں کہ انکی شناخت قریبی دوستوں کیلئے بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

دوبارہ زندہ کیا جا سکے اور اسے موجودہ زمانہ میں کراچی کے کسی کنبے میں پہنچا دیا جائے تو وہ بہت جلد کراچی کے تمام بچوں کی طرح رہنے سہنے لگے گا۔ گویا معاشرتی لحاظ سے وہ اپنے وحشی بھائی بہنوں سے بالکل مختلف ہو جائے گا۔ کیونکہ اسکا معاشرتی ورثہ موجودہ کراچی کا ہوگا اسکے برعکس حیوانات کے نوزائیدہ بچوں کو دیکھئے ان کا طریق زندگی وہی ہوگا۔ جو ہزاروں سال پہلے انکے آبا و اجداد کا تھا بشرطیکہ قدرتی ماحول نے انہیں کوئی دوسرا طریق زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔

حیاتیاتی اعتبار سے تو موجودہ انسان آج بھی اسی نقطہ پر ہے جہاں ہزاروں سال پہلے اسکے آبا و اجداد تھے لیکن جہاں تک تہذیب و تمدن کا تعلق ہے وہ اس نقطے سے شروع کرتا ہے جہاں نوعِ انسانی ہزاروں سال کی پیہم کوشش کے بعد پہنچی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ بچے اپنے والدین کی اکتسابی صفات حیاتیاتی ورثے کے طور پر حاصل نہیں کرتے۔ والدین اگر تن دہی اور جانفشانی سے علم حاصل کریں تو کیا اللہ تعالےٰ کی طرف سے انہیں یہ انعام نہیں ملنا چاہیئے کہ انکی اولاد ذہین اور اچھی دماغی صلاحیتوں کی مالک ہو۔ ہزاروں سال ریگستانوں میں رہنے کے بعد کیا عربی بچوں کو فطری طور پر اچھا صحرائی نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا نوع انسانی کی ترقی کی رفتار تیز تر نہ ہو جاتی۔ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہوتا یہ کہ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیاں بھی حیاتیاتی ورثے کے ذریعے منتقل ہوتی رہتیں۔ اور اسطرح مجرموں کی اولاد بھی مجرمانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتی۔ حیاتیاتی طور پر ہر گروہ دوسرے سے اسقدر مختلف ہو جاتا کہ ان کے باہمی تعلقات اور رشتے ناطے مشکل ہو جاتے۔ ان میں سے بعض صرف شہروں میں رہنے کے لئے موزوں ہوتے اور بعض محض جنگلوں میں۔ ہر گروہ کے افراد کے لئے اپنی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کا سیکھنا قریباً ناممکن ہو جاتا نتیجہ یہ ہوتا کہ دنیا کے چپہ چپہ پر ایسے انسانوں کی بستیاں ہوتیں جنکی زبان، رسوم و رواج معاشرت و تہذیب دوسروں کے لئے ناقابل فہم ہوتیں۔ اگرچہ ہوتے یہ سارے انسان ہی مگر

نوع انسانی کی مجموعی ترقی کی رفتار بہت سست ہو جاتی اور دنیا جو روز بروز وحدت کی طرف بڑھ رہی ہے انتشار کا شکار ہو جاتی۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسمیں کسی بھی تمدن کو اپنا لینے یا حاصل کرنیکی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ کوئی بھی انسانی گروہ معاشرتی ورثے کی بدولت خوب ترقی کر سکتا ہے جیسے کسی کنبے کی دولت میں نسلاً بعد نسلٍ اضافہ ہوتا جائے حالانکہ پیدائش کے وقت کوئی بچہ بھی اپنے ساتھ کسی قسم کی کوئی دولت نہیں لاتا۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان ہی تنہا وہ حیوان کیوں ہے جو ماحول کو اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق بدل سکتا ہے مختلف قسم کے تمدنوں کو جنم دیتا ہے اور اپنی اولاد کو ایک پیچیدہ قسم کا معاشرتی ورثہ سونپتا چلا جاتا ہے اسکی وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسکے لئے تو ایسا کرنا ممکن ہوا مگر دوسرے سینکڑوں حیوانوں کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ اس سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں دو چیزیں سامنے رکھنی ہونگی ایک تو انسان کی جسمانی خصوصیات اور دوسرے اس کی ابتدائی پرورش اور پرداخت کی نوعیت۔

انسان کا ایک خاص وصف

بادی النظر میں انسان کا جسم بے کار سا نظر آتا ہے نہ تو وہ دوسرے حیوانوں کیطرح مضبوط اور توانا ہے اور نہ اسے کسی خاص کام میں تخصص ہی حاصل ہے۔ وہ دوڑ ضرور سکتا ہے لیکن نہ تو وہ شیر یا شکاری کتے کی طرح تیزی اور پھرتی کے ساتھ شکار کا پیچھا کر سکتا ہے اور نہ خرگوش یا ہرن کی طرح بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ وہ درخت پر چڑھ سکتا ہے لیکن بندر کی سی پھرتی اور گلہری کی سی تیاری اسمیں کہاں۔ وہ تیر سکتا ہے لیکن مچھلی کی سی مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ اسے ہاتھی کی طرح چیزوں کو کچل دینے کی طاقت ملی ہے اور نہ ریچھ کی قوت اور چیتے کا تجسس اسکی قوت شامہ اور قوت سامعہ بعض حیوانوں کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔ اسکی آنکھیں اچھی ضرور ہیں لیکن اسے گدھ یا چیل کی سی بینائی نہیں ملی ہے کہ وہ آسمان کی بلندیوں سے اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے سردی

سے بچنے کے لئے نہ اسے سمور ملی ہے۔ اور نہ بال و پر۔ غرضیکہ انسان کی جسمانی ساخت بہت ہی ناقص معلوم ہوتی ہے کیا اس کمزور اور بے بس مخلوق کی حالت قابلِ رحم نہیں ؟

بے شک انسان کو جسمانی قوت میں کوئی تخصص حاصل نہیں ہے لیکن اسے یہ خصوصیت ضرور حاصل ہے کہ وہ بیک وقت بہت سے کام بخوبی سرانجام دے سکتا ہے وہ تیر سکتا ہے۔ دوڑ سکتا ہے۔ لڑ سکتا ہے درختوں پر چڑھ سکتا ہے اور کیا کچھ نہیں کر سکتا در اصل جسمانی قوت میں تخصیص نہ رکھنا ہی انسان کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر وہ کسی خاص کام میں ماہر ہوتا تو وہ محض اسی مہارت پر بھروسہ کرتا، اور اسی کے سہارے زندگی بسر کرتا۔ تیز رفتار جانور کو ہمیشہ اپنی تیز رفتاری پر ناز ہوتا ہے۔ درختوں پر چڑھنے والے جانور اپنی اس صلاحیت پر کس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ تیراک کو تیراکی کا زعم ہوتا ہے۔ ریچھ کو بھلا کب اپنی قوت پر اعتماد نہیں ہوتا؟ بالکل اس طرح اگر انسان کو بھی شیر جیسے پنجے ملے ہوتے تو شکار کرتے وقت وہ صرف انہیں سے کام لیتا لیکن انسان چونکہ قریباً سبھی کام کر سکتا ہے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی خاص طور پر ماہر نہیں ہے۔ اسلئے موقع اور محل کے مطابق وہ بہت سے کاموں سے صرف موزوں ترین کو منتخب کرتا ہے۔ انتخاب کرنے میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے انسانی جسم کے لئے محض ایک خصوصیت درکار ہے۔ اور وہ ہے ترقی یافتہ و توانا دماغ۔ ایک ایسا دماغ جو فائدہ اور نقصان میں تمیز کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا طرۂ امتیاز غور و فکر کرنا ہوا۔ دوسرے یہ عین قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال کی ارتقائی مدت میں جن اعضا سے زیادہ کام لیا گیا وہ مضبوط و محفوظ ہوتے گئے اور جہاں کہیں ضرر رساں اعضا بڑھتے اور قوی ہوتے گئے انہوں نے آہستہ آہستہ متعلقہ جنس کو ہی ہلاک کر دیا۔ فرانسیسی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ اعضا اپنے اپنے وظیفے سے بنتے ہیں۔ چنانچہ غور و فکر میں سب سے اہم چیز انتخاب ہے۔ انتخاب کی ضرورت نے دماغ کو ترقی کرنے کا موقعہ دیا اور ترقی یافتہ دماغ نے انتخاب کو آسان تر کر دیا۔ انسان کی اپنی کمزوری نے اسے سوچنے پر مجبور کیا اس کے جسم پر سمور یا بال و پر نہ تھے جن کے ذریعے وہ خود

کو سردی یا گرمی سے محفوظ رکھ سکتا اس لئے تن ڈھانپنے کے لئے اسے لباس اور سر چھپانے کے مسکن کی ضرورت محسوس ہوئی وہ گھاس پات کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا اس لئے اسے دوسری قسم کی غذائیں ڈھونڈنا پڑیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایک مشہور ضرب المثل ہے جو درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احتیاج تخیل کے لئے فکر کے دروازے ضرور کھول دیتی ہے۔

انسان کی جسمانی ساخت نے غور و فکر کے سلسلے میں متعدد طریق پر اسکی مدد کی ہے۔ چلنے کی صلاحیت نے اسے بھوئے مشام سے اٹھا کر بصارت کی دنیا میں لا کھڑا کر دیا۔ دیکھنے سے سوچنے کی قوت میں اضافہ ہوا۔ دیکھو تو ایک کتا بھی سکتا ہے اور کسی چیز کو دیکھ کر اس کے پاس پہنچ بھی سکتا ہے مگر وہ اس چیز کو ہاتھوں میں اٹھا کر اچھی طرح پرکھ نہیں سکتا۔ یہ صلاحیت صرف انسان کو ملی ہے اس کی آنکھیں چہرے پر سامنے کی طرف اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ وہ ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چیز کا گہرا مطالعہ کر سکتا ہے۔ پھر چونکہ وہ ٹانگوں پر چلتا ہے اس لئے اسکے ہاتھ استعمال کے لئے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اسکے انگوٹھے اور انگلیوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ وہ انکی مدد سے کسی چیز کو بخوبی پکڑ کر اٹھا سکتا ہے چیزوں کو اٹھانے، دیکھنے اور پرکھنے سے آلات اور اوزار بنانے میں مدد ملتی ہے اور اس سے غور و فکر کو سہارا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے منہ اور حلق کی ساخت نے مختلف قسم کی آوازوں کا پیدا کرنا اسکے لئے ممکن اور آسان بنا دیا ہے۔ اس خاص صلاحیت اور ترقی یافتہ دماغ نے مل کر انسان کو "زبان" ایجاد کرنے میں بڑی مدد دی حقیقت تو یہ ہے کہ زبان کی ایجاد نے اسکی ترقی کی رفتار کو تیز تر کر دیا ہے۔ زبان اور خیالات کی ترقی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات میں سے کچھ خصوصیات بعض اعلیٰ طبقے کے حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن انسان میں بہ یک وقت مجموعی طور پر یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم ہوتی ہیں۔ جن کی بنا پر وہ دوسرے حیوانوں سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ چونکہ وہ سوچنے کی ضرورت اور صلاحیت میں دوسرے حیوانوں سے بہت بڑھا ہوا ہے اس لئے اگر اس کے دماغ کے متعلقہ حصے نسبتاً

زیادہ توانا اور صحت مند ہو گئے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ پہلے ہمارا دماغ ترقی کرے پھر ہم سوچنا شروع کریں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہم غور و فکر کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ دماغ ترقی کرتا ہے مختلف قسم کے بن مانسوں نے ہزاروں سال تک زندگی کی جدوجہد جاری رکھی لیکن امتداد زمانہ سے صرف وہ بچ سکے جن کے جسم اور دماغ نے ساتھ ساتھ ترقی کی۔ اگر انسان ہر حیثیت سے کمزور اور بے بس ہوتا تو نوع انسانی کب کی ناپید ہو گئی ہوتی۔ انسان اسی امتیاز کے باعث اشرف المخلوقات کے درجہ پر فائز ہے

انسان کے کچھ اور امتیازی خصائل

گزشتہ سطور میں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ تہذیب و تمدن کو اپنی اولاد میں منتقل کرنے کی صلاحیت صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ لیکن اسکے علاوہ کچھ اور بھی امتیازی خصائل ہیں۔ جنکا ذکر ضروری ہے۔ جب ہم کسی نوزائیدہ انسان کے بچے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اسپر بڑا ترس آتا ہے۔ اس کا وجود گوشت و پوست کے ایک لوتھڑے سے زیادہ نہیں دوسروں کی مدد کے بغیر وہ چند لمحے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسکی بے دست وپائی اور محتاجی کا زمانہ نسبتاً بڑا طویل ہوتا ہے۔ وہ ماں کا واحد بچہ ہوتا ہے اگر خدا نخواستہ وہ مر جائے تو ماں کی گود طویل مدت کے لئے یا ہمیشہ کے لئے خالی ہو جاتی ہے۔ اسکی ماں بلی یا کتے کیطرح جھول کے جھول بچے پیدا نہیں کرتی کہ اگر ان میں سے ایک دو مر جائیں تو چنداں فرق پڑے۔ یہ ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جو بچے کی حالت کو بڑی قابلِ رحم اور افسوس ناک بنا دیتی ہیں مگر یہ فی الواقع حقائق کچھ ایسے زیادہ تشویشناک نہیں ہیں۔ حیوان اپنی حفاظت دو طرح سے کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً مچھلی، سانپ گھڑیال بے شمار بچے دیتے ہیں تاکہ اگر پوری حفاظت اور نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے انکی ایک بڑی تعداد ضائع بھی ہو جائے تو نسل فنا نہ ہو بعض ایسے ہیں جو گنے چنے بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی پوری پوری حفاظت اور نگہداشت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہو تو انکی حفاظت نگہداشت اور تعلیم نسبتاً

مشکل ہوتی ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر انسان کی حالت پر غور کیجئے اور دیکھئے وہ اپنے والدین کا اکیلا بچہ ہوتا ہے۔ دونوں کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ اور چونکہ حیوانوں کے بچوں کے مقابلے میں یہاں بچوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ انکی حفاظت و پرورش احسن طریقہ پر ہو سکتی ہے۔ انکی خاص تعداد کافی لمبی عمر پاتی ہے۔ اور انکی تعلیم و تربیت کے زیادہ بہتر و مناسب مواقع میسر ہوتے ہیں جہاں تک بچپن یا دوسروں کی محتاجی کے زمانہ کا تعلق ہے۔ ادنے طبقے کے حیوانوں میں یہ زمانہ سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ بعض حالات میں بچہ اپنے والدین کو جانتا بھی نہیں۔ مچھلی انڈے دے کر غائب ہو جاتی ہے بچے خود ہی انڈوں سے نکل آتے ہیں۔ نہ انکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکی ماں کون ہے اور نہ ماں بچوں کو پہچان سکتی ہے۔ پرندے بچے نکلنے کے بعد بہت ہی تھوڑی مدت کیلئے انکی نگہداشت کرتے ہیں۔ مرغی کے بچے انڈوں سے نکلتے ہی دانے پر گرنے لگتے ہیں۔ اگر غذا ان کی پہنچ میں ہو اور ان کو کسی طرح گرم رکھا جا سکتا ہو تو انہیں ماں کی حفاظت اور نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی چوہے اور بلی کے بچوں کو شروع میں کچھ دنوں تک ماں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن بہت جلد وہ اپنے سہارے زندہ رہنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ریچھ کا بچہ البتہ سال بھر سے کچھ زیادہ ماں کے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن اچانک ماں اسکو چھوڑ کر ایسا غائب ہوتی ہے کہ پھر اسکی طرف رخ بھی نہیں کرتی اس کے برخلاف انسان کا بچہ ان تمام حیوانوں کے مقابلے میں انتہائی بے بس اور معذور ہوتا ہے جب تک وہ چند سال کا نہ ہو جائے والدین کی حفاظت اور سہارے کے بغیر بالکل زندہ نہیں رہ سکتا اسکی جبلی قوتیں یا دیگر صلاحیتیں ایسی نہیں ہوتیں کہ وہ شروع ہی سے اپنا آپ سہارا ہو سکے وہ دودھ پی سکتا ہے لیکن دودھ پینے کے لئے ماں کا سینہ ضروری ہے۔ وہ رو سکتا ہے لیکن جب تک کوئی دوسرا اسکی ضرورت کو رفع نہ کرے اسکا رونا بے کار ہے۔ اچھے خاصے موافق ماحول میں بھی وہ اپنی غذا دوسروں کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ متمدن اور مہذب معاشرہ میں تو بچے کو پچیس ۲۵ سال تک خاندان کا دستِ نگر رہنا پڑتا ہے۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسان کا بچہ بہت ہی بے بس اور حقیر ہے لیکن ہم اگر بغور مطالعہ کریں تو اسکی یہی بے

دست وپائی اس کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی ہے۔ اسی کی بدولت وہ اپنے والدین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور ان سے وابستہ ہوجاتا ہے والدین اور اولاد کی اسی وابستگی و محبت سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو تعلیم و تربیت کا بہترین گہوارہ اور درس گاہ ہے۔ اسی جگہ چھوٹے بڑوں سے کچھ سیکھتے رہتے ہیں اور بڑے معاشرتی تمدن کو بچوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک تیسری بات یہ بھی ہے کہ جانوروں کی طرح انسانوں کے لئے مجامعت اور مقاربت کا کوئی مخصوص مختصر موسم نہیں ہوتا بلکہ مرد وعورت کی باہمی کشش تمام سال یکساں رہتی ہے جسکی وجہ سے خاندان کے تمام افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ دراصل تہذیب وتمدن کی اساس ہی خاندان پر ہے جو نہایت مستقل اور پائدار ادارہ ہے۔

اس فوقیت اور برتری کے باوجود انسانی تمدن وترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے جسم و دماغ کی موجودہ حالت اور کیفیت حاصل کر لینے کے بعد بھی انسان ہزاروں سال تک وحشیانہ زندگی بسر کرتا رہا اسکا رہن سہن حیوانوں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اسکی ایجادات کا دور شروع ہوا تو اسکی ترقی دن دونی رات چوگنی ہوگئی۔ اس نے آگ جیسی خوفناک چیز کا گھریلو استعمال ڈھونڈ نکالا۔ چرخی۔ چاقو۔ نیزہ اور تیر کمان ایجاد ہوئے جنکی بدولت غذا کی فراہمی آسان تر ہوگئی اور انسانی نوع کو مزید ایجادات کے لئے فرصت مل گئی۔ آخر کار "فنِ تحریر" وجود میں آیا اب علم کو تقریروں اور آوازوں کے ذریعہ منتقل کرنے کے علاوہ گویا ایک اور موثر ذریعہ ہاتھ لگ گیا۔ اس کے بہت بعد طباعت آئی جس سے یہ ہوا کہ ایک ہی کتاب کے نسخے مختلف جگہوں میں پہنچ گئے۔ اور اب تو ایسے ایسے ذرائع اور وسائل دریافت ہوچکے ہیں کہ آئے دن کسی نہ کسی نئی چیز کے بنا لینے کی خبر ملتی رہتی ہے۔ خود ایجاد کے عمل کو نسبتاً آسان کرنے کے لئے حوالہ کی کتابیں، کیمیائی اعمال، بڑی بڑی تجربہ گاہیں حتیٰ کہ برقی دماغ تک وضع کئے جاچکے ہیں۔

مندرجہ بالا حقیقت کے باوجود ہمارا یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ آخر انسان کس قسم کا حیوان ہے کیا وہ واقعی دوسرے حیوانوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔

بعض دوسرے حیوان بھی بعض صلاحیتوں میں اسکے شریک ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے جانور اپنے بچوں کو اپنی دیکھ بال اور حفاظت کے طور طریقے سکھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو زمین کھودنے یا غذا تک پہنچنے کے لیئے سادہ سے اوزاروں کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ لیکن کوئی اوزار بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ انسان کو سیکھنے والا حیوان بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہی صرف یہ قدرت نہیں رکھتا کہ کچھ سیکھ لے بعض دوسرے حیوان بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً چوہے بھی انسان کیطرح اپنی غذا تک پہنچنے کا راستہ جلد ہی معلوم کر لیتے ہیں کئی جانور کبھی کبھی کسی کام کو کرنے کے لئے نئے نئے طریقے بھی نکال لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں میں اپنی طرح زندگی گذارنے کا طریق سکھلانیکی صلاحیت بھی رکھتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ جانوروں اور انسانوں کے فطری رجحانات میں کوئی واضح امتیاز نہیں قائم کیا جاسکتا۔ پھر بعض جیوانوںکی سیدھی سادی زبان بھی ہوتی ہے۔ خطرے سے آگاہ کرنے یا اپنے ساتھی کو بلانے کے وہ بعض صوتی اشارے بھی خوب جانتے ہیں۔ لہٰذا انہیں سے کوئی بات ایسی نہیں جو فقط انسان ہی کا طرۂ امتیاز ہو۔ انسان کو جو فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ اسکی بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی جسمانی اور دماغی خصوصیات طویل بچپن اور مضبوط اہلی رشتوں کے سبب ایک ایسی معاشرتی زندگی کا مالک ہے جس سے دوسرے جیوان محروم ہیں۔ تہذیب و تمدن کے قیام و اشاعت کی بدولت وہ دوسرے جیوانوں سے بالکل مختلف ہوتا جا رہا ہے۔ علم حاصل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں اسے کمال حاصل ہے۔ کوئی دوسرا جانور اسکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کوئی دوسرا جیوان بھلا اس ضمن میں اسکا ثانی کیونکر ہو سکتا ہے؟

دوسرا باب

رسم ورواج

انسان کی چند ضرورتیں

پچھلے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ تمدنی اختلاف معاشرتی ورثے کا نتیجہ ہوتا ہے باالفاظ دیگر یہ اختلاف رسوم ورواج کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ رسم یا رواج اس مخصوص طریقے کو کہتے ہیں جو کسی قوم کے بیشتر افراد ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے اختیار اور وضع کر لیتے ہیں۔ اس باب میں ہم مختلف انسانی رواج اور ان سے پوری ہونے والی ضروریات کے باہمی تعلق پر تفکر کریں گے۔

انسان کی خاص خاص ضرورتوں کو حسب ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ **جسمانی ضروریات۔** جسمانی ضروریات ایسی ضروریات ہوتی ہیں جن سے جسمِ انسان کی حفاظت اور نشوونما ہوتی ہے۔

۲۔ **جنسی ضروریات۔** جنسی ضروریات وہ ضروریات ہیں جو مرد اور عورت کی باہمی کشش کا موجب ہوتی ہیں۔ انہی سے پدرانہ الفت اور مادرانہ شفقت پیدا ہوتی ہے جو بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا سبب بنتی ہے۔

۳۔ **معاشی ضروریات۔** معاشی ضرورتوں کے تحت انسان اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے اور ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک کرتا ہے۔

۴۔ کامیابی اور عزت نفس کی ضروریات

کامیابی اور عزت نفس کی ضرورتوں کا معاشی ضروریات سے بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ یہ انہیں کی پیداوار ہیں۔ یہ انہیں ضروریات کا کام ہے کہ وہ انسان میں کامیابی اور کامرانی عزت اور وقار حاصل کرنے کے جذبہ کو ابھاریں۔

۵ اعلیٰ ضروریات

اس زمرہ میں وہ ضرورتیں شمار ہوتی ہیں جنکی تسکین اسوقت ہوتی ہے۔ جب انسان، آرٹ، موسیقی، علم، فلسفہ اور مذہب کے ذریعے زندگی کے حقیقی معنوں کو تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔

جانور اپنی زندگی پہلی تین قسم کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ آخری دو قسمیں صرف انسان کے لئے مخصوص ہیں اور اہم بھی۔

ضرورتوں کی متعلقہ رسمیں

اب ہم ان رسوم کا ذکر کریں گے جن کے ذریعے متذکرہ بالا ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں:۔

۱۔ رسوم جنسے جسمانی ضروریات پوری ہوتی ہیں ہم جو کچھ کھاتے ہیں اور جس طرح کھاتے ہیں اسکا تعلق بیشتر رسم و رواج سے ہے۔ ایک پنجابی کسان گیہوں کی موٹی روٹی، چنے اور سرسوں کے ساگ اور لسی کا بے حد شوقین ہے۔ اسے گوشت بھی بہت پسند ہے مگر سور کے گوشت کے خیال ہی سے کانپ جاتا ہے۔ گڑ، دہی اچار وغیرہ بھی اسکے من بھاتے کھانے ہیں۔ وہ ہاتھ سے کھاتا ہے اس کے یہاں عام طور پر عورتیں اور مرد ایک ساتھ نہیں کھاتے۔ اسکے برعکس ایک چینی کسان دودھ دہی اور گھی غذا کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔ وہ سال میں صرف دو تین بار گوشت کھاتا ہے اور وہ بھی عموماً سور کا۔ وہ چائے میں چینی نہیں ڈالتا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ چینی برائے نام ہی کھاتا ہے۔ ہاتھ سے کھانے کی بجائے وہ لکڑی کی تیلیوں سے کھاتا ہے۔ اس کے رسوم اور رواج پنجابی کسان سے بالکل مختلف ہیں پاکستانی دلیا اور یخنی کو مریضوں کا کھانا تصور کرتے ہیں۔ اس کے خلاف مغربی ملکوں میں لوگ قریباً ہر کھانے پر یخنی پیتے ہیں۔ اور انتہائی گرم موسم کے علاوہ ہمیشہ مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ میں دلیا کو قومی غذا کہتے تھے۔ زیادہ تر امیر کی

گئے کی ران کے گوشت کو تمام گوشتوں سے اچھا سمجھتے ہیں اور انکے کھلاڑی آزادانہ کھاتے ہیں پاکستانی بڑے کے گوشت کو گائے کے گوشت سے اچھا سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک گائے کا گوشت صحت کے لئے اچھا نہیں ہوتا کٹر ہندو کسی صورت میں بھی گائے کا گوشت نہیں کھاتے بہت سے ملکوں میں خاندان کے تمام افراد ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں لیکن بعض ملکوں میں عورتیں اور مرد الگ الگ کھاتے ہیں بچوں کے لئے کوئی قید نہیں وہ دونوں کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔ افریقہ کے بعض علاقوں میں کسی کے سامنے کھانا کھانا بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کے بعض کالجوں میں طلبا بڑی جلدی جلدی کھاتے ہیں اور کھاتے وقت بہت کم بات چیت کرتے ہیں لیکن بعض دوسرے کالجوں میں کھانے کی میز خوش گپیوں کے لئے بہترین جگہ ہوتی ہے۔

مختلف قوموں اور معاشرتی طبقوں کے کھانے پینے کے طریقوں اور رسوم پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ہمیں تو یہاں صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ کہ تمام حیوان اور انسان کھاتے ہیں۔ ضرورت ہر جگہ ایک ہے۔ البتہ اس ضرورت کی تکمیل اور تسکین کے طریقے مختلف ہیں۔ اسکے علاوہ افراد کے احساسات پسندیدگیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہت سے چینی سانپ کو بہت خوش ذائقہ اور امیرانہ غذا تصور کرتے ہیں۔ اسکے برخلاف کئی لوگ سانپ کھانے کے خیال سے لرز اٹھتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو انسان کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں۔ اسی طرح گرچہ ہمارے مکان بستر اور لباس وغیرہ بڑی حد تک آب وہوا اور دستیاب ہونے والی اشیاء کا اثر ہوتا ہے۔ تاہم چیزیں رسوم و رواج سے کسی طرح کم متاثر نہیں ہوتیں۔ ان کا مقصد گرمی یا سردی سے جسم کو محفوظ رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ رسوم کی پابندی بھی ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں سنگاپور میں ایک اعلیٰ انگریز افسر کو جس نے گرمی سے تنگ آکر عام مجمع میں اپنا کوٹ اتار دیا تھا بہت ملامت کیا گیا۔

حیوان غذا تلاش کرتے ہیں۔ انسان روزی کماتا ہے جس سے اسکی جسمانی اور دوسری ضروریات کی تکمیل میں مدد ملتی ہے لیکن مختلف قوموں اور تمدنوں میں تحصیل معاش کے مختلف طریقے

رائج ہیں۔ ان پر بھی رسوم و رواج کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان اور بہت سے دیگر ملکوں میں خاص کر طبقہ امرا میں یہ عام رواج ہے کہ صرف شوہر روزی کماتا اور خاندان کی کفالت کرتا ہے۔ لیکن امریکہ اور روس میں لاکھوں عورتیں ملازمت کرتی ہیں۔ بہت تمدنوں میں عورتیں کام کرتی ہیں مگر مرد یونہی مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور لڑ جھگڑ کر اپنا وقت گزارتے ہیں بعض جگہ بچے بھی محنت مزدوری کر کے کچھ لاتے ہیں اور گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن بعض جگہوں پر اسکا قطعاً رواج نہیں ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض خاص قسم کے کام صرف خاص ہی طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک "بابو جی" ہٹے کٹے ہونیکے باوجود اپنا سامان خود اٹھاتے میں عار محسوس کرتے ہیں اسکے لئے وہ قلی ہی بلاتے ہیں چاہے قلی عمر و قامت یا وزن میں ان سے آدھا ہی کیوں نہ ہو۔ انگلستان اور امریکہ کے شریف اور معزز خاندانوں میں خود ہی جھاڑو دینے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن پاکستان میں اسے اچھا نہیں خیال کرتے اور اسکے لئے کوئی ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کوئی ایسا کام کرنے سے جسے لوگ گھٹیا اور حقیر تصور کرتے ہوں بھیک مانگ لینا بہتر سمجھتے ہیں خواہ یہ کام کتنا ضروری اور فائدہ مند ہی کیوں نہ ہو۔ انگلستان میں ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ بیشتر لوگ ایسے کاموں کو ترجیح دیتے تھے۔ جن سے انکی "سفید پوشی" برقرار رہے خواہ تنخواہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ یہی حال دنیا کے چند اور ملکوں کا ہے۔ چین میں پڑھنا لکھنا دستکاری کے مقابلے میں زیادہ باعزت سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ بریں دنیا بھر میں عام طور پر عورتوں اور مردوں کے پیشے اور کام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر جگہ ایک سا کام ہی کرتے ہوں۔ کہیں کھیتی باڑی اگر مرد کرتے ہیں تو کہیں یہ کام صرف عورتوں کے سپرد بھی ہوتا ہے۔ بعض معاشروں میں کھانا پکانے کا کام مردوں کے ذمے ہوتا ہے اور بعض میں عورتوں کے۔ افریقہ کے بعض قبیلوں میں اگر عورتوں کو سلائی کا کام سکھایا جائے تو مرد اسکو باعثِ ننگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اسکے نزدیک یہ کام صرف مردوں کا ہے۔

(ب) شادی بیاہ اور تربیت اولاد کی رسمیں

دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ

ایسا ہو جہاں عورتوں اور مردوں میں ایک دوسرے کے لئے جاذبیت اور کشش نہ ہو لیکن ہر جگہ ان کے شادی بیاہ، بچوں کی پرورش اور تربیت کے طریقوں میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں عام طور پر مرد کی صرف ایک بیوی ہوتی ہے لیکن پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی ایک مرد بیک وقت ایک سے زیادہ بیویوں کا شوہر ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ بعض ایسے ملک بھی ہیں جیسے تبت جہاں ایک عورت کے کئی شوہر ہو سکتے ہیں۔ بعض معاشروں میں عورت اور مرد دونوں سے پاکدامنی کی توقع کی جاتی ہے۔ بعض جگہ دونوں کو جنسی تجربہ حاصل کرنے کی عام اجازت ہے جیسے افریقہ میں ایک قبیلہ ایسا بھی ہے جہاں مرد ایسی عورت سے شادی کرنا پسند کرتا ہے جس نے یہ ثابت کر دکھایا ہو کہ وہ اولاد پیدا کر سکتی ہے۔ بہت سے معاشروں کی طرح پاکستان میں بھی اخلاق کے دوہرے یا جداگانہ معیار ہیں مثلاً اگر کوئی عورت شادی سے پہلے پاک دامن نہ رہ سکی ہو یا اسکی مردوں سے دوستی ہو تو اسکو بے حد مطعون کیا جاتا ہے اس کے برخلاف اگر مرد پاکباز نہ ہو وہ اپنی بیوی سے بے وفائی برتے تو اس سے اتنی سختی سے بازپرس نہیں کیجاتی اور اسکے اس فعل کو درگذر کر دیا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں میں عورتیں دو واضح گروہوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ بدچلن اور نیک چلن۔ بدچلن عورتوں کے پاس مرد انہیں طوائف سمجھ کر جانے سے تو زیادہ پرہیز نہیں کرتے البتہ ان میں سے کوئی کسی ایسی عورت سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا۔ مردوں کی اس طور پر تقسیم نہیں ہوتی اسی طرح شادی کی عمر اور جہیز وغیرہ کا اختلاف بھی رسوم یا دستور سے پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں ایک باپ کے لئے اپنی بیٹی کا جہیز مہیا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پٹھانوں کیطرح بعض ایسے بھی ہیں جہاں لوگ اس لئے شادی نہیں کر سکتے کہ عورت خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔

بر کی تلاش۔ کورٹ شپ اور شادی طے کرنیکے طریقوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی ملکوں کی طرح لڑکے لڑکیاں آزادانہ ایک دوسرے سے مل ملا کر خود ہی اپنے لئے میاں بیوی تلاش کریں۔ یا یہ ممکن ہے کہ پاکستان کے بعض طبقوں کیطرح انکو قطعاً ایک

دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے اور انکی شادی گھر والے خود ہی طے کریں۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب حالات معمول پر ہوتے ہیں تو رسوم اور رواج کی رفتار پُرسکون، ہموار بلکہ ہمہ گیر ہوتی ہے لیکن جب معاشرتی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو معاشرہ کے بعض افراد ایک رسم کی پیروی کرتے ہیں اور بعض کسی دوسری رسم کی۔ البتہ دنیا بھر میں آجکل بھائی بہن کی شادی ممنوع ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر اس تصور پر کہ شادی کس سے ہونی چاہیئے اور کس سے نہیں ہونی چاہیئے رسوم اور رواج کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پاکستان میں سگے چچا ماموں خالہ اور پھوپھی کی اولاد کی آپس میں۔ شادی معیوب نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں اسکو بہتر سمجھا جاتا ہے کہ شادی بیاہ قریبی رشتہ داروں میں ہو۔ بعض معاشروں میں اس قسم کی شادیاں بڑی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ انکے یہاں رشتے ہمیشہ دوسرے خاندانوں میں کئے جاتے ہیں۔ منگنی اور شادی بیاہ کی رسومات تو یقیناً مختلف ملکوں میں بہت مختلف ہوتی ہیں یہ اختلاف بڑی بڑی چیزوں سے لیکر شادی کی جزئیات تک ہر جگہ نظر آئے گا مثلاً بعض معاشروں میں لڑکی والوں کا لڑکے والوں کو پیغام دینا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بعض معاشروں میں لڑکے والے لڑکی کی درخواست کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں بعض معاشروں میں صرف دلہن سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے بعض میں فقط دلہا سے۔ لیکن بعض معاشرے ایسے بھی ہیں جن میں ایسے موقعوں پر دونوں کو دق کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں پاکستان میں شادی کے موقع پر دلہن کا رونا اور غم کا اظہار کرنا فرض ہوتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی خوش نظر آئے تو لوگ اسے بے شرم خیال کرتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں اگر دلہن غمگین دکھائی دے تو لوگوں کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ بعض رسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنمیں میاں بیوی کے سرسبز اور کثیر الاولاد ہونے کی تمنا پنہاں ہوتی ہے۔ مثلاً پاکستان میں دلہن کی گود بھرنے کی جو رسم ہے وہ اسی تمنا کا اظہار ہے۔ پھر شادی کے موقعے پر ایسے تحفے تحائف بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کہ تحفے میں کیا چیز دی جائے۔ کب دی جائے اور کس طرح دی جائے ان تمام باتوں کا انحصار رواج پر ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ تحفے اکثر دوست پیش کرتے ہیں اور فقط دلہن کو پیش کئے جاتے ہیں خواہ یہ دولہا اور دلہن دونوں ہی کے لئے کیوں نہ ہوں ایسے موقعوں پر

خاندان کے دوسرے افراد کو کبھی کوئی تحفے پیش نہیں کئے جاتے۔ پاکستان میں اس قسم کی کوئی قید نہیں۔ دلہا کے دوست تاوقتیکہ دلہن کو جانتے نہ ہوں فقط دولہا کو تحفہ پیش کرتے ہیں اور دلہن کی سہیلیاں عموماً اسی کے لئے تحفے لاتی ہیں۔ دلہا کے والدین اور قریبی رشتہ داروں جیسے بھائی بہن ماموں چچا خالہ وغیرہ کے لئے تحفے ہیں عموماً کپڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

چوتھے باب میں ہم اس چیز پر قدرے تفصیل سے بحث کریں گے کہ مختلف معاشروں میں بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی رسموں میں کتنا اختلاف ہوتا ہے اور اس کا انکی شخصیت پر کتنا اثر ہوتا ہے یہاں ہمیں صرف ان رسموں کے بعض بہت ہی نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔ بعض معاشروں میں "کواڈ"[1] جیسی انوکھی رسم بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ جس میں نوزائیدہ بچے کا باپ کئی ہفتے تک بستر پر پڑا رہتا ہے

ایک مغربی ماہر نفسیات خاتون کے تاثرات یہاں پر ایک مغربی ماہر نفسیات[2] کے تاثرات بیان کرنا جنہوں نے حال ہی میں ہندوستان کی خاندانی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ اس بیان سے ہندوستانی بچوں کی حقیقت حال کا صحیح علم ہو جائے۔ لیکن اس سے کم از کم اتنا اندازہ یقیناً ہو جاتا ہے۔ کہ انہوں نے مغربی پس منظر سے نکل کر یہاں کی زندگی کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں "ہندوستان کے بیشتر حصوں میں بچہ اپنی چچی تائی سے بھی اتنا ہی قریب ہوتا ہے جتنا ماں سے۔ اسی طرح صرف بڑی بہن ہی نہیں۔ بلکہ خاندان کی تمام عورتیں بچے کے لئے بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بچے کی تادیب بھی کسی ایک کے ذمے نہیں ہوتی اور نہ وہ فقط کسی ایک کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں بچہ نسبتاً ماں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شخص بچے کو سزا دے تو ماں کو برا لگتا ہے" یہی ماہر نفسیات آگے چل کر لکھتی ہیں کہ ہندوستان میں بچوں کو کھلانا اور انکی دیکھ بھال کرنا لڑکوں کے لئے معیوب نہیں ہے لیکن امریکہ میں لڑکے بچوں کو کھلانے یا انکی نگہداشت سے اسلئے گھبراتے ہیں کہ انکا مذاق نہ اڑایا جائے امریکہ میں اکثر بچوں کو شروع ہی سے بوتل کے ذریعے دودھ دیا جاتا ہے۔ اور اونچے طبقے کے بچے

[1] Couvade. [2] In the minds of men. Ch. 2.

Murphy

کو، اگر ماں کا دودھ میسر بھی ہو تو وہ شاید ہی کبھی نو ماہ سے زیادہ ماں کا دودھ پیتے ہوں، اسکے برعکس پاکستان میں عموماً بچہ ماں کے سینے سے ہی دودھ پیتا ہے اور بعض اوقات وہ دو ڈھائی سال تک ماں کا دودھ پیتا رہتا ہے۔ مغربی ملکوں میں بچے اکثر اودھم مچائے رکھتے ہیں۔ گستاخ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ابتدا سے ہی ان میں ضبط و نظم پیدا کرنے کی سختی سے کوشش کیجاتی تھی۔ "بچے کو سزا نہ دی جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے" اور بچے ہنستے کھیلتے اچھے لگتے ہیں۔ ان کا دنگا و فساد کرنا یا شور و غل مچانا انکے لئے اچھا نہیں۔ اس قسم کے مقولے مغرب میں نہایت مقبول رہے ہیں۔ لیکن اب تربیت کا پرانا طور طریقہ مغرب میں بالکل متروک ہو چکا ہے۔ اور بچوں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہے بعض معاشروں میں تو بچوں کو بالکل سزا نہیں دی جاتی مثلاً جب امریکی انڈین لوگوں کو معلوم ہوا کہ سفید قوم کے لوگ اپنے بچوں کو سزا دیتے ہیں تو ان کو بڑا تعجب ہوا اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انہیں اپنے بچوں سے محبت نہیں ہوتی۔

(ج) روزمرہ کی زندگی کے متعلق معاشرتی رسمیں

باہمی ربطہ اور میل ملاپ بہت سی معاشرتی رسموں کے سبب پیدا ہوئے ہیں اور قائم بھی رہتے ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں گو کبھی کبھار ایک دوسرے پر کیچڑ بھی اچھالنے سے احتراز نہیں کرتے باہمی خوشنودی، ہمدردی، سلامتی اور چشمک کا اظہار بھی ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن ان تمام جذبات کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ صرف تعظیم اور سلام کی رسم کو ہی لیجئے مختلف معاشروں میں اسکی کتنی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً کہیں جھک کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کے سلام کیا جاتا ہے۔ تو کہیں آداب عرض" کہہ کر ہاتھ پیشانی تک لے جانا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہاتھ ہلا کر یا ہیٹ اتار کر سلام کرنے کی رسم بھی اکثر جگہ عام ہے۔ کہیں صبح بخیر یا السلام علیکم کہہ کر سلام کیا جاتا ہے۔ تو کہیں اسکا طریق یہ ہے کہ یہ پوچھا جائے کہ آپ نے ابھی تک کچھ کھایا ہے۔ کسی وقت کورنش بجالانا یا فرشی سلام کرنا کسی کا عین احترام کرنا تھا۔ بعض معاشروں میں یہ رواج ہے کہ مرد اور عورت کی اگر کہیں سر راہ ملاقات ہو جائے تو مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ جھک

گریا ہیٹ اتار کر سلام کرے اس کے برعکس بعض معاشروں میں یہ بات عین شائستگی سمجھی جاتی ہے کہ اگر کبھی ایسا موقعہ آئے تو مرد نظر بچا کے گذر جائے۔ پاکستان اور جرمنی میں توقع یہ کیجاتی ہے کہ ایسے موقعوں پر مرد پہلے سلام کرے اگر کہیں عورت پہلے سلام کر بیٹھے تو اسے انتہائی بے باک اور آزاد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن امریکہ میں پہلے عورت کو سلام کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ ربط قائم نہیں رکھنا چاہتی۔

ایک واقعہ | اپنی اپنی رسم کے مطابق کسی ایک فعل کے کئی معنی ہو سکتے ہیں یا کسی ایک معنی کو کئی مختلف طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ رسوم بے معنی نہیں ہوتیں ان میں کوئی نہ کوئی راز ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک شناسا نے بیان کیا کہ ایک دفعہ وہ طلبا کو لے کر ایران جا رہے تھے کوئٹہ میں پھل خریدنے کیلئے ایک دکان پر گئے۔ دکاندار دام کم نہ کرتا تھا اور لڑکے مصر تھے کہ پھل بھی اسی سے خریدیں گے اور دام بھی کم کرائیں گے۔ جب لڑکوں نے زیادہ تقاضا شروع کیا تو دکاندار خفا ہو گیا اتنے میں ایک لڑکے نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنیکے لئے خوشامدانہ انداز میں اسکی داڑھی کو ہاتھ لگا دیا۔ اس حرکت سے دکاندار آگ بگولا ہو گیا اور مغلظات سنانے لگا۔ بڑی مشکل سے اسکو یہ بات سمجھائی گئی کہ اس حرکت سے اسکی بے عزتی مقصود نہ تھی ہمارے ہاں ایسے موقعوں پر احتراماً داڑھی چھوئی جاتی ہے تاکہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ دیکھا آپ نے ایک فعل کے کتنے مختلف معنی ہو سکتے ہیں اور ذرا سی ناسمجھی کے سبب کتنی خرابی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح خاص قسم کے احترام کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً مقدس مقامات میں داخل ہوتے وقت مسلمان جوتے اتار لیتے ہیں۔ اور سر ڈھک لیتے ہیں۔ مگر مغربی ملکوں کے مرد ہیٹ تو اتار لیتے ہیں مگر جوتے نہیں اتارتے۔ عورتیں ہیٹ بھی نہیں اتارتیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں اگر کوئی جنازہ جا رہا ہو اور کوئی شخص مخالف سمت سے سائیکل پر آرہا ہو تو وہ سائیکل سے اتر کر آگے بڑھتا ہے۔ تانگے پر سوار ہو تو تانگہ روک لیتا ہے پیچھے سے آنے والا بھی اسی طرح مرنے والے کی تعظیم کرتا ہے۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہو تو انا للہ و انا الیہ راجعون بھی کہتا ہے۔ مغربی ملکوں میں اسطرح کا کوئی رواج نہیں۔ چینی بڑوں سے باتیں کرتے

وقت اظہارِ احترام میں اپنی عینک اتار لیتے ہیں۔ جاپانی ملازم کا فرض ہے کہ آقا کی جھڑکی کھاتے وقت
اظہار خوش اخلاقی میں مسکراتا رہے پاکستان میں اگر کوئی ملازم ایسا کرتا ہے تو اسے بہت گستاخ اور بے
ادب تصور کیا جاتا ہے۔

اظہارِ محبت کی رسموں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ کہیں محبت کا اظہار آزادانہ ہوتا ہے تو کہیں
پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ ماں بچے کیساتھ محبت کا اظہار عموماً علانیہ کرتی ہے لیکن ہو سکتا ہے باپ
اس کا اظہار پسند نہ کرے۔ جاپانیوں میں یہ رسم ہے کہ اگر کوئی لڑکا اپنے والدین کے لمبے عرصے
کے لئے جدا ہو رہا ہو تو خواہ اسے کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو وہ اس کو دبانے کی کوشش کرے گا
اور ظاہر نہ ہونے دیگا۔ اسی طرح جذبہ تشکر کا اظہار تحفے دے کر بھی کیا جاتا ہے اور محض زبان سے بھی
شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں یہ دستور ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت سے
ایک رات بسر کی ہے تو خط کے ذریعے اس کا شکریہ ادا کرے۔ بعض معاشروں میں بعض سرکاری
افسر اظہار تشکر میں خلاف قانون نا اہل لوگوں کو اچھی اچھی اسامیوں پر مقرر کر دیتے ہیں اس قسم کی حرکت
بے ایماندارانہ حکومت کی ترقی میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ بعض معاشروں میں گالیوں
کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کسی کو ذلیل کرتے وقت نہایت بے تکلفی سے استعمال کی جاتی ہیں
چنانچہ کسی شخص کی اہانت اور ہتک کرنے کا بہترین طریق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسکو ماں یا بہن کی گالی
دی جائے یا اس کے آبا و اجداد کو خوب صلواتیں سنائی جائیں۔ بعض جگہ گالی کا جواب گالی سے
ہوتی ہے اور بعض جگہ گالی سن کر دعائیں دی جاتی ہیں۔ ایسے معاشروں میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ
گالی سننے سے عزت نہیں گھٹتی بلکہ جو شخص گالی دیتا ہے وہ ایک ذلیل حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہمدردی کا اظہار زبانی بھی ہو سکتا ہے۔ اور تحائف کے ذریعے بھی۔ چین میں اگر کسی کا کوئی عزیز
مر جائے تو ہمدردی میں تجہیز و تکفین سے پہلے یا تو روپے بھیجتے ہیں یا کلمات تاسف و ہمدردی سے
بھرا ہوا خط بھیجا جاتا ہے۔ کفن دفن کے بعد تحفہ ارسال کرنا بہت معیوب تصور کیا جاتا ہے ہندوستان
اور پاکستان کے بعض علاقوں میں عزیز و اقارب کا پرسے کیلئے جانا ضروری ہوتا ہے جس سے

یہاں کوئی مرجائے تو اس کے ہاں برابر دو تین دن تک عزیز واقارب یا دوست کھانا بھیجتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ رسم ہے کہ غم کو چھپائے تو کہیں دھاڑیں مار کر رونا اور بین کرنا عین لازمی ہے۔ اور جب ایک طویل مدت تک سوگ نہ منایا جائے گویا غم کا اظہار ہی نہیں ہو پاتا۔

خوشنودی اور ناخوشنودی زبردست معاشرتی قوتیں ہیں۔ بعض سیدھے سادے معاشروں میں جہاں نہ کوئی باقاعدہ قانون ہوتا ہے نہ پولیس لوگوں کو برے کام سے ایک ہی چیز روکتی ہے اور وہ ہے اظہار ناخوشنودی۔ اسی طرح جن معاشروں میں بچوں کو بالکل سزا نہیں دی جاتی انہیں انکی سرزنش اظہار ناراضگی کے ذریعے ہی کیجاتی ہے۔ خوشنودی کا اظہار یا تو مسکراہٹ سے کیا جاتا ہے یا بعض کھیل تماشوں میں تالی بجا کر بھی خوشنودی ظاہر کیجاتی ہے۔ چین کیطرح بعض دوسری جگہوں پر بہت خوب "مرحبا" کہہ کر بھی اپنی پسندیدگی ظاہر کی جاتی ہے۔ امریکہ میں انگوٹھا سیدھا کھڑا کرنے کے معنی "شاباش" کے ہوتے ہیں مگر پاکستان میں کسی کو انگوٹھا دکھانا گویا اسکی ہتک کرنا ہے۔ عفت وعصمت کی حفاظت عموماً لباس نیچی نگاہوں سے کی جاتی ہے۔ اطوار کی متانت بھی ضروری خیال کیجاتی ہے لیکن اسکا فیصلہ رواج کرتا ہے کہ جسم کے کون سے حصے چھپائے جائیں اور کون کون سے کھلے رہیں۔ پاکستان کے دیہات میں عورتیں عام طور پر ننگے پاؤں پھرتی ہیں اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اسکے برعکس چین میں عورتوں کا ننگے پاؤں رہنا بہت برا خیال کیا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں ایک سیاح نے ایک عورت سے جو قریب قریب بالکل عریاں تھی اسکے ہونٹوں اور کانوں کے زیور خریدنا چاہے وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ راضی ہوئی۔ لیکن جونہی اسنے اپنے زیور سیاح کے حوالے کیئے وہ شرم وحیا کی وجہ سے وہاں سے بھاگ گئی۔ بعینہ جیسے کوئی عورت غربت کے سبب اپنا برقعہ کسی اجنبی کے ہاتھ بیچ کر سر جھکائے وہاں سے چل دے۔ زیور یا برقعہ گویا عفت کی حفاظت کے ضامن ہیں بعض معاشروں میں عورت کا نامحرم سے باتیں کرنا کوئی بُری بات نہیں لیکن پاکستان میں اس کو عموماً اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

رسوم کا ایک امتیازی کام بہت سی مذکورہ رسمیں صرف انہیں ضروریات کو پورا نہیں کرتیں

جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے بلکہ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے وہ لوگوں میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہیں
کہ مہذب اور باعزت شخص انہیں کے مطابق کام کرتا ہے۔ صحیح اقدام یہی ہے کہ انکو مانا جائے پاکستانی
بکرے کے گوشت کو گائے کے گوشت پر صرف اس لئے ترجیح نہیں دیتے کہ یہ زیادہ لذیذ ہوتا ہے
بلکہ انکے خیال کے مطابق اسکا کھانا زیادہ امارت اور شرافت میں داخل ہے۔ ایک مہمان کو اگر آپ نے
بھنا ہوا گوشت یا مرغ نہیں کھلایا تو گویا آپنے اس کی کوئی خاطر تواضع نہیں کی چاہے آپ نے اسے جو
کھانا کھلایا ہو وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح لباس کا مقصد محض جسم کا تحفظ اور چھپانا نہیں ہے بلکہ اس
سے سماجی حیثیت اور شائستگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ پاکستان میں کپڑوں کی صفائی اور پاکیزگی بال سنوارنے
اور جوتوں کے چمکانے پر زور دیا جاتا ہے۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہننا خواہ پیوند انتہائی صفائی اور
سلیقے سے ہی کیوں نہ لگے ہوں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بعض دوسرے معاشروں میں اس بات کو کوئی
خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ ایک ہندوستانی جوگی کو اپنی بھبھوت اور لنگوٹی پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ چین
میں تعلیم حصول عزت کا بہترین وسیلہ تھی۔ پڑھے لکھے شخص کی بڑی عزت کیجاتی تھی خواہ وہ کتنا ہی غریب
کیوں نہ ہو۔ لیکن ایک جنگی معاشرہ میں تعلیم کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ امریکہ کے زونی انڈین قبیلہ
میں کسی شخص کی عزت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے کتنے مذہبی ناچ آتے ہیں یا اسے زیادہ
سے زیادہ تعداد میں مناسب اور برمحل گانے کتنے یاد ہیں۔ آجکل بعض اوقات کالج میں کسی طالب
علم کی محض اسوجہ سے یار دوست قدر و منزلت کرتے ہیں کہ اسے کرکٹ کے تازہ ترین سکور از بر
یاد ہوتے ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ معاشرہ کے پست ترین افراد بھی اپنے طبقے کے رسوم اور
عادات کے مطابق شائستہ اور مہذب زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہر جگہ حصولِ عزت کا جذبہ کارفرما
نظر آتا ہے البتہ اسکے حصول کے طریقے جدا جدا ہیں۔ اکثر جگہ اسکا انحصار دولت پر ہوتا ہے۔
کسی بڑے شہر میں اس شخص کو زیادہ باعزت سمجھا جاتا ہے جس کے پاس پانچ سات موٹر یں عمدہ فرنیچر
بنگلے اور کوٹھیاں ہوں لیکن دیہی علاقوں میں یہ عزت سب سے بڑے زمیندار کو حاصل ہوتی ہے
چین میں دولت مند آدمی کو ایک اسکول قائم کرنے کے سبب عزت حاصل ہوتی تھی بعض دوسرے

معاشروں میں شادی بیاہ ۔ تجہیز و تکفین پر بے دریغ روپیہ بہانے، لڑکی کو بھاری جہیز دینے یا دعوتوں میں بے جا روپیہ صرف کرنے سے عزت حاصل ہو سکتی ہے لیکن بعض جگہ یہ مقابلہ صرف مردوں یا عورتوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ اور محض بیوی کے اعلیٰ لباس سے شوہر کی عزت بڑھ جاتی ہے بعض معاشروں میں عزت محض خاندانی معاملہ سمجھی جاتی ہے ۔ گمان غالب ہے کہ ایسے معاشروں میں کسی لڑکی کی ذاتی خوشی کی پروا کئے بغیر اسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے جس سے پورے خاندان کی عزت و دولت میں اضافہ ہو جائے اسی طرح ایک لڑکا جسے خود تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور جماعت بار فیل ہو جاتا ہے محض اسلئے شرم و ندامت محسوس کرتا ہے کہ اسمیں پورے خاندان کی بے عزتی اور رسوائی ہوتی ہے چین[1] میں شرفا کے درمیان رواج تھا کہ وہ بوڑھے ہونے سے پہلے ملازمت سے پنشن لے لیتے تھے ۔ غالباً اس رسم کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ جس شخص کے جوان بیٹے ہوں ۔ اسے بڑھاپے میں کام نہیں کرنا چاہیئے ۔ یہ اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کی خدمت اور کفالت کرے ۔ چنانچہ پنشن نہ لینے کی صورت میں بیٹوں کی سعادت مندی پر حرف آتا تھا ۔ اور یہ بات ان کے لئے باعث ننگ خیال کی جاتی تھی

(۷) موسیقی ۔ آرٹ ۔ علم و مذہب کے متعلق رسمیں

موسیقی کا شوق ہر جگہ نظر آتا ہے ۔ مختلف معاشروں میں مختلف قسم کی موسیقی پسند کی جاتی ہے ۔ اگر کہیں کلاسیکی موسیقی پسند کیجاتی ہے تو کہیں ہلکے پھلکے گانے مقبول ہوتے ہیں کہیں خالص ہندوستانی ناچ گانا پسند کیا جاتا ہے ۔ تو کہیں مشرقی اور مغربی ملی جلی دھنوں پر راگ رنگ کی محفلیں منعقد کیجاتی ہیں ۔ پاکستان کے بعض حلقوں میں اگر ہلکے پھلکے فلمی گانے گائے جاتے ہیں ۔ تو بعض ایسے حلقے بھی موجود ہیں جو ان گانوں کی نسبت مغربی گانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ایک معاشرہ کی موسیقی دوسرے معاشرے کے لوگوں کو ناگوار گزرے ۔ یہی حال آرٹ اور دوسرے فنون لطیفہ کا بھی ہے ۔ پرانے زمانے کے

---

[1] یہ اور اس قسم کی دوسری رسمیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے اشتراکیوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے چین کی رسمیں تھیں سیاسی نظام کے بدل جانے سے یقیناً بہت سی رسمیں متاثر ہوئی ہونگی ۔

مزاعہ نقاشی کے نمونے غاروں اور زمین دوزتہ خانوں میں اب بھی ملتے ہیں لیکن انکی ہیئت اور طرز میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یورپ میں مذہبی جذبات کا اظہار اعلیٰ قسم کی موسیقی اور بہترین نقاشی اور معماری کی شکل میں ہوا ہے لیکن اسلام میں مصوری موسیقی اور مجسمہ سازی منع ہیں مسلمانوں نے اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین خوبصورت مسجدیں بناکر کی ہے اسی طرح انہوں نے موسیقی کی تسکین قرآن کے اعجاز کلام عمدہ شاعری اور خطابت سے حاصل کی ہے۔ جنوبی امریکہ میں بھی خطابت کو بڑا مقام حاصل ہے۔ علاوہ بریں موسیقی اور آرٹ کے اظہار کے اسلوب بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب کوئی نئی طرز وجود میں آتی ہے تو عموماً بہت کم لوگوں کو بھاتی ہے۔ شروع شروع میں عوام اسے قطعاً پسند نہیں کرتے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔

علم وحکمت کی جستجو میں بھی رسم ورواج کا اثر نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی فلسفہ بہت عام تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ریاضیات۔ فن طبابت اور علم کے دیگر شعبوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ چین میں تجریدی فلسفہ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ لیکن زندگی کے عملی اصولوں سے خاص شغف رہا پچھلی چند صدیوں میں مغرب میں علمی معلومات کی جدوجہد بہت تیز ہو گئی ہے البتہ یورپ کا زور نظری پہلو پر ہے اور امریکہ کا عملی پہلو پر۔

مذہبی عقائد کے متعلق رسوم کوئی بھی مخلص مذہبی آدمی مذہبی اعتقادات کے اختلاف کو محض رسمی معاملہ نہیں سمجھتا۔ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے خاص خاص ہدایت کے راستے وحی کے ذریعہ نازل کئے ہیں اور انہی پر چل کر اسکی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے تاہم رسوم ورواج کا مذہبی اعتقادات پر یقیناً گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسلام میں عیسائیت کی نسبت یک رنگی زیادہ ہے نماز کے مخصوص اوقات ہیں اور اسکے ادا کرنے کے طریقے متعین ہیں۔ روزہ رکھنے۔ حج ادا کرنے۔ زکوٰۃ اور خیرات دینے کے طریقے واضح طور پر بتا دیئے گئے ہیں۔ قرآن مجید ہمیشہ عربی میں پڑھا جاتا ہے۔ اور کوئی ترجمہ خواہ وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اسے وہ رتبہ نہیں مل سکتا جو متن کو حاصل ہے۔ عیسائیوں کے کیتھولک فرقہ کے طریقوں میں بھی کسی قدر یک رنگی ہے۔ لیکن پروٹسٹنٹ فرقہ کی عبادت کے طریقوں میں بڑا اختلاف

ہے مثلاً بعض جھک کر عبادت کرتے ہیں۔ بعض بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر اور بعض ایک سے زیادہ طریقوں سے عبادت کرتے ہیں۔ انجیل مقدس کا ترجمہ قریباً دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے اور اسے مختلف زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ تمام عیسائی کثرتِ ازدواج کے مخالف ہیں لیکن طلاق کے معاملہ میں ان میں بڑا اختلاف ہے۔ بعض عیسائی اپنی آمدنی کا دسواں حصہ نہایت باقاعدگی سے خیرات کے لئے نکالتے رہتے ہیں۔ مگر بعض اسکی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی مختلف النوع عقائد پائے جاتے ہیں اوامر نواہی کا اختلاف ہر جگہ ملتا ہے مثلاً کیتھولک عیسائی گوشت نہیں کھاتے مسلمان اور یہودی سؤر کا گوشت اور غیر بذبوحہ گوشت کبھی نہیں کھاتے۔ کوئی ہندو علانیہ طور پر گائے کا گوشت نہیں کھاتا اور نہ دیوی دیوتاؤں کے خلاف کچھ کہتا ہے

کچھ دوسری ضروریات

مندرجہ بالا ضرورتوں کے علاوہ کچھ اور ضروریات سے بحث بھی کیجا سکتی ہے۔ جنکی تسکین جدا جدا طریقوں اور رسموں سے کیجاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جائداد ایک پشت سے دوسری پشت تک کس طرح منتقل ہوتی ہے۔ بیٹے کو کیا حصہ ملتا ہے اور بیٹی کو بھی کچھ ملتا ہے کہ نہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے انگلستان میں یہ رسم عام تھی کہ ساری کی ساری جائداد بڑے لڑکے کو ملا کرتی تھی۔ بعض معاشروں میں یہ فیصلہ باپ کرتا ہے کہ جائداد کسکو ملنی چاہیے اور کسکو نہیں۔ اور بعض میں اسکا انحصار مروجہ رسم رواج پر ہے۔ پاکستانی کسان اپنی جائداد شرعی قانون کے تحت اپنے لواحقین میں تقسیم کرنے کا عادی ہے اور اسکی اپنی پسند یا ناپسند کو اسمیں وہ دخل نہیں رہا جو آج سے چند سال پہلے تھا۔ اسی طرح چین میں یہ دستور ہے کہ وہاں ایک چینی اپنے دور کے رشتہ داروں کی کفالت کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے لیکن امریکہ میں بھائی بھائی کی بھی کم پرواہ کرتا ہے۔ البتہ پاکستانی رسم ان دونوں رسموں کے بین بین ہے۔ مرنے کے بعد کسی شخص کی نعش کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسکا تعلق بھی زیادہ تر رواج سے ہے کہیں اسکو جلا دیتے ہیں تو کہیں صندوق یا کفن میں لپیٹ کر دفن کر دیتے ہیں۔ کہیں دریا میں بہا دیتے ہیں تو کہیں چیل کوؤں کی غذا بننے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح کئی ایک اور رسمیں اور دستور ہیں جو ضروری

نہیں کہ ہر جگہ ایک سی ہوں، مثلاً قتل کے معاملات میں مقتول کے ورثا بدلہ لیں یا فقط پولیس اس سلسلے میں جملہ اقدامات کرے۔ جرائم کی سزا کس نوعیت کی ہو۔ حکومت کے امن و انصاف قائم کرنے کے کون سے طریقے ہوں۔ حاکم اقتدار کیسے حاصل کرے اور اسے کیونکر استعمال کرے وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں میں ہمارا یہی خیال ہے کہ ہمارے اپنے طور طریقے تو ہمیشہ درست ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کو مناسب و فطری سمجھتے ہیں اور شاذ ہی کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں کہ دوسروں کے طریقے جو ہمارے طریقہ سے اگر مختلف ہیں تو بھی انکے لئے عین مناسب اور درست ہونگے۔ انہیں بھی اپنے طریقوں سے اتنا ہی گہرا لگاؤ ہوتا ہے جتنا ہمیں اپنے طریقوں سے ہے

رسموں کا لغت کیا رسموں کا کوئی ایسا چھوٹا سا لغت تیار کیا جا سکتا ہے جس سے مختلف معاشروں کی رسوم کا باہمی تعلق معلوم ہو سکے اور یہ واضح ہو سکے کہ ہمارے معاشرہ کی کسی خاص رسم کے مقابلے میں کسی دوسرے معاشرے میں کونسی رسم مروج ہے۔ ایسی لغت تیار کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ مختلف قسم کی مشکلات پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کی نوعیت کا ذکر تو ذرا آگے چل کر آئے گا آیئے یہاں یہ لغت مرتب کرنیکی ایک معمولی سی کوشش تو کر دیکھیں اور مختلف رسموں کو کچھ یوں ترتیب دے لیں۔

فعل یا ضرورت	پاکستانی رواج	امریکی رواج	چینی رواج
کھانا کھانا	ہاتھ سے	چھری کانٹے سے	بانس کی تیلیوں سے
مقدس مقامات کا احترام	جوتا اتارنے سے	ہیٹ اتارنے سے فقط مرد ہیٹ اتارتے ہیں	نہ جوتا اتارا جاتا ہے نہ ہیٹ
عبادت کا مخصوص دن	جمعہ	اتوار	بعض تہوار
آداب سلام و تعظیم	السلام علیکم کہنا	آپکا مزاج کیسا ہے کہنا	آپ نے چاول کھالئے کہنا
رشتہ تلاش ہونا	والدین کرتے ہیں براہ راست دوست احباب یا خاندان کے ذریعے	لڑکے اور لڑکیاں خود ہی تلاش کرتے ہیں	عموماً والدین درست بطلب کے ذریعے کرتے ہیں
اظہار ادب و احترام	جھکنا	جھکنا	جھکنا
متانت و مہذب دلچسپی کا اظہار	بچوں کی خیریت دریافت کرنا	بیوی کی مزاج پرسی کرنا	عمر یا تنخواہ پوچھنا

اس قسم کی لغت تیار کرنا جیسا کہ اوپر لکھا گیا آسان کام نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بہت سی رسمیں تو آسانی سے ترجمہ کے ذریعے دوسرے معاشروں میں پہنچائی جا سکتی ہیں مثلاً منہ تک کھانا لے جانے کا طریقہ ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے لیکن بہت سی رسمیں ایسی بھی ہیں جنکے اگر ذکر کیا تو ہمیشہ ایک سالائق ہے اور ان کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں مثال کے طور پر جوتا یا ہیٹ دونوں ہی احتراماً اتارے جاتے ہیں مگر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مغربی ملکوں میں ہیٹ کسی دکان میں داخل ہوتے وقت یا سڑک پر کسی خاتون سے ملاقات پر بھی اتار لیتے ہیں۔ مگر جوتا ایسے موقعوں پر کبھی نہیں اتارا جاتا۔ "بریڈ" کے معنی ہمیشہ روٹی تو نہیں ہوتے۔ آداب ملاقات، سلام و احترام اور ہمدردانہ دلچسپی کے سینکڑوں طریقے رائج ہیں۔ لغت کو اس بات کی نشاندہی کرنی ہوگی کہ کس موقعے پر کیا ہونا چاہیے۔ اسکے علاوہ ایک ہی آبادی کے مختلف طبقوں میں مختلف رسوم و رواج ہو سکتے ہیں۔ اسلئے اسطرح لغت تیار کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا تاہم یہ کوشش بڑی دلچسپ ہوگی۔

پیروی رسوم کے محرکات

اب سوال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی خاص رسم کی پابندی کیوں کرتا ہے؟ اس باب کے گزشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ بیشتر رسموں سے ایک سے زیادہ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ میرے ٹوپی پہننے کا مقصد سر کو گرم رکھنا ہو۔ یا میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں معقول لباس پہنے ہوئے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے اپنی نئی ٹوپی سے اپنی امارت ظاہر کرنی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹوپی پہننے کی بیک وقت یہ ساری وجوہ ہوں چنانچہ ذیل میں ہم ان مخصوص محرکات کا ذکر کرتے ہیں جن کے سبب رسوم کی پیروی کیجاتی ہے۔

افادیت اور سہولت

بعض رسمیں بذات خود بڑی مفید ہوتی ہیں کیونکہ ان سے بعض ضروریات سہل آسانی سے پوری ہوجاتی ہیں۔ اسکیمو ایسے مکان بناتے ہیں اور ایسے کپڑے پہنتے ہیں جو انہیں سردی سے پوری

طرح بچا سکیں۔ چینی گرم پانی اسلئے پیتے ہیں تاکہ تیل کا کھانا کھانیکے بعد ٹھنڈا پانی نقصان نہ پہنچائے اور وہ جراثیم اور معدے کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ پاکستان میں چورس چھت اسلئے بنائی جاتی ہے کہ گرمی کے موسم میں کھلی چھت پر سو سکیں۔ اسی طرح بعض رسموں کی پابندی سہولت اور آسانی کی خاطر ہے۔ مثلاً سیفٹی ایڈز سے چونکہ داڑھی بنانا پرانے استرے کے مقابلے میں آسان ہے۔ اسلئے سیفٹی ریزر کا استعمال مقبول عام ہے بس کا سفر بھی اسی لئے زیادہ عام ہو رہا ہے کہ اس سے ریل کی نسبت زیادہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتے ہیں

وضعداری لیکن بعض رسمیں محض وضع کی حد تک برتی جاتی ہیں جب کسی ضرورت کو پورا کرنے کے بہت سے طریقے ہوں اور ہم ان میں سے کسی ایک طریقے کو اس تصور کیساتھ اپنا لیں کہ یہی اور فقط یہی صحیح اور بہتر طریقہ ہے تو اسکو وضعداری کہا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ دوسرے طریقے بھی بالکل اسی طرح سہل اور ممکن العمل ہو سکتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سڑک پر چلتے وقت ہم بائیں ہاتھ رہیں یا دائیں ہاتھ البتہ یہ نہایت ضروری ہے کہ سارے ملک میں ایک ہی رواج ہو۔ مگر اس بات پر سب متفق ہو جائیں کہ ہفتے میں چھٹی کس دن ہو جمعہ کو یا اتوار کو کام کے دوران میں کھانیکا وقفہ کتنا ہو۔ دکانوں کے کھلنے اور بند ہونے یا بسوں کے چلنے کے اوقات کیا ہوں تو متعدد مشکلات سے نجات مل جاتی ہے اور سب کام سہولت اور آسانی سے سر انجام پا جاتے ہیں کسی معاشرہ میں اسکی زبان رواجوں کا سب سے اہم مجموعہ ہے چند آوازوں سے محض مخصوص معنی ہی اخذ کرنا رواج سے تعلق ہے اردو قواعد میں فعل فقرے کے آخر میں لکھا جاتا ہے

اردو زبان میں Custom اور convention کے فرق کو واضح کرنا ذرا مشکل ہے یہاں پر رواج کا لفظ Convention کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو شاید اسکا صحیح مفہوم ادا نہیں کر پاتا۔ اصل میں convention بھی رسم ہی ہوتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ custom ایک عام لفظ ہے جس میں کنونشن بھی شامل ہے۔ کسی ضرورت کی تکمیل کے بہت سے طریقوں میں سے فقط کسی ایک کو اسطرح چن لینا کہ لوگ اس کو درست سمجھنے لگیں حالانکہ دوسرے طریقے اس سے کسی طرح کمتر نہ ہوں convention کہلاتا ہے۔

لیکن انگریزی میں فعل فاعل کے فوراً بعد ہی لکھنا درست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اشاروں کی زبان بھی خوب شے ہے مثلاً عرب میں اگر مہمان مزید قہوہ نہیں پینا چاہتا تو پیالہ واپس رکھتے وقت وہ اسے تھوڑا پیکر ہلا دیتا ہے لیکن پاکستان میں وہ پیالے کو پرچ میں الٹ کر رکھ دیتا ہے ایران میں ایسے موقعوں پر پیالے کو الٹا رکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر مہمان مزید کچھ نہیں چاہتا تو وہ زبان سے "جی نہیں شکریہ" ایسے الفاظ کہتا ہے۔ البتہ پاکستان میں بعض اوقات انکار اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ میزبان سمجھ لیتا ہے کہ یہ محض تکلفاً کیا جا رہا ہے۔ ورنہ اگر میزبان اصرار کرے اور گلاس لسی سے بھر بھی دے تو مہمان اسے بخوشی پی لیتا ہے۔

تہذیب و شائستگی کے بہت سے آداب رسمی ہیں۔ اگر مہمان اور میزبان دونوں آداب سے واقف ہوں تو باہمی تعلقات آسانی سے استوار کیے جا سکتے ہیں۔ پاکستان میں مہمان کو عموماً کسی نمایاں جگہ پر بٹھاتے ہیں۔ چین میں اسے دروازے کے بالمقابل میزبان کے عین سامنے مگر مغربی پاکستان میں اسکی جگہ میزبان کی داہنی جانب ہوتی ہے۔ لہذا اگر اس قسم کی رسوم اور آداب سے واقفیت ہو اور وہ متعین ہوں تو کبھی قسم کی کوئی ناخوش گواری پیش نہیں آتی یہی آداب مجلس اور تہذیبی رسوم آپس کے تعلقات میں پختگی اور شیرینی بڑھاتے ہیں۔ ایک بار ایک ذہین لڑکی نے کہا مجھے لوگوں کی رسمی باتیں کھوکھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم فی الواقع کسی کی مزاج پرسی نہیں کرنا چاہتے تو ہم کیوں اسکا حال پوچھیں۔ اگر اس سے مل کر ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی تو ہم کیوں کہیں کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس لڑکی کے نزدیک اس قسم کے جملے بیکار ہیں۔ اور بے معنی ہیں چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ جب تک واقعی کوئی بات کہنے کی نہ ہو گی وہ کسی سے کوئی بات نہ کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اسے آدم بیزار اور ناشائستہ سمجھنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اسکی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اسکی نگاہوں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی کہ اس قسم کے رسمی جملوں میں اجنبیت اور بیگانگی نہیں ہوتی بلکہ ان سے ایک طرح کی اپنائیت اور یگانگت ٹپکتی ہے موسم کی خوشگواری اور خرابی سے بات چیت شروع کرنے کا طریقہ اگر مغرب میں عام ہے تو اسمیں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس

کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس طرح انسان آغازِ گفتگو کی مشکل سے بچ جاتا ہے اور رسمی طور سے بات چیت شروع کر کے اسکا رخ کسی دوسرے موضوع کی طرف نہایت آسانی سے پھیر سکتا ہے رسمی آداب بے روح ہونے کے باوجود اپنی افادیت نہیں کھوتے انگریزی میں خط لکھتے وقت ہم اکثر "ڈیر سر" یا "ڈیر" یا "سر" سے شروع کرتے ہیں خواہ مخاطب ہمیں پیارا ہو یا نہ ہم اسے "جناب" لکھنا چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں۔ ایسے خطوں میں "آپ کا مخلص" "نیاز کیش" لکھنا بے معنی ہوتا ہے۔ تاہم خط کے القاب و آداب اور اختتام میں رسمی طریقوں کو برتنا جدت سے کام لینے کی بجائے زیادہ موزوں اور آسان ہے۔ یہاں ایک اور چیز بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تمدن کے اختلاف کے ساتھ ساتھ متعلقہ رواج کے معنوں میں بھی اختلاف ہونا لازمی ہے۔ مثلاً کوئی امریکی نوجوان اپنے دوست کی جوان بہن کے متعلق کچھ پوچھتا ہے یا اسکی تعریف کرتا ہے تو اپنے ملکی رسم و رواج کے مطابق اسکی عزت افزائی کر رہا ہے لیکن پاکستان کے رواج کے مطابق اس قسم کی کوئی بات کرنا اپنے ناشائستہ ہونیکا ثبوت دینا ہی

۲۔ اعتقاد

رسوم کو ماننے کا دوسرا محرک ہمارا اپنا اعتقاد ہوتا ہے اس سے پہلے کھانے کے سلسلے میں اسطرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ لوگ کیوں ایک کھانے کو دوسرے کھانے پر ترجیح دیتے ہیں مثلاً ہم بعض چیزیں نہیں کھاتے اور حیلہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمارے لئے مفید نہیں ہیں۔ لیکن کیا وہ واقعی مضر ہوتی ہیں اسکے متعلق جاننے کی ہم چنداں ضرورت نہیں سمجھتے شروع شروع میں امریکہ میں لوگ اس خیال سے ٹماٹر نہیں کھاتے تھے کہ یہ زہریلے ہوتے ہیں۔ اسی امر میں توہمات کو بھی بڑا دخل ہے۔ کانی بلی سے بچنا۔ منگل کے دن سفر کرنا۔ گنڈے تعویذ پر ایمان رکھنا۔ سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ ہمارے اعتقادات کا ہمارے اعمال پر بھی اثر پڑتا ہے۔ مثلاً افریقہ کے ایک قبیلے میں یہ کام اعتقادات تھا کہ سردارِ قبیلہ کا چھوا ہوا کھانا کھانیوالا شخص مر جاتا ہے چنانچہ لوگ اس سے پرہیز کرتے تھے ایک بار ایک شخص نے سڑک کے کنارے پڑا ہوا کھانا کھا لیا بعد میں جب اسے معلوم ہوا کہ یہ سردارِ قبیلہ کا چھوا ہوا ہے تو اسکا دل بیٹھنے لگا۔ پیٹ میں درد اٹھا اور چند لمحوں کے اندر اندر وہ مر گیا۔ اس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سچ ہے کہ جو قبیلے

کے سردار کا چھوا ہوا کھانا کھاتا ہے وہ مرجاتا ہے۔ بات دراصل یہ نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب ہم کسی رسم کی پابندی اس اعتقاد سے کرتے ہیں کہ اس کے کرنے سے ہم یقیناً کامیاب ہو جائیں گے تو ہم پورے اعتماد اور بھروسے سے کام کرتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ شماتت رسموں کی پابندی کے تیسرے محرک کو شماتت ہمسایہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی بعض اوقات ہم برضا و رغبت رسموں کی پابندی نہیں کرتے بلکہ ان کی پیروی اسلئے کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کے طعن و تشنیع اور تمسخر کا نشانہ نہ بنیں۔ اور معاشرہ میں ہماری عزت اور وقار قائم رہے۔ پرتکلف دعوتوں اور شادی بیاہ کے موقعوں پر ہم بعض اوقات جو بے دریغ روپیہ صرف کرتے ہیں تو اسکی اکثر و بیشتر یہی وجہ ہوتی ہے کہ لوگ ہم پر انگلیاں نہ اٹھائیں۔ ہمیں خسیس نہ سمجھیں۔ ضروری نہیں کہ کسی فقیر کو کچھ دیتے وقت ہمارے دل میں اسکے لئے ہمدردی کا جذبہ ہی ہو۔ عین ممکن ہے کہ اس موقعے پر ہمیں صرف یہ خیال ہو کہ اگر اسکو کچھ نہ دیا تو لوگ ہم کو کنجوس سمجھیں گے۔ ہوٹل میں ضرورت سے زیادہ "ٹپ" کرنیکا ایک بڑا سبب اپنی فیاضی اور سخاوت کی نمود بھی ہوتا ہے۔ بہر حال ہر معاشرہ میں شریفانہ فضول خرچی کے بہت سے رسمی طریقے رائج ہوتے ہیں بعض لوگ سیلاب زدگان کی امداد میں جو رقم دیتے ہیں وہ صرف چندہ مانگنے والوں کی خوشنودی کیلئے دیتے ہیں۔ چینی والدین اپنی لڑکیوں کے پاؤں چھوٹے چھوٹے جوتوں میں ظالمانہ طریق پر اسلئے کس دیتے تھے کہ اگر انکے پاؤں بڑے ہوئے تو لوگ کیا کہیں گے اسی طرح بعض اوقات مذہبی آداب و رسوم بھی صرف لوگوں کی ناخوشنودی کے ڈر سے یا خود کو متقی و پرہیزگار ظاہر کرنے کے لئے ادا کیے جاتے ہیں۔

۴۔ خوشی و مسرت بعض رسموں کی پابندی اسلئے کیجاتی ہے کہ ان سے خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ شبرات کے موقعے پر حلوہ پکانا یا عید کے دن سویّاں پکانے اور عیدی دینے کی یہی وجہ ہے کہ ایسا کرنے سے دل کو ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ناچ اور مغربی ملکوں کے اجتماعی رقص میں بھی یہی جنس و نشاط کا عنصر کار فرما نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں کو ذرا ذرا سی بات پر منہ میٹھا کرانے میں لطف آتا ہے اسکی وجہ بھی تو یہی ہوتی ہے۔

کہ انہیں اسمیں بڑا لطف ملتا ہے۔ اسی طرح کالجوں میں فرسٹ ایر کے طالب علموں کو پریشان کرنے اور
بیوقوف بنانے کی جو رسم چلی آ رہی ہے اسکی تہہ میں بھی تو خوشی و مسرت کا ہی جذبہ ہوتا ہے۔

۵۔ موزونیت اور مناسبت

بعض رسمیں محض اسلئے اختیار کیجاتی ہیں۔ کہ ہمارے نزدیک وہی موزوں اور مناسب ہیں۔ مروجہ طریق کے
خلاف چلنے میں کچھ عجیب بے اطمینانی سی محسوس ہوتی ہے۔ "یہی صحیح ہے" "یہی کپڑے موزوں رہیں گے"
اس قسم کے خیالات برابر ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ گندگی اور مٹی کا خوف نہ بھی ہو تب بھی بغیر ہاتھ دھوئے
کھانے میں عجب الجھن ہوتی ہے۔ جس عورت کی تربیت اس طرح ہوئی ہو کہ وہ ہمیشہ شوہر کے پیچھے پیچھے چلے
اگر اسکو شوہر کے دوش بدوش چلنے پر مجبور کیا جائے تو وہ سختی سے اسکی مخالفت کریگی اصل میں ایسے
موقعوں پر ہمارے ذہن میں بار بار یہ خیال ابھرتا ہے کہ شائستہ لوگوں کا شیوہ اور طریقہ یہی ہے ہم بھی شائستہ
اور مہذب ہیں رسوم کی پابندی کے اسباب و محرکات پیش کرتے وقت اس سبب کو بالکل نظر انداز کر دیا
جاتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت اہم ہے۔

کسی چیز کے درست اور جائز ہونے کا احساس عموماً مذہبی عقائد کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔
چونکہ اللہ تعالیٰ چند چیزوں کی پیروی کرنیکا حکم دیتا ہے۔ لہذا کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے یعنی الہامی
دلائل کی موجودگی میں کسی اور سبب کو تلاش کرنا قطعاً غیر ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت
سے ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے لیکن بعض اوقات ہمارا یہ احساس فقط مذہبی عقائد کی بنا پر نہیں ہوتا۔ ہم
خود بھی چیزوں کی نوعیت کے متعلق سوچتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ سور کے گوشت سے آپ نے محض اسلئے انکار
کیا ہو کہ یہ مذہباً ممنوع ہے۔ ممکن ہے اس کے گوشت کے تصور سے ہی آپکو کراہت محسوس ہوتی ہو۔ ہو
سکتا ہے کہ بچپن سے ہی آپ کو یہ سکھایا گیا ہو کوئی شائستہ اور معقول شخص یہ گوشت نہیں کھا سکتا۔ لہذا
آپ کیونکر یہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ بد چلنی کتنی ہی عام کیوں نہ ہو ایک عیسائی ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ
ایک سے زیادہ بیویوں کی ہرگز اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ مسلمان اور عیسائی دونوں کو بت پرستی کے
خیال سے ہی کوفت ہونے لگتی ہے۔ اسکے برعکس ایک ہندو اور بدھی کو اسمیں روحانی سکون ملتا ہے

پابندی رسوم کے یہی پانچ محرکات ہیں۔ اگر آپ کی نگاہ میں انکے علاوہ کچھ اور بھی ہوں تو اس فہرست میں انکا اضافہ کر لیجئے لیکن یہ یاد رہے کہ کسی رسم کی پیروی کی توجیح و تفسیر اسکے سبب آغاز سے نہ کیجئے ہو سکتا ہے کہ بعض رسوم کے اصل محرکات بدل چکے ہوں اور اب انکی پیروی کسی دوسری وجہ سے کی جا رہی ہو۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ پیروی کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ضرور ہے۔ اہل امریکہ تعطیل تشکر کی وجہ پیش کرتے ہیں کہ یہ اس رسم کی یادگار ہے جو ابتدائی نو آباد کاروں نے اپنی فصل کے کاٹنے کے موقع پر بارگاہ خداوندی میں شکرانہ کے طور پر ادا کی تھی۔ چینی پانچویں مہینے کی پانچویں تاریخ کو میٹھے چاول پتوں میں لپیٹ کر دریا میں بہاتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس دن کوئی سورما ڈوب گیا تھا۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک اس رسم کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ پانی کے دیوتا کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ایسا کیا جاتا ہوگا تاکہ انکی خفگی سیلاب کا موجب نہ ہو۔ اس طرح سلام کے موقع پر ہیٹ اٹھانے کی توجیح یہ ہے کہ اس رسم کی یادگار ہے۔ جب نائٹ ہیٹ اتار لیتے تھے تاکہ ان پر دشمن ہونے کا گمان نہ ہو۔ مصافحہ کرنا بھی اس طریقہ کی یادگار ہے جسمیں لوگ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انکے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہاتھ بڑھا دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں مسلمان نماز پڑھتے وقت رفع یدین جو کرتے تھے تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ معلوم ہو جائے کہ کسی کی بغل میں کوئی بت یا ہتھیار تو نہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ان رسموں کی پابندی کی یقیناً یہ وجوہ نہیں ہیں ہمیں انکے موجودہ سبب تلاش کرنے چاہیئے۔

رسموں کی کوئی ایسی واضح فہرست تیار نہیں کی جا سکتی جسمیں ہر رسم کی پابندی کے خاص وجوہ دیئے ہوئے ہوں۔ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہم کسی کام کو کئی ملے جلے محرکات کی بنا پر کرتے ہیں ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام کو مختلف اوقات میں مختلف وجوہ کی بنا پر کیا جائے۔ اگر آپ اپنے محرکات کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے کسی فعل پر غور کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بدلتے ہوئے حالات میں اس فعل کے بارے میں آپ کونسا رویہ اختیار کریں گے۔ مثلاً ٹپ کرنے کے فعل کو ہی لیجئے اور غور کیجئے کہ مختلف حالات میں آپ کیا کریں گے۔ اگر کوئی دیکھنے والا یا ایک میز پر کھانے پینے والا بیرہ نہ ہو یا آپ کو وہاں اگر دوبارہ نہ آنا ہو تو کیا آپ ٹپ کریں گے۔ اگر آپ کو اس کا کوئی اندازہ نہ ہو تو ٹپ یعنی بخشش کتنی ہونی چاہیے تو آپ کونسا طریق عمل اختیار کریں گے۔ کسی سے اسکے متعلق کچھ پوچھیں گے یا نہیں۔ اسی طرح کیا آپ ہمیشہ یہ فکر کرتے

ہیں کہ خط لکھتے وقت آپکے ہجے غلط نہ ہوں یا فقط اہم خطوط لکھتے وقت ہی آپ اس بات کا دھیان کرتے ہیں
عام طور پر رسموں کی توضیح انکی افادیت کے تصور سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ دکھانا مقصود
ہوتا ہے کہ ہم معقول انسان ہیں۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ میں نے فلاں
کام کیوں کیا تو صرف یہ کہہ دینے کی بجائے کہ اس سے میرے رتبے میں اضافہ ہوتا ہے میں کوئی اور بظاہر
معقول وجہ بیان کرنے کی کوشش کروں تاکہ خود غرض نہ سمجھا جاؤں۔ مرد مردانہ لباس اور عورتیں زنانہ لباس
کیوں پہنیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ اس کا ادنیٰ سبب کیا ہے۔ اور اسکا اصلی سبب کیا ہے؟ اعتقاد یا سیکھے
ایک پورے نظام کا دار ومدار اس بات پر ہے کہ انسان اپنی بہبودی کا بہترین لائحہ عمل بنائے اور پھر
اس پر عمل کرے۔ اگر ایک ہی قسم کی مٹھائیوں کے ڈبے مختلف قیمتوں پر بکتے ہوں تو یقیناً لوگ سستا ڈبہ
خریدیں گے۔ یہ بات بھی ہے کہ اگر ہمارے پاس پیسے ہیں۔ تو ہم ہمیشہ ہی انہیں اپنی اشد ضرورتوں پر صرف
کریں۔ زیر نظر کتاب کے ادارہ مصنفین میں سے ایک رکن ابھی حال ہی میں لاہور سے کراچی جا رہے تھے راستے
میں انکا سنگترے کھانے کو جی چاہا۔ اتفاق سے ایک اسٹیشن پر سنگترے موجود بھی تھے مگر دکان دار فی سنگترہ
چار آنے مانگ رہا تھا۔ انہوں نے سوچا یہ بہت زیادہ پیسے مانگتا ہے۔ ہر جگہ دو آنے میں سنگترہ ملتا ہے۔
چنانچہ یہی پیسے انہوں نے کسی دوسری چیز پر صرف کر دیئے۔ حالانکہ سنگتروں کے مقابلے میں انہیں اس کی
چنداں خواہش نہ تھی۔ جس چیز کی طلب ہو اسکو چھوڑ کر کسی اور چیز پر پیسے "ضائع" کر دینا بڑی نامعقول بات معلوم ہوتی
ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ہمیشہ تو معقولیت پسند نہیں ہوتے؟ کبھی کبھی ہم نامعقول باتیں بھی کرتے ہیں۔
اس سے پیشتر کہ ہم یہ دیکھیں کہ رسمیں کیوں ایک سی نہیں رہتیں

چند دوسرے رسوم ورواج

یا انکے معنی کیوں بدلتے رہتے ہیں اور خود انکو بدلنا کیوں مشکل
ہے مزید چند رسموں کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ تالی بجانے کی رسم کو ہی لیجئے جب کوئی مقرر اپنی تقریر ختم کرتا ہے
تو حاضرین کیوں تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ کیا اسلئے کہ سچی تعریف کا آسان طریقہ یہی ہے۔ یا اسلئے کہ لوگ
تقریر سنتے سنتے اکتا جاتے ہیں اور تقریر ختم ہونے کی خوشی میں تالیاں بجاتے ہیں۔ یا اسلئے کہ دوسرے
لوگ انہیں غیر مہذب نہ خیال کریں۔ غالباً جلسے میں بیک وقت یہ تمام جذبات موجود ہوتے ہیں لوگ تالی

کیوں بجاتے ہیں یہ بات ہماری سمجھ میں اس وقت زیادہ اچھی طرح آسکتی ہے۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو کہ دوسرے کیوں تالی نہیں بجاتے۔ اور اس کیلئے ہمیں مختلف موقعوں پر اپنا اور دوسروں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ بدلتے ہوئے حالات میں ہم کسطرح بدلتے ہیں

دوسرے قطار میں کھڑے ہونے کے دستور کو لیجئے۔ بس میں سوار ہونے وقت یا ٹکٹ لینے وقت خواہ کتنی ہی بھیڑ ہو ہم اس طریقہ کی پابندی کیوں کرتے ہیں۔ کیا صرف اسلئے کہ کہیں ہمیں دوسرے برا نہ سمجھیں یا باہمی تعاون اور "رواداری" کا خیال ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے یا پھر قانون کا احترام ہماری تربیت کا جزو بن گیا ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کی رسم بھی قابل توجہ ہے دیکھئے کہ اسکے کتنے مختلف اسباب ہوتے ہیں مثلاً بعض معاشروں میں خاندانی بہتری کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ کوئی نرینہ اولاد خاندان کو چلانے کے لئے ہو چنانچہ جو شخص اس فرض کی ادائگی سے پہلوتہی کرتا ہے وہ گویا اپنے آباؤ اجداد کا باغی اور مجرم ہوتا ہے۔ بعض دوسرے معاشروں میں اسکو مذہبی فریضہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض حالات میں اس سے امارت اور خوشحالی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے جنسی تسکین حاصل کرنا مقصود ہو یا ایک اور رفیق زندگی کی تلاش۔ بعض جگہ اس سے پہلی بیوی کی عزت بڑھ جاتی ہے اسے ایک شریک کار اور مددگار مل جاتی ہے۔

محرکات کے مطالعے میں سب سے زیادہ ہمیں اس چیز پر غور کرنا ہوتا ہے کہ کسی فعل کی لم کیا ہے۔ چنانچہ بہت سے ملکوں میں گود لینے اور متبنٰی بنانے کی رسم عام ہے لیکن اسکے محرکات اور مقاصد جدا جدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے خاندان کا چلانا کام کاج میں ایک اور فرد کا اضافہ۔ بڑھاپے میں منہ بولے والدین کے لئے کسی کفیل اور نگران کی ضرورت، یتیموں اور لاوارثوں کی پرورش کے خیال سے یا محض جذبۂ ہمدردی کے سبب بھی یہ رسم جاری ہو سکتی ہے ممکن ہے اس رسم کا مقصد محض یہ ہو کہ اس انسانی جذبہ محبت کو تسکین بہم پہنچائی جائے جو باپ کو اولاد اور اولاد کو باپ سے حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ بریں جہاں بے اولاد ہونا باعث ننگ خیال کیا جاتا ہے۔ وہاں بھی متبنٰی بنانے کی رسم عام ہو سکتی ہے۔ جزائر انڈمان میں شادی شدہ لوگوں میں یہ رواج بہت عام ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں مہمان جاتے ہیں تو احتراماً یا اظہار دوستی کے واسطے وہ ان سے

انکے کسی بچے کو متبنیٰ بنانے کی درخواست کرتے ہیں جو عموماً قبول کر لی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس خیال کے پیش نظر کہ گود لینے سے قبیلہ کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اس کو معاشرتی فریضہ خیال کر لیا جاتا ہے۔ القصہ گود لینے کے مقاصد اور محرکات کو اچھی طرح سمجھنے کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ متبنیٰ بچے کو معاشرہ میں دوسرے بچوں کا مقام حاصل ہے کہ نہیں کہیں اسکو دوسروں کے مقابلے میں کمتر اور حقیر تو نہیں سمجھا جاتا ہے

اسی طرح بوسہ لینے کے بھی مختلف محرکات اور مقاصد ہو سکتے ہیں۔ وحشی یا نیم متمدن قوموں میں بوسہ لینے کی رسم تقریباً مفقود ہے۔ البتہ متمدن قوموں میں یہ بہت عام ہے مگر اسکے استعمال اور معنوں میں فرق ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق مغربی ممالک کی برسرعام بوسہ لینے کی رسم بہت ہی معیوب ہے جاپان میں محض ماں بچے کا بوسہ لیتی ہے اور دوسرا کوئی شخص ایسا نہیں کرتا۔ فرانس میں ایک جنرل ایک معمولی سپاہی کو تحفہ انعام میں دیتے وقت اس کا بوسہ لیتا ہے۔ ایران میں کسی مہمان کی آمد یا رخصت پر اظہارِ محبت میں اسکا بوسہ لیتے ہیں۔ بعض معاشروں میں چھوٹے اپنے بزرگوں کے ہاتھ یا پاؤں چومتے ہیں۔ اسی طرح مقدس چیزوں کو بھی احتراماً چوما جاتا ہے۔ حج کے موقعہ پر مسلمان احتراماً حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ بوسہ کا محرک جنسی جذبہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بوسہ جنسی جذبہ سے پاک ہو۔

جب ہم کسی نئی رسم سے دوچار ہوں تو ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ جو شخص اس رسم کی پابندی کرتا ہے اسکے نزدیک اس کے کیا معنی ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ہمارے نزدیک اسکے معنی بالکل مختلف ہوں۔ مغربی پاکستان میں جہیز کی عام مروجہ رسم کے مقابلے میں قبائلی علاقوں کی اس رسم کو دیکھئے جس میں لڑکے والے لڑکی والوں کو ایک بڑی رقم دیتے ہیں۔ انکے نزدیک اس رسم کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ عورت خرید و فروخت کی ایک قیمتی چیز ہے جس سے مالک کو ایک کثیر رقم ملسکتی ہے۔ یہ رسم فرد کی حیثیت سے عورت کی قدر دانی کے اظہار کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ رقم کی کمی یا زیادتی سے عورت کی عزت متعین ہو سکتی ہے۔ عورت کے لئے یہ بات باعث عزت بھی ہو سکتی ہے کہ اسکی دولت خاندان کو ور کثیر لا اسی طرح کسی بچے کی دماغی کمزوری کو مختلف معانی پہنائے جا سکتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ایسے بچوں کی پیدائش والدین کے لئے باعث نحوست ہو یا اسے عتاب خداوندی سے تعبیر کیا جائے۔ یا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس بچے کو خدا کا برگزیدہ بندہ تصور کیا جائے اور دوسرے بچوں

کی مانند اس سے بھی ویسی ہی محبت کیجائے ۔ امریکی انڈین قبیلوں میں ایک قبیلہ ایسا ہے کہ اگر انکے ہاں کوئی مر جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ قدرت نے اس خاندان کی تذلیل کی ہے ۔ جسے اس کھوئی ہوئی عزت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی تدبیر کرنا پڑتی ہے ۔ چنانچہ بعض لوگوں کے خیال میں موت عتاب آسمانی ہے ۔ بعض کے نزدیک یہ مشیت ایزدی اور بعض کے خیال میں محض بدقسمتی ہے ۔ بعض معاشروں میں کسی رسم کو مذہبی تقدیس دے دی جاتی ہے ۔ اور بعض دوسرے معاشروں میں اس قسم کا کوئی تقدس انکے ساتھ شامل نہیں کیا جاتا جیسے مسلمانوں کے ہاں شادی اصولاً ایک سماجی بندھن کی حیثیت رکھتی ہے اور عیسائیوں کے نزدیک میاں بیوی کے درمیان جو رشتہ ہوتا ہے وہ الہامی ہے اور اسے فریقین کی زندگی میں توڑا نہیں جا سکتا ۔ بعض معاشروں میں فصلوں کی کٹائی کے وقت جو خوشی منائی جاتی ہے اسکے پس منظر میں کوئی مذہبی جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور بعض میں انتہائی محنت کے بعد ثمرہ ملنے کی خوشی کا اظہار محفل رقص و سرود سے کیا جاتا ہے ۔ غربا کی مدد مذہبی فریضہ بھی ہو سکتا ہے اور محض ہمدردی کا اظہار بھی ۔ پس رسوم اور رسم کے معنی ہمیشہ ایک ہی نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں ۔ اب اگر کوئی کسی کو ڈویل کیلئے للکارتا ہے تو گویا کوئی مضحکہ خیز حرکت کرتا ہے معنی کے شدید اختلاف کی بنا پر مذہبی معاملات میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً مسلمان قرآن مجید چھونے سے پہلے اگر وضو نہیں کر سکتے تو ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے ہیں ۔ اسکا مطالعہ کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔ پاک و صاف جگہ پر رکھتے ہیں ۔ اسکے برعکس عیسائی حضرات انجیل مقدس کو بغیر طہارت کے بھی پڑھ لیتے ہیں ۔ حتٰے کہ اسے فرش پر پاؤں کے سامنے رکھ لیتے ہیں ۔ اور جگہ جگہ پنسل وغیرہ سے یونہی نشانات لگانے سے بھی نہیں چوکتے ان حرکات میں انکے نزدیک کوئی بے حرمتی نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے خیال میں یہ حرکات نہایت ناشائستہ ہیں اور ان سے کلام پاک کی بے حرمتی ہوتی ہے ۔ اصل میں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ دوسروں کی رسموں کے معنی خود انکے نزدیک کیا ہیں ۔ جب کوئی ہندو کسی مورتی کے سامنے جھکتا ہے تو ایک مسلمان یا عیسائی کو اسکا یہ فعل بڑا قبیح نظر آتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خود ہندو اس فعل سے کیا مراد لیتا ہے ۔ مختلف مذاہب میں عبادت کے مختلف طریقے ہوتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان سب میں ایک ہی جذبہ کار فرما ہوتا ہے ۔ اور وہ خدا کی عبادت ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ کبھی عبادت کرتے وقت ایک ہی مذہب کے مختلف

پیروں کاشت جدا جدا ہو۔ عبادت سوداگری بھی تو ہو سکتی ہے، جاپان میں شنتو عقیدہ کے مطابق بادشاہ اوتار ہوتا ہے اسکی تصویر مقدس سمجھی جاتی ہے چنانچہ اگر کسی اسکول کی عمارت جل کر خاکستر ہو جائے اور ہیڈ ماسٹر بادشاہ کی تصویر کو بچانے میں ناکام رہے تو وہ عموماً خودکشی کر لیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک گناہ کا کفارہ فقط جان کی قربانی سے کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک خودکشی انتہائی بزدلانہ فعل ہے اور احکام خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ عیسائی بھی اسے بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں اور کسی حالت میں اسکی اجازت نہیں دیتے۔ کسی زمانے میں ہندوؤں میں بھی ستی کی رسم عام تھی۔ شوہر کی موت پر بیوہ اسی چتا میں جل کر راکھ ہو جاتی تھی۔ لہذا ہم پھر یہی کہیں گے کہ ہم کسی رسم کو اسی صورت میں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں جب ہمیں معلوم ہو کہ اسکے ماننے والوں کے نزدیک وہ کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور کیوں ضروری ہے۔

رسم کا دائرہ عمل

رسم کا تعلق فقط ہمارے افعال سے ہی تو نہیں ہوتا بلکہ اسکا تعلق ہمارے فکر سے بھی ہوتا ہے۔ ہمارے عقائد و دلچسپیاں اور ترجیحات سبھی اس کے دائرہ عمل میں آجاتے ہیں۔ پاکستان میں نوجوانوں کی کرکٹ سے بڑھتی ہوئی دلچسپی جاپان میں پھولوں کو قرینے سے سنوارنا اور سجانا اور اٹلی میں موسیقی سے لگاؤ مختلف رسمیں ہی تو ہیں۔ چنانچہ اگر غور سے دیکھیں تو وہ تمام خیالات و نظریات جن کو ہم "روایت فکر" کہتے ہیں جنکی جڑیں معاشرے میں دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ رسوم ہی کے تحت جمع کئے جا سکتے ہیں۔ جمہوریت۔ جماعتی آمریت یا مطلق العنان قسم کی حکومتوں کا انحصار کسی روایت فکر پر ہی ہوتا ہے جو گوناگوں طریق سے ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کسی معاشرہ کے افراد کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہے کہ فلاں فلاں خیالات اور نظریات محض "رسمی" و "روایاتی" ہیں۔ انکی صداقت مشتبہ ہے۔ ایسی صورت میں وہ ان خیالات پر زیادہ اصرار نہیں کرتے۔ ہمیشہ نئے شواہد کی تلاش میں رہتے ہیں اور انکے مطابق اپنے نظریوں میں تبدیلی و ترمیم کرتے رہتے ہیں۔ اس سے انکی زندگی میں جمود نہیں آنے پاتا وہ متحرک اور نامیاتی ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چند ایک مروجہ خیالات ہماری قوت

فکر کو مفلوج کر دیں ہم خود نہ کچھ سوچیں اور دوسروں کے انداز فکر کو جائز اور معقول سمجھنے لگ جائیں۔
کسی خیال کی صداقت کے لئے کسی بزرگ پیر یا لیڈر کو کافی سمجھیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی
غور و فکر کی جگہ شخصیت پرستی زور پکڑ جاتی ہے۔ کسی بھی نظریہ پر ناقدانہ نگاہ ڈالنا اس کے تقدس پر حملہ
تصور کیا جائے اور یوں ہمارے معاشرے کے قوائے فکر و عمل پر جمود و تعطل طاری ہو جاتا ہے حقیقت
بھی یہی ہے کہ ہمارے اعمال عقائد و خیالات کا بیشتر حصہ اسی قبیل کا ہوتا ہے جس میں ہمارے
ذاتی تجربے اور مشاہدے کا بہت تھوڑا دخل ہوتا ہے۔ مذہب کے دعویدار ہونے کی حیثیت
سے ہمارا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ ہم اپنی ذاتی تجربے کی بنا پر براہ راست معرفت حاصل
کریں۔ دوسروں کے اعمال و عقائد کو فی نفسہٖ قبول نہ کریں۔ معاشرتی نفسیات کا ایک عالم اسی
حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ہمارے ذہن میں ایسے خیالات پرورش پا
رہے ہوں جنکی اساس کے بارے میں کچھ پوچھنا عموماً غیر ضروری بے سود اور فضول وقت صرف
کرنا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خیالات غیر معقول ہیں اور غالباً انکی بنیاد ناکافی شواہد اور دلائل پر ہے[1]
ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ایسے خیالات محض رسمی اعتقاد کی حیثیت سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ البتہ اس
سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ہمیں کسی مروجہ خیال یا روایت فکر کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے اور اگر ہم ایسا
کرتے ہیں تو بڑے احمق ہیں۔ کوئی شخص اپنے خیالات و نظریات کا عشر عشیر بھی از خود نہیں سوچ
سکتا۔ ان کا معتدبہ حصہ لازماً اسے دوسروں سے قبول کرنا پڑتا ہے اور جوں کا توں مان لینا ہوتا
ہے جیسے ہم آئن سٹائن کے نظریہ اضافی کو پوری طرح نہیں سمجھتے مگر اسکی صداقت پر ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے
ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ فقط اتنی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہمیں کوئی روایت فکر اسکی
قسم کا کوئی نظریہ کسوٹی پر پرکھے بغیر نہیں مان لینا چاہیئے۔

ایک سوال

انسانی رسوم کے اس مختصر جائزہ کے بعد آخر ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں کیا
ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ رسمیں ہماری ضرورتوں کی تکمیل ہی کی مختلف شکلیں

1 Trotte: Instinct of Herd in Peace and War

ہیں اسلئے کسی رسم کو اچھا یا برا کہنا درست نہیں۔ ممکن ہے یہ دلیل بہت سے رواجوں کے بارے میں تو درست ہو لیکن تمام رسوم کے متعلق ہرگز قبول نہیں ہو سکتی۔ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے کچھ طریق ایسے بھی ہیں۔ کہ ان پر چلنا ضرورت سے زیادہ ناخوشی مول لینا اور بدی کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ گرفتار شدہ دشمن کو قتل کرنے کی بجائے اسے غلام بنا لینا زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ غلامی وہ بدبختی ہے جس میں شاذ ہی کسی فرد کی شخصیت پورے طور پر نشو و نما پا سکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کچھ رسمیں بھی ہیں ہم انہیں بدل بھی دینا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ اگر اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیں ان سے بہتر طریق دستیاب ہو جائیں تو ہم نسبتاً زیادہ خوش رہیں گے۔ مگر ہم اس امر سے بھی تو انکار نہیں کر سکتے کہ خود ہماری ضرورتوں کے درمیان اکثر کشمکش جاری رہتی ہے۔ جو نہ صرف مختلف رسوم کو پیدا کرتی ہے بلکہ انکے فعال یا غیر فعال ہونے کا سبب بھی ہوتی ہے جب یہ بات ہے تو پھر ہم رسموں کو بدل کیوں نہیں ڈالتے۔ جب کسی ضرورت کو دو مختلف طریقوں سے پورا کیا جا سکتا ہو تو ہم فوراً ہی ایک کے بدلے دوسرا کیوں اختیار نہیں کر لیتے۔ آخر "پانی" کے مقابلے میں "واٹر" کہنا کچھ اتنا مشکل تو نہیں پھر ہم "پانی" کہنے پر مصر کیوں رہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ رسموں پر عمل درآمد کرنے کے لئے معاشرتی تعاون درکار ہوتا ہے، اگر ہم "پانی" کی بجائے واٹر لکھنے لگیں تو وہی لوگ اسکا مطلب سمجھیں گے جو انگریزی جانتے ہونگے اور ایسے لوگ یقیناً ہمارے معاشر میں کم ہیں، آپ نے اس پنجابی ماں کی کہانی تو سنی ہوگی جس کا لڑکا ایران سے واپسی پر فارسی بولنے لگا اور ایک دن "آب آب" کہتے ہوئے پیاسا مرگیا، اور جب ماں کو معلوم ہوا کہ آب کے کیا معنی ہیں تو وہ دھاڑیں مار مار کر روتی جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کا بیٹا "پانی" مانگ رہا تھا تو وہ اسے مٹکے بھر بھر کر پانی پلاتی اور مرنے نہ دیتی۔ معاشرتی تعاون کے اصول کو یکسر نظر انداز کرنے سے اس قسم کے ناخوشگوار حادثات کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ ذرا اس میزبان کی "حالت" کا بھی اندازہ لگائیے جو بلا سوچے سمجھے یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ فلاں قسم کی

ضیافت پر بہت خرچ آئے گا اور چونکہ اس سے مہمان کو بھی تکلیف ہوگی لہذا کیوں نہ سیدھی سادی دال روٹی کھلا دی جائے۔ اور جب وہ واقعی "ماحضر" پیش کرے تو مہمان اسے اپنی ہتک سمجھے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر ہمارے ایک شاعر دوست نے نہایت بے ساختگی و معصومیت سے کہہ دیا تھا کہ لعنت ہو، اس سچ پر، میں تو سمجھا تھا تم تکلف کر رہے ہو جو مجھے محض "دال روٹی" پیش کر رہے ہو۔ تم نے تو واقعی دال روٹی میرے سامنے لاکر رکھ دی ہے پس ایک بار پھر اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یاد نر لوگ اپنی ہی رسموں کو صحیح، مناسب اور شائستہ سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ انہیں ذاتی طور پر ناپسند ہی کیوں نہ ہوں یا وہ ان کے لئے تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔ مہمان کو مرغ مسلم اور پلاؤ وغیرہ کھلانا چاہیئے چاہے اس کے لئے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

رسموں میں تغیر و تبدل

بایں ہمہ رسمیں بدلتی رہتی ہیں۔ جب کوئی واحد شخص یا چند لوگ بعض دوسرے لوگوں کی مخالفت اور دشمنی کے باوجود کسی نئی رسم پر چلنا شروع کر دیتے ہیں تو گویا اس رسم کو بدل دینے کی مہم شروع ہو گئی۔ وہ لوگ جنہوں نے پہلے پہل غلامی کی مخالفت کی۔ لوگوں نے انہیں دیوانہ کہا۔ جن عورتوں نے سب سے پہلے ڈاکٹری یا وکالت کا پیشہ اختیار کیا لوگوں نے انہیں مردانہ کہہ کر ان کی نسائیت کی تحقیر کرنا چاہی۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے عوام کو مفت تعلیم دینے کی وکالت کی یا عوام کو حق رائے دہندگی دلانا چاہا انہیں طرح طرح کے "خطابوں" سے نوازا گیا۔ اسی طرح بڑے بڑے انبیاء اور مصلحین کو برے لوگوں کی ہی نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اسکے باوجود وہ اپنے طرزِ عمل پر جمے رہے اور اپنے انداز فکر کو عام کرنے کی سعی کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج یہ ساری باتیں ناقابل عمل و فہم تو کجا بالکل عام ہو گئی ہیں۔ جن مردوں نے پہلے پہل دست واچ استعمال کرنا شروع کی انکے "زنانہ پن" کا ہر کسی نے مذاق اڑایا مگر آج کون مرد ایسا ہے جو کلائی پر گھڑی باندھنا "زنانہ پن" سمجھتا ہو یا اگر خرید سکتا ہے تو دست واچ نہیں خریدتا۔ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ رسمیں بدل سکتی ہیں مگر جو شخص کسی رسم کو بدلنا چاہتا ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کس رسم سے کونسی

ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ اس رسم کا پورے معاشرتی نظام سے کیا تعلق ہے۔ مثلاً اگر آپ کسی نئی مشین کا جائزہ لے رہے ہیں تو آپ اس کے کسی ایسے پیچ یا پرزے کو جو آپ کے نزدیک بالکل بے کار یا بے مصرف ہے، اس وقت تک نہیں چھیڑیں یا بدلیں گے جب تک کہ آپ بغور یہ نہ دیکھ لیں کہ اس پرزے کا کیا کام ہے اور وہ کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے یا نہیں۔ رسموں کا بھی یہی حال ہے۔ جزائر فلیپائن کے بعض قبیلوں میں یہ رسم تھی کہ آریوں کو قتل کر کے ان کے سر جمع کیے جایا کرتے تھے۔ اور جس کے پاس زیادہ سر ہوتے تھے اس کی اتنی ہی زیادہ عزت ہوتی تھی۔ صرف تلقین و نصیحت یا سزا کے ذریعے اس قبیح رسم کو ختم کرنا ممکن نہ تھا لیکن جب وہاں فٹ بال کا کھیل رائج ہوا اور اچھے کھلاڑیوں کی عزت ہونے لگی تو نوجوان سروں کو جمع کرنے کے مقابلے میں مخالف ٹیم پر گول پہ گول کرنے کو ترجیح دینے لگے اور آہستہ آہستہ یہ رسم ختم ہو گی۔

رسموں کے اس جائزے سے ہم نے انسانی فطرت کے متعلق کیا سیکھا؟ ممکن ہے کہ بادی النظر میں جب ہم دنیا کے مختلف رسوم و رواج پر نگاہ ڈالیں تو ہم یہ کہیں کہ انسان کی کوئی مخصوص فطرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا حیوان ہے جو ہر طرح کی رسمیں اور طریقے سیکھ سکتا ہے اسکی مثال گندھی ہوئی مٹی کی ہے جسے جس شکل میں چاہیں ڈھال لیں۔ تاہم اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آتی ہے کہ دنیا بھر میں انسان کی بنیادی ضرورتیں یکساں ہیں۔ ہر جگہ جائز اور ناجائز، حیا اور بے حیائی، تعظیم و توہین اور خوشی و غم کا تصور موجود ہے۔ اور شاید کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے۔ جس میں کہیں نہ کہیں کوئی مذہبی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو۔ ہر جگہ لوگ کامیابی کے خواہاں، وقار کے طلب گار اور اچھی شائستہ زندگی بسر کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ بیسیوں اور سینکڑوں اختلافات کے باوجود فطرت انسانی ہر جگہ ایک ہے اور ہمیں کوئی انسانی فطرت ایسی نظر نہیں آتی جو ماحول سے اثر پذیر نہ ہوتی ہو۔ انسان بہرحال انسان ہے۔ حیوان یا مشین نہیں ہے[1]۔

---

[1] اس باب کی بہت سی مثالیں کیلن برگ KEILENEBERG کی مشہور کتاب معاشرتی نفسیات مطبوعہ ہولٹ سے ماخوذ ہیں۔ اس میں اس نے رسموں کی معاشرتی اہمیت پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اور دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں کی رسموں کو موضوع بحث بنایا ہے۔

انسان کی ابتدا اور اسکے رسم و رواج کی روشنی میں اسکی فطرت کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک قابل قبول ہے اسکا بہترین فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ اگلے باب میں ہم حیثیت اور منصب سے متعلقہ امور کو زیر بحث لائیں گے تا کہ علاوہ دیگر باتوں کے ہمارے اخذ کردہ نتائج کی مزید وضاحت ہو جائے۔

(٥)

تیسرا باب

حیثیت اور منصب

ابتدائیہ شیکسپیئر کہتا ہے کہ دنیا ایک تھیٹر ہے اور مرد اور عورتیں اسکے اداکار۔ ہر شخص اپنی اپنی باری پر اپنے پارٹ ادا کرتا ہے۔ شروع میں وہ صرف ایک شیر خوار بچہ ہوتا ہے۔ اور ذرا بڑا ہو کر طفلِ مکتب۔ پھر نوجوانی میں قدم رکھتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے۔ شادی ہونے پر وہ شوہر کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور آخر میں بوڑھا پھوس ہو جاتا ہے جس کے نہ منہ میں دانت ہوتے ہیں نہ پیٹ میں آنت۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسکی حیثیت بدلتی رہتی ہے:-

معاشرہ میں جو مرتبہ کسی کو حاصل ہوتا ہے وہی دراصل اسکی حیثیت ہوتی ہے۔ مثلاً کرنل الٰہی بخش ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں اور میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ مسٹر شوکت ایف سی کالج کے انگریزی ایم اے کے طالب علم ہیں اور غیر شادی شدہ ہیں۔ رضیہ فلاں تاجر کی بیوی ہے جس کے دو شادی شدہ بیٹے اور کئی پوتے پوتیاں ہیں۔ ان حقائق سے ہر شخص کی حیثیت کا ایک دھندلا سا خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرے میں کیا پارٹ ادا کر رہا ہے۔

حیثیت اور منصب کا فرق جب آپ کوئی فلم دیکھ رہے ہوں تو آپ کے سامنے

بہت سے افراد ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ حیثیت ہوتی ہے مثلاً کوئی صاحب خانہ ہے۔ کوئی ملازم اور کوئی شادی کے قابل لڑکی۔ ہر شخص اپنا پارٹ نہ صرف اپنی شخصیت اور مخصوص مزاج کے مطابق ادا کرتا ہے بلکہ اس میں اسکی "حیثیت" کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے یہاں حیثیت اور منصب کے فرق کو واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جب حیثیت عمل میں ڈھل جاتی ہے تو وہ منصب بن جاتی ہے۔ اوپر کی مثال سامنے رکھیئے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کی حیثیت یہ ہے کہ وہ میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں اور ان کا منصب کالج کے امور کا بندوبست کرنا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی شخص ہوتا تو ہے حامل حیثیت لیکن ادا کرتا ہے فرض منصبی :-

حیثیت کے متعلق توقعات

کسی شخص کی عمومی حیثیت میں اسکی مختلف مخصوص حیثیتیں شامل ہوتی ہیں مثلاً گھر میں امجد اپنے والدین کا سب سے بڑا لڑکا ہے کالج میں فسٹ ایئر کا طالب علم اور فٹ بال ٹیم کا ممبر ہے۔ کسی اجنبی سے جب اس کا تعارف کرایا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ آپ ہیں مسٹر امجد شہر کے فلاں مشہور خاندان کے چشم و چراغ اگر وہ کسی غیر ملک کی سیاحت کو روانہ ہو جائے تو وہاں کے باشندے ان سے ایک پاکستانی کی حیثیت سے بھی متعارف ہوں گے۔ چنانچہ وہ بہ یک وقت متعدد منصب ادا کرتے ہیں کسی شخص کی حیثیت کا اسکے کردار اور شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ کسی معاشرے میں حیثیت کو کیا مقام حاصل ہے تو اس معاشرہ کے مختلف افراد کے درمیان جو باہمی تعلقات ہیں ان کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جیسی کسی کی حیثیت ہوتی ہے اس سے اسی قسم کے کردار کی توقع کی جاتی ہے دوسرے لفظوں میں کسی خاص حیثیت کے ساتھ خاص طرز کا کردار متعلق ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت کے حامل سے یہ توقع کیجاتی ہے کہ وہ اس کے برعکس کردار کا مظاہرہ نہیں کرے گا مثلاً مردوں سے یہ توقع کیجاتی ہے کہ وہ مردانہ لباس اختیار کریں اور عورتیں فقط عورتوں کا سا لباس زیب تن کریں اور مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا لباس پہننے سے روکا جاتا ہے۔ مردوں کو یہ مراعات حاصل ہیں کہ وہ آزادانہ پھر سکتے ہیں مگر عورتوں کو مردوں کی طرح کھلے بندوں گھومنے پھرنے کی

اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وہ اگر چاہیں تو اپنی ہم جنسوں سے خوب گپ شپ کر سکتی ہیں مگر مردوں
کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عورتوں سے بے تکلف بات چیت کریں۔ ایک طالب علم کے لئے تو آسان
ہے کہ وہ جماعت سے غیر حاضر ہو جائے اور معمولی جرمانہ ادا کر دے۔ مگر یہ بات ایک استاد کے
شایان شان نہیں اسکی حیثیت اسے اجازت نہیں دیتی کہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے پہلو تہی کرے۔
اسی طرح پاکستان میں جہاں بڑی عمر کے آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نوجوان کی نسبت زیادہ آزادانہ
طریق پر اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے وہاں اس پر یہ پابندی بھی عائد کر دی جاتی ہے کہ وہ ملک
کی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہر حیثیت کے افراد کے لئے مخصوص مراعات
اور پابندیاں ہوتی ہیں اور شخصیت کی تعمیر و ارتقا پر انکا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ علاوہ بریں ہر حیثیت کے فرد
کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے ایک شوہر سے خاندان کی کفالت اور بیوی سے امورِ خانہ داری
اور بچوں کی پرورش کی توقع کیجاتی ہے۔ اسی طرح طالب علم کی ذمہ داری محنت سے پڑھنا اور امتحان
دینا اور کامیابی حاصل کرنا۔ ملازم کے ذمے مالک کی اطاعت کرنا اور فوجی افسر کا کام شجاعت اور
دلیری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ان میں سے ہر حیثیت کا حامل فقط اپنے سے متعلق ذمہ داریوں کا بوجھ
اٹھاتا ہے کسی دوسری حیثیت کے فرد کی ذمہ داریوں سے اسکو کوئی سروکار نہیں ہوتا چنانچہ طالبعلم
استاد کی ذمہ داریوں اور بیوی کنبے کی کفالت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اسی طرح محاذِ جنگ
پر کسی اعلیٰ فوجی افسر کی بزدلی ایک معمولی سپاہی کی بزدلی کے مقابلے میں زیادہ قابل نفرت سمجھی جاتی ہے
جب معاشرتی تعلقات میں ہم آہنگی ہو تو جن حیثیتوں کے لوگوں کو زیادہ استحقاق و مراعات
حاصل ہوں انکی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً کالج میں پرنسپل کے اختیارات اور ذمہ داریاں
ایک لکچرار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک ملازم کو اس بات پر تعجب ہو سکتا ہے کہ آخر
اسکا دولتمند آقا خوش کیوں نہیں رہتا۔ اسی طرح آقا کو بھی اپنے ملازم پر رشک آسکتا ہے جسے
محض معمولی فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔ نہ اسے اچھے لباس کی فکر ہوتی ہے اور نہ اپنی اولاد کو
اعلیٰ تعلیم دلانے کی۔ اور نہ کسی خاص دولت و مرتبہ کی۔ اس چیز کو ذرا وضاحت سے سمجھانے کے

ذیل بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی کتاب پس پردہ[1] سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ایک خاندانی رئیس مسلم خاتون کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔ رسوم و روایات کا اثر صرف اسکے افعال و حرکات پر ہی نہیں پڑتا بلکہ وہ اسکے اخلاق و عادات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسکے لئے بڑی سخت پابندی ہوتی ہے کہ اسے کن لوگوں سے بے تکلفی سے باتیں کرنا چاہئیں اور کن سے بزرگانہ شفقت سے۔ خصوصاً جب کہ خاندان کے افراد کی تعداد کوئی دو سو کے لگ بھگ ہو اسکے لئے یہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ خاندان کے کون کونسے افراد کس درجے بے تکلفی یا پاس ادب کے مستحق ہیں۔ اس معاملے میں معمولی سی لغزش پر بھی اسے "خمیر" کا لقب دے دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی وضع دار رئیس خواتین حاجت مندوں کی کفالت بھی بعض اوقات اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔

تصوّرِ ذات

شخص جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اپنی حیثیت کے مطابق عمل کرتا ہے لیکن اسکے اس کردار کو کسی دوسرے شخص کے اچھے یا برے سلوک کا محض ردعمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ قوتیں جو اسکے افعال کو تحریک دیتی ہیں یا جو انہیں روک لیتی ہیں تمام تر اسکے اپنے اندر موجود ہوتی ہیں اور ہنگامی بھی نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی اقدام کرتا ہے اور ایسا کرنے میں ہی اسے آسانی رہتی ہے اس کے برعکس کوئی قدم اٹھانے میں وہ لیت و لعل کرتا ہے وہ اپنے متعلق ایک خاص تصور رکھتا ہے جسے ماہرین نفسیات "تصور ذات" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یہ تصور ذات ہی وہ مؤثر قوت ہے جو شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نہایت اہم حصہ لیتی ہے۔ فی الواقع ہر شخص اپنے اپنے تصور ذات کے مطابق زندگی میں اپنی جیتی جاگتی تصویریں بنانے میں منہمک رہتا ہے اسی کے تحت ہر شوہر صحیح قسم کا شوہر ایک تاجر صحیح قسم کا تاجر اور ایک غنڈہ صحیح غنڈہ بننا چاہتا ہے۔ یہ اسی تصورِ ذات کا کرشمہ ہے کہ ایک شخص باوجود اپنے منصب کو پسند نہ کرنے کے یا یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ اس پر زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ اسکے فرائض

1 BEHIND THE VEIL PP-17

ٹھیک ٹھیک ادا کرنا چاہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود تصور ذات کیسے پیدا ہوتا ہے۔ تصور ذات کی تشکیل و تعمیر میں ان تمام مروجہ اوہام اور خیالات کا ہاتھ ہوتا ہے جن میں کوئی انسان گھرا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو مختلف فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور ان سے انہیں صحیح طریق پر ادا کرنے کا گر سیکھتا ہے۔ مانا کہ معاشرتی دباؤ خود ایک زبردست معلم ہے مگر کسی منصب کے فرائض ٹھیک طور پر ادا کرنے میں خود ہمارے ارادے اور مرضی کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ انگلستان کی ملکہ چاہتی ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں ملکہ ہوں۔ اسی طرح جب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کو اپنی محبوبہ اور تخت شاہی میں کسی ایک کو منتخب کرنے کا موقعہ آن پڑا تو انہوں نے وفا شعار اور ثابت قدم عاشق بننے کو ترجیح دی ہے

ایک حیرت انگیز مثال

تصور ذات کے اثر و توانائی کی ایک حیرت انگیز مثال حال میں اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ سید خاندان کی ایک خاتون بہت سخت بیمار ہو گئیں انکے بچنے کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ انہیں خون دیا جائے اتفاق سے کسی سید کا خون دستیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ انہوں نے کسی غیر سید کا خون لینے سے مرجانا بہتر سمجھا۔ اپنے تصور ذات کے مطابق اس خاتون کو اپنے سید ہونے پر اس درجہ فخر تھا کہ اپنے خالص ساداتی خون کی حفاظت میں اس نے جان دے دی۔ حالانکہ کیمیاوی اعتبار سے اس کے خون اور دوسرے لاکھوں غیر سیدوں کے خون میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اگر ہم اس نکتہ کو مزید سمجھنا چاہتے ہیں کہ حیثیت کسطرح شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے تو ہمیں خلقی حیثیت اور اکتسابی حیثیت کے تعلق کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ ہر شخص کسی خاص صنف خاندان اور قوم میں پیدا ہوتا ہے اپنے خاندان سے وہ ایک خاص قسم کا ماحول معاشی حیثیت اور مذہبی عقیدہ حاصل کرتا ہے اپنے کنبے میں اسکی ایک خاص پوزیشن ہوتی ہے جیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بڑا لڑکا ہو یا آخری لڑکی۔ ذات پات کی تمیز کو ماننے والے معاشرے میں پیدائش کے وقت ہی اسکے پیشے اشادی وغیرہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ وہ کونسا پیشہ اختیار کرے گا اور کہاں اور کس کے ساتھ شادی کرنے کا مجاز ہوگا۔

اسی طرح دوران حیات وہ مختلف حیثیتیں حاصل کرتا ہے مثلاً وہ بی اے کرتا ہے کسی ٹیم کا کپتان بن جاتا ہے یا صحافت کو پیشہ کے طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اسکی اکتسابی حیثیتیں ہوتی ہیں:۔

حیثیتوں میں تبدیلی

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پیدائشی حیثیت بالکل بدل ہی نہیں سکتی۔ آئے دن ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ "فلاں مرد عورت بن گیا ہے" کیا واقعی اسکے یہ معنی ہیں کہ جو شخص "باپ" کی حیثیت سے بچہ پیدا کرنیکے لئے آیا تھا وہ اب "ماں" کی حیثیت سے "بچہ جننے" کا فرض ادا کرے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی عورت مرد بن کر باپ کا منصب ادا کر سکے۔ ہم دونوں اصناف کے آلات تناسل پر عمل جراحی کر کے انہیں ختم تو نہ کر سکتے ہیں لیکن انکی جگہ نئے آلات پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر عورت کے مرد اور مرد کے عورت بننے کے کیا معنی؟ اسکے معنی صرف یہ ہیں کہ اس شخص کی معاشرتی حیثیت بدل گئی۔ وہ شخص جسے لوگ اب تک مرد سمجھتے رہے۔ جس کے ساتھ مردوں کا سا سلوک کیا جاتا رہا اور جو مردانہ لباس پہنتا تھا آج سے اسکے ساتھ عورتوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ اسکو عورت سمجھا جائیگا اور وہ عورتوں کے سے کپڑے پہنے گا۔ آخر کیوں اور اس سے فائدہ؟ بات یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں میں مختلف جسمانی ساخت اور مزاج کے فرد ملتے ہیں مثلاً بعض لڑکوں میں مردانہ پن بہت ہی زیادہ ہوتا ہے لیکن بعض میں نسائیت غالب ہوتی ہے۔ وہ لڑکیوں کے کھیل اور انکی حرکات کو طبعاً پسند کرتے ہیں۔ انکے جسم لڑکیوں کیطرح نرم و نازک آواز عام لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ کوچ دار اور رسیلی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسے لڑکے خلوص اور سنجیدگی سے چاہتے ہیں کہ کاش ہم لڑکی ہوتے۔ وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ شاید لڑکی کی حیثیت سے وہ زیادہ کامیاب رہتے" لڑکے کی حیثیت سے تو وہ بہت ناکام ہیں۔ انکے مردانہ جنسی اعضا کی پوری طرح نشو و نما نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انکے نامکمل زنانہ جنسی اعضا بھی ہوں۔ ان حالات میں وہ اپنے مخصوص ماحول میں بڑے مغموم رہتے ہیں، انکے لئے لڑکیوں کا پارٹ ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ

انکا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ایسا شخص ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اپنا عقدہ اسکے سامنے رکھ دیتا ہے ڈاکٹر کو بھی اسکی حالت پر ترس آجاتا ہے اور وہ اسکی حیثیت بدلنے میں مدد دینے کا وعدہ کرلیتا ہے چنانچہ عورتوں کے ہارمون ٹیکہ کے ذریعے اس کے جسم میں داخل کئے جاتے ہیں اور دبی ہوئی نسائیت اور ابھر آتی ہے۔ ممکن ہے اسکے مردانہ عضو کا اپریشن بھی کیا جاتا ہو بہرحال یہ اعلان کردیا جاتا ہے کہ فلاں مرد عورت ہو گیا ہے۔ اب اسکے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ مردانہ لباس اور حرکات کو چھوڑ دے اور حسب خواہش زنانہ طریقہ زندگی اختیار کرلے۔ اس حالت میں اسکے لئے بچہ جننا ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے عین مطابق اب وہ عورتوں کی سی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اس شخص کے متعلق مبالغہ آمیز حکایات پھیلائی جاتی ہیں اور عام لوگ یقین کرلیتے ہیں کہ واقعی ایک مرد عورت بن گیا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ تبدیلی صرف معاشرتی حیثیت میں ہوئی ہے۔ حقیقتاً یہ بہت مشکل ہے کہ اسے پورے طور پر عورت کی حیثیت سے معاشرہ میں قبول کرلیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے شکوک کی وجہ سے اس حیثیت میں بھی خوش نہ رہ سکے۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ اس نے اپنے مردانہ منصب کو تبدیل کردیا اور اپنی پیدائشی حیثیت کو ترک کردیا۔

اسی طرح نسلی حیثیت میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جن کا شجرۂ نسب مختلف قوموں کے افراد سے مرتب ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی نسلی حیثیت کو عموماً معاشرتی رواج سے متعین ہوتی ہے مگر کبھی کبھار انکی مرضی کا اس میں دخل ہوتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں جو بچے سفید نسل اور حبشی نسل کے اختلاط سے پیدا ہوتے ہیں وہ گورے سمجھے جاتے ہیں لیکن شمالی امریکہ میں ان کو حبشی خیال کیا جاتا ہے۔ ایسا حبشی بچہ جسکا رنگ کھلتا ہوا ہو سازگار حالات میسر آنے پر اپنی مرضی سے اپنی سابقہ حیثیت چھوڑ سکتا ہے اور سفید قوم کے فرد کی حیثیت سے زندگی گذار سکتا ہے۔

ہر بچہ کسی نہ کسی گھر میں جنم لیتا ہے مگر اسکی خاندانی حیثیت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ معاشرہ کس مرد اور کس عورت کو اسکے والدین کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے پھر بعض معاشروں میں کسی بچے

کو نہایت آسانی سے متبنیٰ بنایا جا سکتا ہے اور اسے خاندان کا حقیقی فرد تصور کیا جا سکتا ہے اسکے برعکس پاکستان میں خون کے رشتے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے متبنیٰ بچہ اسوقت تک خاندان کا اہم یا حقیقی فرد نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ ایک جدی نہ ہوں۔

عمر کے لحاظ سے جو حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ بھی عمر کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ مگر ایک ہی عمر کے دو افراد کا منصب جدا جدا ہو سکتا ہے۔ پاکستان میں لڑکے قانونی طور پر ۲۱ سال کی عمر میں بالغ مانے جاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۸ سال کی عمر میں۔ لیکن بعض لڑکے نسبتاً جلدی بالغ تسلیم کر لئے جاتے ہیں، اور وہ خود بھی اپنے آپ کو بالغ تصور کرتے ہوئے بالغوں کی سی ذمہ داریاں اور کام سنبھال لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض ۵۰ سالہ مردوں اور عورتوں کا شمار بوڑھوں میں ہوتا ہے۔ اور بعض کا درمیانی عمر کے لوگوں میں۔

معاشرتی ورثے کے سبب جو حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ بعض معاشروں میں بعض دوسرے معاشروں کی نسبت آسانی سے تبدیل ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے اور یوں اپنے گھر کے ماحول سے دور ہو جائے۔ اور اپنے والدین کے مذہب کو بھی ترک کر دے۔ ایسا کرنے سے وہ گویا پرانے معاشرتی رشتوں کو توڑ کر نئے سماجی ناطے جوڑ لیتا ہے اسی طرح خاندانوں پر اچھے یا برے دونوں قسم کے دن آ سکتے ہیں۔ خوش حال گھرانے بدحال بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک بچہ اپنے والدین سے کہیں زیادہ تعلیم بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے کو ہنر سے ہنر بنانے کی "خواہش" اسے ورثے میں ملی ہو۔

ذاتی کوشش یا انتخاب کے ذریعہ حاصل شدہ منصب کے متعلق یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ اسکا انحصار ایک بڑی حد تک اس "رتبے" پر ہوتا ہے جو ورثہ میں ملتا ہے۔ ایک لڑکے کیلئے لڑکی کے مقابلے میں سیاسی لیڈر، وکیل یا تانگے والا بننا کہیں آسان ہوتا ہے۔ امریکہ میں اب عورتوں کے لئے مردوں کی بہ نسبت اسٹینو گرافر، بچوں کی اتالیق یا نرس بننا زیادہ آسان ہے بعض ملکوں میں ایک قوم کے افراد کے لئے دوسری قوم کے مقابلے میں بہت سے مواقع اور دروازے

کھلے ہوتے ہیں، ذات پات کی بندشوں میں گھرے ہوئے معاشرے میں بعض لوگوں کیلئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے لئے مخصوص پیشے کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرلیں اسی طرح بیشتر معاشروں میں غریب اور ان پڑھ والدین کے لئے اپنے بچے کو بی اے تک پڑھانا رئیس والدین کی بہ نسبت بہت مشکل ہوتا ہے۔

دنیا کے بیشتر حصوں میں پیدائشی حیثیت کی اہمیت اب پہلے کی نسبت کم ہوتی جارہی ہے عورتوں اور غریب خاندان کے بچوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ جنوبی افریقہ کے علاوہ قریباً ہر جگہ مختلف رنگ اور نسل کے افراد کے لئے یا تو مساوی مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں یا پہلے کی نسبت دشواریاں کم ہوگئی ہیں۔ چند ایک ملکوں میں مختلف مذاہب کے لوگ آزادانہ ایک دوسرے کے ساتھ مراسم اور روابط بڑھا رہے ہیں۔ شروع شروع میں کئی معاشروں میں سن و سال کی حیثیت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ والدین کو اولاد پر بے شمار اختیار حاصل تھے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو اپنے سے چھوٹی عمر والوں پر متعدد احکام جاری کرنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن اب نوجوانوں پر وہ پہلے کی سی پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں اور انہیں نسبتاً آزادی حاصل ہے۔ ہندوستان کے ذات پات کے نظام میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ لچک پیدا ہوگئی ہے۔

حیثیتی نظام میں اعلیٰ اور ادنےٰ لوگوں کی نفسیات

اب دیکھنا یہ ہے کہ جن معاشروں میں حیثیت کو بہت بڑا مقام حاصل ہوتا ہے۔ وہاں اسکا انسانی شخصیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پہلے اس سوسائٹی کو لیجئے جس میں پیدائشی حیثیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کا معاشرہ یا تو ذات پات کا قائل ہوگا جیسے ہندو کا روایاتی معاشرہ تھا یا پھر طبقاتی معاشرہ ہوگا جس میں چند زمیندار اور سردار عوام پر اپنا تسلط قائم رکھتے ہیں۔ اور اثر و اقتدار اپنی اولاد کو ورثہ میں دے جاتے ہیں۔ اگر اقتدار مضبوط ہو تو اس قسم کے معاشرے میں کسی قدر جمود ہوگا زندگی پشتہا پشت تک ایک ہی نہج پر بسر ہوتی رہے گی۔ بچے جس حیثیت کے حامل ہونگے وہ اسی پر تمام زندگی قائم رہنے کے متمنی ہوں گے۔ لڑکے کو باپ سے

آگے بڑھ جانے کے بھی بہت کم موقعے نصیب ہونگے۔ گمان غالب ہے کہ ایسے معاشرے میں بچہ باپ کو آئیڈیل سمجھتا ہے اور اسکی طرزِ زندگی پر قانع رہے۔ ایسے معاشرے میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک ایسے بچے کو جو کسی اعلیٰ حیثیت پر پیدا ہوا ہے لیکن کوئی خاص اہلیت و قابلیت نہیں رکھتا اسے اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے کوئی جدوجہد نہ کرنا پڑے۔ اسی طرح اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا حامل بچہ نیچی ذات میں پیدا ہونیکے سبب ہمیشہ اسی خیال میں رہے کہ اس کے ترقی کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ جب محرومی و ناکامی دور نہیں ہوسکتی تو کوشش کرنے کا فائدہ؟ پھر کیوں نہ زندگی کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے۔ ایسے معاشرے میں عموماً لوگ ایک ہی علاقے میں بستے ہیں۔ اور اپنے خاندانوں کا جزلاینفک بنے رہتے ہیں۔ باہمی طور پر وہ نفسیاتی بندھنوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ اس میں انکو آسانی رہتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں مثلاً انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کس قسم کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور ان کا کیا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ انہیں ایسی کوئی ذمے داری نہیں سونپی جاتی جسے وہ پورا نہ کرسکیں۔ اسلئے نہ انہیں ہر دم ناکامی کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور نہ کوئی اور فکر ستاتی ہے۔ اسی معاشرے میں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ تصور کرلیتے ہیں کہ وہ اعلیٰ مقام و مرتبہ ہی کے مستحق ہیں۔ چونکہ وہ قدرتی طور پر برتر پیدا ہوئے ہیں اسلئے اگر انہیں خاص مراعات حاصل ہیں تو یہ بالکل جائز اور درست ہے۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ چونکہ وہ حقیقتاً شریف زادے ہیں اس لئے انکو شریفوں کا سا وطیرہ اختیار کرنا چاہیئے[۲] رذیلوں یا عوام کے طور طریقے انہیں زیب نہیں دیتے۔ چین کے کلاسیکی ادب میں برتر انسان[۱] کا ذکر پایا جاتا ہے جو اپنے لئے زندگی کے نہایت اعلیٰ معیار قائم کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے تصورات رکھنے والے لوگ عوام کی فلاح و بہبود کو بھی عزیز رکھیں۔ غالباً بیگمس مسلم خواتین جنکا ذکر شائستہ سہروردی اپنی کتاب میں کرتی ہیں اسی رجحان کی مالک ہوتی ہونگی۔ انگریزوں کے طبقہ امرا میں تو یقیناً یہ تصور بہت عام تھا۔ اسکی وضاحت فرانسیسی کے اس فقرے سے ہوتی ہے کہ

[۱] THE CHUN TZU

[۲] Noblesse oblige.

شرافت اور اعلیٰ نسبی کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ شریف زادے خاندانی شرافت کی بدولت شریفانہ طریق پر رہتے تھے۔ اور دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔

ہمارے دیہات[1] کے چودھری کے متعلق ایک غیر ملکی مصنف کے تاثرات یہ ہیں کہ یوں تو چودھری کو "چودھراہٹ" ورثہ میں ملتی ہے لیکن وہ اگر اپنے فرائض خوبی سے سرانجام نہیں دیتا تو وہ محض برائے نام چودھری رہ جاتا ہے۔ اور یہ تمام ومرتبہ کسی اور کو حاصل ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے چودھری میں کئی صفات کا ہونا ضروری ہے مثلاً اسے فیاض ہونا چاہیے۔ اگر کبھی اپنی جائداد فروخت و تقسیم کرکے بھی اسے حاجت مندوں کی مدد کرنا ہو تو وہ دریغ نہیں کرتا۔ اسکی اپنی اولاد کے اگر حالات اچھے نہ بھی ہوں تو مضائقہ نہیں۔ لوگ ہمیشہ اسے اسکی سخاوت کے سبب یاد رکھتے ہیں اور اسکے بچوں کی عزت کرتے ہیں۔ چودھری اکیلا ہی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا بلکہ اسکے عزیز و اقارب اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اگر گاؤں میں کسی کی گائے کا دودھ سوکھ جائے تو چودھری یا اسکے رشتہ دار حاجتمند کو دودھ مہیا کرتے ہیں۔ دودھ تو ایک طرف، اسکے گھر سے لوگوں کو گندم، گھی، گڑ، روپیہ پیسہ بھی کچھ ملتا رہتا ہے۔ چودھری واقعی بڑی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ صرف زمین ہی اسکی قوت کا نشان نہیں ہوتی۔ اسکے جوان بیٹے یا دوسرے مرد رشتہ دار بھی اسکی طاقت کا مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ مصیبت کے وقت لوگ اسی کے گھر کا رخ کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کے اخراجات ہوں یا کفن دفن کی مشکلات۔ سب چودھری کی دوراندیشی و فیاضی سے دور ہو جاتی ہیں۔

اسکے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ بالکل ہی غیر ذمہ دار ہو جائیں۔ وہ یہ محسوس

---

1 Zekiye Egler: Panjabi village life
Pakistan - society and Culture: edited by Stanley Maron: Human Relations Area Files
New Haven 1957.

کرنے لگیں کہ ہم پر کسی کا کوئی حق نہیں۔ کوئی ہمارے افعال و حرکات پر تنقید نہیں کرسکتا ہم چونکہ برتر پیدا ہوئے ہیں اسلیئے ہمیں جو مراعات ملی ہوئی ہیں ان سے متعلق ذمہ داریاں پورا کرنیکی کوئی ضرورت نہیں کرا ایسے لوگوں کا انتہائی خودغرض اور ظالم ہوجانا عین ممکن ہے۔ انکو چونکہ اپنی حیثیت کے زائل ہونے جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا اسلیئے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کاہل اور سست ہوجائیں اور عیاشانہ زندگی میں مال و دولت لٹاتے رہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب حالات اس درجہ بگڑ جائیں تو ادنےٰ طبقے والے فوراً ہی اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے خلاف بغاوت کرکے ان کا خاتمہ کیوں نہیں کردیتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ آخر اس صبر و تحمل کی وجہ؟ اسکی کئی وجوہ ہیں مثلاً بغاوت میں مشکلات اور خطرات ہوتے ہیں نیز یہ اس طبقہ کی انکی تربیت اس طور پر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے متعلق کچھ سوچ سکیں اور کسی فیصلے پہنچنے کے بعد پیش قدم کرسکیں انکے لئے اپنی موجودہ حالت پر قائم رہنا آسان ہوتا ہے۔ تکالیف کے برداشت کرنے میں انکے اس نام نہاد مذہبی عقیدے کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اگر دنیا صبر و قناعت کی زندگی بسر کرلی تو مرنے کے بعد یقیناً اجر ملے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے نزدیک حکمران طبقے کے خلاف بغاوت کرنا مذہباً ممنوع و معیوب ہو ان وجوہات کے علاوہ دو اور اہم سبب بھی ان میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ اپنی پستی اور کمتری پر شاکر ہوں۔ انکا "تصورِ ذات" ہی پست ہو۔ انکی پست حیثیت نے انکی خوداعتمادی سلب کرلی ہو۔ اور انہیں اس بات کا یقین ہی نہ آتا ہو کہ وہ اس سے بہتر حالت کے بھی مستحق ہوسکتے ہیں۔ انکے اندر کسی حقیقی امید یا حقیقی عزتِ نفس کا تصور بھی باقی نہ رہا ہو۔ دوسرے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیچی ذات کا غریب آدمی اثباتِ عینیت کے ذریعے خود کو اپنے سے کسی اونچے آدمی کا مماثل سمجھ کر سکون حاصل کرلے۔ معاشرتی نفسیات میں اثباتِ عینیت ایک بہت اہم اصطلاح ہے اسکا ذکر آگے چل کر بھی آئے گا۔ اس سے ہماری مراد وہ ذہنی کیفیت ہے جس کے تحت کوئی شخص خود کو دوسرے کی شخصیت و حیثیت میں تصور کرنے لگتا ہے اور تخیل کے زور سے اس شخص کی

صفات کو اپنے اندر جلوہ گر محسوس کرتا ہے۔ ایک خادم اپنے آپ کو اپنا ظالم آقا تصور کرنے لگتا ہے یا ایک بیٹا اپنے آپکو اپنے والد کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اثبات عینیت کی عجائب کاری کی ایک جھلک قدیم زمانہ کے کسان میں صاف نمایاں نظر آتی ہے جو مہاراجہ کے ظلم کے باوجود نہ تو اس سے نفرت کرتا ہے اور نہ اسے اس پر رشک ہوتا ہے۔ وہ کسی حد تک خود کو راجہ کا مماثل سمجھتا ہے ایک طرف اسکے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ اسکا اپنا "مہاراجہ" ہے جس کے پاس اتنے نفیس گھوڑے زیور ہاتھی اور دیگر قیمتی اشیاء ہیں اور دوسری طرف اگرچہ اسکو یقین ہے کہ وہ خود مہاراجہ نہیں بن سکتا تاہم تھوڑی دیر کے لئے تخیل کی دنیا میں خود کو مہاراجہ تصور کر لیتا ہے۔ ممکن ہے ہمیں ذات پات کا نظام یا چھوت چھات جماعتی نظام اخلاقی طور پر غلط غیر جمہوری احمقانہ اور احکام خداوندی کے سراسر خلاف نظر آئے جسکی رو سے تمام انسان برابر ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان میں ذات پات کا معاشرہ سینکڑوں سال تک قائم رہا اور اسکو زبردست قوت حاصل رہی۔ اگر اس سے ہندوستانیوں کو خاطر خواہ آسودگی اور ترقی میسر نہ تھی تو وہ اتنے دنوں تک قائم کیونکر رہا۔ انہیں یقیناً سکون اور اطمینان قلب میسر تھا اور یہ سب اثبات عینیت کی کرشمہ سازی تھی۔

مسابقتی نظام میں اعلےٰ اور ادنیٰ لوگوں کی نفسیات

اب ذرا اس معاشرے پر غور کیجئے جس میں پیدائشی حیثیت کی بجائے مقابلہ کے ذریعے کسی بھی حیثیت کو حاصل کرنیکے اعلیٰ مواقع موجود ہوں۔ ایسے معاشرے میں پیدا ہونے والے بچے کی جنس۔ قوم یا خاندان کو دیکھکر کوئی یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ کہ وہ بچہ کس قسم کی زندگی اختیار کرے گا۔ اس بات کا یقین خود اسکی صلاحیتوں اور کوششوں سے ہوگا۔ اس معاشرے میں تمام پیشے عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہونگے۔ صرف عمر میں بڑا ہونے کے سبب کسی کو کسی دوسرے پر کوئی خاص اختیار حاصل نہ ہوگا۔ لائق اور اہل لوگ باآسانی ترقی کے اعلےٰ مدارج تک پہنچ سکیں گے۔

پنولین نے ایک بار کہا تھا ہر سپاہی کے بیگ میں سپہ سالاری کا سونٹا ہوتا ہے۔ یعنی لیاقت اور اہلیت کے طفیل ہر سپاہی سپہ سالاری کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ حصول تعلیم کے یکساں مواقع ہر شخص کو میسر ہونگے تاکہ جو اس سے استفادہ کرنا چاہے کر سکے۔ ملازمتوں کے حصول میں خاندانی سفارشات کو کوئی اہمیت نہیں ہوگی بلکہ حیثیت حاصل کرنے کی سعی میں ہر قدم پر مقابلہ ہوگا۔ خواہ کوئی کتنی ہی دولت کیوں نہ جمع کرلے یا کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ حاصل کرلے وہ کبھی تھک کر نہیں بیٹھے گا اسمبلی کے ممبروں کا دوسرے ممبروں سے مقابلہ جاری رہے گا مشہور اور نامی گرامی ڈاکٹروں کا ایک دوسرے کے ساتھ ضرور کہیں مقابلہ رہے گا اور ہر شخص بلند سے بلند رتبہ پر پہنچنے کی کوشش کریگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے میں غفلت کبھی نہ برتے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو خدشہ ہے کہ دوسرے اس پر سبقت لے جائیں گے۔

تقابلی سوسائٹی میں مقابلہ کی نوعیت بہت اہم ہوتی ہے۔ یہاں وہی لوگ بلند رتبہ پر پہنچیں گے جو لائق و فائق ہونگے لیکن لیاقت اور فوقیت کی دو مختلف صورتیں بھی ہوسکتی ہیں یعنی ضروری نہیں کہ مقابلہ صرف خوبیوں ہی میں ہو برائیوں میں بھی ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے اگر مقابلہ اچھائیوں میں ہوگا تو اچھے لوگ آگے نکل جائیں گے اور اگر مقابلہ برائیوں میں ہوا تو برے لوگ مثلاً اگر بہتر سے بہتر چیز کو کم سے کم قیمت پر بیچنے میں مقابلہ ہوا تو دیانت دار اور کم نفع کمانے والے تاجر فائدہ میں رہیں گے اس کے برعکس اگر دھوکہ دہی اور فریب کاری میں مقابلہ ہوا تو جو زیادہ لسان اور طرار ہوگا اور آسانی سے دھوکہ دینے کی قابلیت رکھتا ہوگا وہ بالادست ہوگا یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا بھی ہوگا ہوسکتا ہے کہ کارگذار فوجی افسر یا اچھے استاد کو معاشرہ میں اعلےٰ حیثیت حاصل ہو اسکے برخلاف یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا بول بالا ہو۔

ایسی سوسائٹی میں ہماری سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہوکر ابھر آتی ہیں۔ جذبۂ اقدام یعنی کسی کام میں پہل کرنے کے جذبے کو تحریک ہوتی ہے لیکن اسمیں ایک بڑی قباحت یہ ہے بعض لوگ ایسے کاموں کا بیڑا

Competitive Society

اٹھا لیتے ہیں جنکے وہ اہل نہیں ہوتے اور خواہ مخواہ مایوسی اور ناکامی مول لے لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ بچہ جو باپ سے بڑھ کر کوئی زینہ حاصل نہیں کر سکتا خاندان کے لئے باعثِ ننگ ہو کر رہ جاتا ہے اور کامیاب باپ کا نسبتاً ناکام بیٹا دل شکستہ اور پژمردہ رہنے لگتا ہے۔ المختصر مساوات نظام ہو یا نظام حیثیت دونوں اپنے اپنے طور پر نامرادی کا موجب ہو سکتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ مساواتی نظام میں ادنے احیثیت کے لوگوں کی کیا نفسیات ہوتی ہے تو اس کے متعلق اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ یقیناً ترقی کر کے سربلند ہو جائیں گے۔ لیکن کیا اس طرح باقی لوگوں میں بے اطمینانی نہیں بڑھے گی۔ کیا ان میں سے ہر شخص اعلےٰ حیثیت کی ذمہ داریاں اٹھانے کیلئے بنا نہیں ہوتا پست حالت میں مجہولانہ زندگی بسر کرنا جد و جہد اور مقابلہ کی زندگی سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اپنے سے بلند جو لوگ ہوتے ہیں انکے ساتھ اثبات عینیت بھی قائم ہو سکتا ہے۔ معمولی حیثیت کے لوگ جد و جہد کے ذریعے اپنے سے اعلیٰ حیثیت والوں کی ہمسری کی کوشش کرنے کے بجائے خود کو انکے مثل سمجھ بیٹھتے ہیں مثلاً ایک لڑکا جو بہت معمولی کرکٹ کھیلنا جانتا ہے وہ خود میں اور امتیاز یا کاردار میں اثبات عینیت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو لڑکی اسکول میں فیل ہوتی رہی ہو جسے خدشہ ہو کہ اسکی شادی بھی کسی ایسی ویسی ہی جگہ ہوگی۔ اسے اسی خیال میں لذت و سکون ملتا ہے کہ وہ تخیل ہی تخیل میں اپنے آپکو سینما کی کوئی محبوب ملکہ تصور کرتی رہے۔ خیالی پلاؤ پکانے والے اسی معاشرے میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اعلےٰ طبقے کو برباد کرنے کا تصور انکے اپنے خوابوں کے محل ڈھانے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے کانوں میں ابھی تک ایک زندہ دل امریکی کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں جو اس نے اشتراکیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہے تھے۔ کہ میں ایک ایسے معاشرہ کے قیام اور دوام کا قائل ہوں۔ جس میں ہر فرد لاکھوں ڈالر پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ میں خود اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا لیکن تمنا اور آرزو کی کھٹک میں لذت محسوس کرتا ہوں کہ کاش میں ایسا کر سکتا اس سے زندگی میں کتنا کیف اور خوشگواری پیدا ہو جاتی ہے۔

مقابلہ کے ذریعے ترقی کرنیوالے مرد یا عورت کی نفسیات کو خوب اچھی طرح سمجھنے کے لئے

اس غریب آدمی کی مثال سامنے رکھنا چاہیے جو اپنی کوششوں اور محنتوں سے مالدار بن گیا ہو۔ اس کا نفسیاتی ردِعمل دو صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ اسے اپنے ملازموں سے پوری ہمدردی ہو وہ یہ سوچے کہ میں بھی غریب رہ چکا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ ان پر کیا گذر رہی ہے۔ واقعی یہ بے چارے ہمدردی کے مستحق ہیں لیکن اسکے برعکس عین ممکن ہے کہ اس کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا سخت ہو۔ اور وہ کہے کہ یہ لوگ خود اپنی غریبی کے ذمہ دار ہیں۔ میں بھی تو غریب تھا۔ میں نے محنت اور کوشش کی اور مجھے کامیابی نصیب ہوگئی۔ یہ لوگ ناکارہ ہیں۔ کچھ کرنا نہیں چاہتے اس لئے مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں :-

آخر میں اس نظام کے متعلق ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس میں اپنے آپکو ختم کر دینے کے تمام نمدنے موجود ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مسابقتی جدوجہد میں ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں آزادانہ مقابلے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اعلےٰ حیثیتیں چند افراد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لوگوں میں ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب وہ اپنے سے پست حیثیت والوں پر مقابلے اور ترقی کا دروازہ بند کر دیتے ہیں مگر اپنے سے بلند رتبے کو مقابلے کے ذریعے جیت لینا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسی سوسائٹی کو لیجئے جس میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ اور جہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اقتدار حاصل کرنیکے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آہستہ آہستہ غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور بادشاہ بن جاتا ہے گویا وہ بلند ترین حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ امن و امان قائم کرتا ہے۔ اب مقام شاہی کے لئے آزادانہ مقابلہ ختم ہو گیا۔ اسکی خواہش اب یہ ہوتی ہے کہ اسکے بعد اسکا بیٹا بادشاہ بنے۔ اس طرح حیثیت شاہی وہ صرف اپنے خاندان تک محدود کر دینا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اکتسابی حیثیت کی جگہ پیدائشی حیثیت مسلط ہو جائے اسی طرح جو شخص دولت جمع کر لیتا ہے وہ کسی نہ کسی قسم کی اجارہ داری چاہتا ہے۔ وہ ایسی حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے جہاں اسکو اور اسکی اولاد کو آئندہ مقابلہ نہ کرنا پڑے۔ مزدوروں کی انجمنیں جو متعدد صنعتوں کو چلاتی ہیں بعض

اوقات وہ نئے ممبروں کا داخلہ اس قدر مشکل بنا دیتی ہیں کہ ممبروں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اور شخص کام کرنے میں انکے مدِ مقابل نہ آجائے اسی طرح سیاسی لیڈر اپنی جماعت کے ممبروں کو مراعات دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو عوام کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اکثر اوقات انکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تعلیم کو محدود کر دیا جائے۔ اصل میں ہم میں سے زیادہ تر لوگ ایسی حیثیت حاصل کر لینا چاہتے ہیں جس سے آئندہ کے مقابلے سے محفوظ رہ سکیں۔ ان معاشروں میں لوگ اپنے سے اعلےٰ حیثیت کے لوگوں سے تو مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے سے ادنیٰ حیثیت کے لوگوں پر مقابلے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ دراصل صحیح قسم کا مقابلہ نہیں ہوتا۔ صحیح مقابلہ آپ کو کھیل کے میدان میں نظر آتا ہے جہاں کھلاڑی کو ذاتی "میری" یا چمپین شپ کو برقرار رکھنے کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔ اسکوائش میں ہاشم خاں کی شاندار فتح اس وقت تک ہی برقرار رہے گی جب تک کہ وہ دوسروں کو برابر ہراتے رہیں گے:۔

اب تک ہم نے دو طرح کے معاشروں سے بحث کی ہے ذات پات کا معاشرہ اور مسابقتی معاشرہ دونوں میں کچھ خرابیاں اور خوبیاں ہیں لیکن کوئی معاشرہ نہ تو خالص ذات پات کا ہوتا ہے اور نہ خالص مسابقتی یعنی کسی معاشرے کی بنیاد نہ تو پورے طور پر پیدائشی حیثیت پر ہوتی ہے اور نہ کاملاً اکتسابی حیثیت پر بلکہ زیادہ تر معاشرے دونوں طرح کے عناصر سے مل کر بنتے ہیں۔ ذات پات کے نظام میں ایک ہی ذات کے مختلف افراد میں مقابلہ نظر آتا ہے۔ اور معاشرہ میں اعلےٰ حیثیت حاصل کرنے کے لئے مختلف ذاتوں کے درمیان اکثر سابقہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح مسابقتی معاشرے میں مقابلہ نہ تو پوری طرح منصفانہ ہے اور نہ مساوی و یکساں علاوہ بریں ہر معاشرہ کو ذات پات یا باہمی مقابلے کی برتری کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے کہ جہاں ذات پات کا زیادہ دخل ہوگا وہاں مقابلہ کم ہوگا یا جہاں زیادہ مقابلہ ہوگا وہاں ذات پات کی کوئی اہمیت نہ ہوگی:۔

تیسرا معاشرتی رجحان

ایک تیسرا معاشرتی رجحان بھی ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس کی رو سے ہر فرد بشر کو معاشرے میں اہم اور معزز حیثیت حاصل ہونی چاہیے

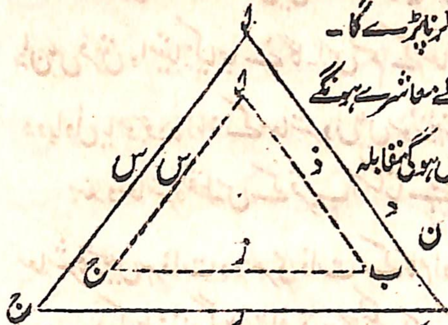
اگرچہ اس قسم کا معاشرہ اپنی اصلی حالت میں کہیں بھی موجود نہیں تاہم تخیل کی آنکھوں سے ہم ایک ایسے مثالی معاشرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسکا کچھ دھندلا سا خاکہ یہ ہوگا کہ اسمیں ہر شخص کو ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی مفت اسکول فراہم کئے جائیں گے اعلیٰ طبی امداد سے کوئی محروم نہ ہوگا۔ عوام کو اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے کا نہ صرف حق ہوگا بلکہ اس کے لئے سہولتیں بھی میسر ہونگی۔ پولیس کی حفاظت بلا امتیاز رنگ و نسل سب کیلئے عام ہوگی۔ قانون کی نظر میں کوئی بڑا چھوٹا نہ ہوگا بلکہ سب برابر ہونگے۔ ہر شخص کو روزی کمانے کا حق اور مواقع ہوں گے۔ اگرچہ ضرورتوں اور خواہشوں میں بڑا فرق ہوتا ہے تاہم ہر شخص کو ہر نوع کے مناسب مواقع مہیا کئے جائیں گے پیشہ کی وجہ سے کسی کی عزت یا ذلت نہ ہوگی تمام پیشے یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ یہ سب باتیں گویا ایسے حقوق تصور کئے جائیں گے۔ جو بحیثیت انسان ہر فرد بشر کو حاصل ہونگے۔

اس حیثیت و مرتبہ کے ساتھ ساتھ چند ذمہ داریاں بھی عائد ہونگی مثلاً ہر شخص کا فرض ہوگا کہ وہ مناسب ٹیکس ادا کرے۔ قانون کا احترام کرے۔ جرائم کو دبانے اور ختم کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ کسی نہ کسی قسم کی فوجی یا سول خدمت سرانجام دے اور فرصت کے وقت رضاکارانہ طور پر سماجی بھلائی کے کاموں میں حصہ لے۔ کوئی سوسائٹی ابھی اس اعلےٰ مقام پر نہیں پہنچ سکی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض معاشروں کے مقابلے میں بعض اس سمت میں آگے نکل گئے ہیں۔ اس قسم کے معاشرے کی بنیاد پختہ مذہبی عقائد پر استوار ہوسکتی ہے یا یہ اس وقت قیام میں لایا جاسکتا ہے جب ہر فرد کی بحیثیت فرد کے عزت ہوتی ہے اور ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ اسے اپنے ہر فعل کا خدا کے حضور جواب دینا ہوگا اور اسکا ہر قدم اپنے بھائی بندوں کی بہتری کے لئے دیانتداری سے اٹھے گا۔ ایسا معاشرہ اس نظریہ پر ہرگز قائم نہیں ہوسکتا کہ صرف چند اصحاب دولت و ثروت کو ہی یہ حق ہے کہ وہ عوام کیلئے مناسب اور غیر مناسب کا فیصلہ کیا کریں۔ ہر شخص کو اپنے عقائد کے تحفظ کا حق ہونا چاہیے۔ دوسروں کی زندگی پر اسے قطعاً کوئی کڑا اختیار نہ ہونا چاہیے پس اسطرح کل تین قسم کے رجحانات ہوئے۔ ہر معاشرہ انہی تینوں رجحانات کے امتزاج سے بنتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ کسی معاشرہ میں پلہ ایک طرف زیادہ جھک جاتا ہے اور کسی میں دوسری طرف

مختلف معاشروں کی ترکیب و ہئیت

مختلف معاشروں کی ترکیب و ہئیت

کے فرق کو سمجھنے کیلئے ذیل میں ایک مثلث دیا جاتا ہے۔ ہر سوسائٹی کو مثلث میں کہیں کوئی نہ کوئی جگہ دی
جا سکتی ہے البتہ کوئی سوسائٹی کناروں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلث کے تینوں راسی نقطے مذکورہ بالا
تینوں رجحانات کی انتہائی شکلوں کو ظاہر کرتے ہیں اسلئے ہر معاشرہ کا مقام اسی مثلث کے اندر خصوصاً
اصلی نقطوں سے دو نقطہ دار مثلث میں کسی جگہ تلاش کرنا پڑے گا۔



مثلاً ا کے قریب طبقاتی اور ذات پات کے معاشرے ہونگے
اسمیں پیدائشی حیثیت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگی مقابلہ
قریباً مفقود ہوگا اور بنی نوع انسان کی حیثیت سے انسان
کے احترام پر بہت کم زور دیا جائے گا۔

ب کے قریب وہ معاشرے ہونگے جن میں اپنی برتری جاری رکھنے کے لئے مقابلہ مسلسل جاری رہے گا۔ جیسے
امریکہ کے ایک ریڈ انڈین قبیلہ میں صرف وہی سرداری کا حقدار رہتا ہے جو دولت جمع کرنے کی جد و جہد
جاری رکھتا ہے اور پھر اسے لٹا کر وقار قائم رکھتا ہے[1]۔

ج کے قریب وہ معاشرے ہونگے جن میں انفرادی جوہر اور قابلیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسمیں
کوئی ایسا معاشرہ فرض کیا جا سکتا ہے جس میں ہر کسان کو اپنی زمین کی کاشت کے لئے پورے پورے
اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

انکے علاوہ تین اس قسم کے معاشرے نگاہ میں رکھیے جنمیں ان تینوں رجحانات میں سے کسی دو کی آمیزش
تو ہوتی ہے مگر تیسرے رجحان سے اجتناب ہی کیا جاتا ہے

د کے قریب وہ معاشرے ہونگے جو حیثیت کے حصول کے لئے جد و جہد پر زور دیتے ہیں اور
جن میں کامیاب ہونے والے احترام اور اقتدار کے اہل تصور کئے جاتے ہیں اور ناکام ہونے والے
حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ کسی فرد بشر کا بہ حیثیت انسان یکساں احترام نہیں ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں
میں امارت و سیادت کی مستقل کشمکش رہے گی وہ معمولی معمولی کاشتکاروں کو ہمیشہ تنگ و دق کریں گے

1 American Kwakiutal Indians:
Benedict: Patterns of culture

دوسرے لفظوں میں وہ ایسی سوسائٹی کو جنم دیں گے جس میں اوپر کا طبقہ طاقت حاصل کرنے کے بعد مزید مقابلے کی سب راہیں مسدود کر دے گا:۔

(ج) کے قریب معاشروں میں فرد کا بہ حیثیت انسان بہت زیادہ احترام ہوگا اور اعلیٰ حیثیت کے لئے مقابلہ بھی خاصہ ہوگا۔ ان میں رنگ۔ خون۔ نسل اور جنس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی اور ان میں فرق و امتیاز کیا جائے گا۔ اس قسم کے معاشرے کا صحیح تصور قائم کرنے کیلئے ہم اسلام کے دور اول یا موجودہ زمانہ کے معاشروں میں سوئٹزرلینڈ یا ڈنمارک کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔

ہندو معاشرہ نقطہ س کے قریب آسکتا ہے جب کہ وہ اپنی اصلی اور بہترین حالت میں ہو یعنی ایسا معاشرہ جسمیں ہر ذات دوسری ذات کے کام اور مقام کا احترام کرتی ہو اس معاشرے میں عورتوں اور مردوں کی طرز زندگی میں بڑا فرق ہوگا لیکن ایک کو دوسرے سے افضل نہیں گردانا جائے گا زندگی پرسکون مگر جامد ہوگی مقابلہ تقریباً مفقود ہوگا۔

پاکستانی سوسائٹی اس مثلث میں پاکستانی سوسائٹی کو کہاں جگہ ملے گی اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پاکستان میں بلا امتیاز مذہب و ملت جنس خطہ اور قوم انسان کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانیوں کے دل میں ایک دوسرے کیلئے خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات عام ہیں مثلاً مصیبت کے وقت سیلابوں میں امداد کرتے وقت کوئی کسی کا مذہب قومیت جنس یا حیثیت نہیں دریافت کرتا۔ وقت پڑنے پر مشرقی اور مغربی پاکستان دل کھول کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ غریب و امیر ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرے گا اور اگر ضرورت پڑے تو کسی بھی شخص کو فوجی ملازمت کیلئے بلایا جا سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں بعض حیثیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہت سی حیثیتیں پیدائش سے حاصل ہوتی ہیں جیسے سید قریشی اور بلک کی حیثیتوں میں واضح اور بیّن فرق نظر آئے گا بعض حیثیتیں کسی بڑے زمیندار خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ملتی ہیں ان زمینداروں کے اسلاف کو چند صدیوں پہلے بڑی بڑی جاگیریں حاصل ہو گئی تھیں جنہیں وہ اپنی اولاد میں

وابستہ منتقل کرتے جا رہے ہیں۔ کسی غریب کسان کے بیٹے کو جس کے اندر اعلیٰ حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیت اور اہلیت موجود ہے ایسے کیونکر اور کتنے موقعے ملتے ہیں کہ وہ اپنی حسبِ منشا ترقی کر سکے۔ پیدائشی حیثیت کس حد تک کسی کو مدبر یا سیاست دان بننے میں مدد دیتی ہے اور اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے بیرونی ممالک میں جانے کی سہولتیں مہیا کرتی ہے جب تک ان سب یا اسی قسم کے دیگر سوالات اور انکے جوابات کا بغور مطالعہ نہ کیا جائے اوپر کی مثلث میں پاکستانی سوسائٹی کا مقام اور حیثیت متعین نہیں کئے جا سکتے۔

کسی معاشرے میں حیثیت کی اہمیت کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ جب اس کا کوئی شہری سرکاری دفتر میں ملازمت کے لئے یا پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے تو اس سے کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک پاکستانی نے اپنے تاثرات یوں بیان کئے ہیں "جب ہم کسی افسر سے ملنے جاتے ہیں تو وہ ہمارا نام جاننے اور صورت دیکھنے کے علاوہ ہمارے متعلق کچھ اور بھی جاننا چاہتا ہے۔ وہ ہمارے خاندانی تعلقات۔ ہماری تعلیمی لیاقت، ہمارا مقام و مرتبہ اور ہمارے دوست احباب کو بھی جاننا چاہتا ہے۔ ان چیزوں کے ذریعے وہ ہماری حیثیت معلوم کرنا چاہتا ہے جب تک اسے ان چیزوں کا علم نہ ہو جائے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے آیا صرف یہ کہہ کر ٹال دے کہ میں اس وقت بہت مشغول ہوں پھر کسی وقت تشریف لائیے گا۔ یا یہ کہ میں آپ کے معاملے میں فلاں صاحب سے ملوں گا۔ آپ چند دنوں بعد مجھ سے ملئے گا۔ یا یہ کہ ٹھہریئے میں ابھی آپ کا کام کئے دیتا ہوں وغیرہ"۔ ایک اور پاکستانی دو مختلف منصبوں پر اپنی جداگانہ حیثیتوں کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "میں نے تبدیلی منصب کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت میں بڑا نمایاں فرق محسوس کیا۔ جب میں حکومت میں درجہ اول کا افسر تھا تو مجھے کسی کام کے سلسلے میں ایک مقامی بنک جانا پڑا۔ بنک کا منیجر مجھ سے بڑی اچھی طرح پیش آیا اس نے مجھے بٹھایا سگریٹ پیش کیا اور جب میرا کام ختم ہو گیا تو اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ چار ماہ کے بعد میں ریٹائر ہو گیا۔ ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہو گیا مجھے پھر کسی کام سے بنک جانا پڑا۔ بنک کا منیجر وہی شخص تھا لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ اب میں گورنمنٹ کا ملازم نہیں رہا تو میں نے محسوس کیا اسکا رویہ بدل گیا۔ اس بار

اس نے بے رخی اور بے اعتنائی برتی۔ نہ اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور نہ ہاتھ ملایا۔ ایک نوجوان پاکستانی اسی قسم کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں "میں ایک کالج میں لکچرار تھا مجھے اپنے کسی فارم کی تصدیق کرانے کے لئے ایک افسر کے پاس جانا پڑا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں سی ایس ایس کے امتحان میں شریک ہو رہا ہوں اس سلسلے میں مجھے اسناد کی تصدیق شدہ نقول کی ضرورت ہے۔ مہربانی فرما کر اصل اسناد سے مقابلہ کر کے نقلوں کی تصدیق کر دیجئے گا"۔ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا "میرے پاس وقت نہیں ہے" جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے دفتر سے مجھے نکل جانے کو کہا۔ میں امتحان میں اچھے نمبروں پر کامیاب ہو گیا اور مجھے بہت اچھا عہدہ پیش کیا گیا مجھے اپنی پچھلی ملازمت سے سبکدوشی کے سلسلے میں پھر انہیں حضرت کے پاس جانا پڑا۔ میں نے ان سے اپنی موجودہ تقرری کے متعلق بتایا اور درخواست کی کہ مجھے جلد از جلد سبکدوش کر دیا جائے۔ اس بار انہوں نے میری بڑی مدد کی اور مقررہ مدت سے پہلے ہی مجھے سبکدوش کرا دیا۔ اسکے علاوہ میں نے کئی دوسرے موقعوں پر بھی یہ محسوس کیا کہ جیسے میری حیثیت ایک دم بلند ہو گئی ہے۔ میں خود کو بڑا محسوس کرنے لگا۔ لوگوں نے مجھے ایسا ہی محسوس کرایا تھا میرے دوستوں نے یہاں تک کہا کہ کہ "اب شادی کے بازار" میں تمہاری قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ غالباً ان کا خیال صحیح ہے، اگر یہ امتیازی اور مخصوص مثالیں ہیں تو اسکے یہ معنی ہوئے کہ پاکستان میں طبقاتی معاشرے کی قطعی اور واضح علامات موجود ہیں ہو سکتا ہے کہ ان حالات میں بھی مقابلہ سخت ہو لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ بعض لوگوں کو بعض پر برتری اور فوقیت حاصل ہے جسکی بدولت قانونی سلوک اور برتاؤ کے معاملے میں وہ باسانی حکام بالا کی حمایت اور طرفداری حاصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے امتیازی سلوک کی مثالیں انسانی سوسائٹی میں عام ہیں اور طبقاتی امتیازات کو ظاہر کرتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی کوشش سے کس رتبے تک پہنچ سکتا ہے اور اپنی پیدائشی حیثیت کی بدولت وہ کس حد تک دوسروں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح پولیس کا رویہ معلوم کرنا چاہیئے مثلاً کیا ٹریفک کے اصول توڑنے پر وہ غریب اور امیر دونوں کیساتھ یکساں سلوک روا رکھتے ہیں۔ امیر کو بھی اسی طرح بلا جھجک گرفتار کرتے ہیں جس طرح ایک غریب کو؟ امیر کے مقابلے میں غریب کے ساتھ زیادہ سختی تو نہیں کیجاتی؟:۔

پاکستان میں چند حیثیتوں کی اہمیت

اب ذرا یہ دیکھئے کہ موجودہ پاکستانی معاشرے

میں چند حیثیتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے جیسے صنفی یا جنسی حیثیت کو یہاں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے مردوں اور عورتوں خصوصاً پردہ دار عورتوں کی مراعات اور ذمہ داریوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ تاہم عورتوں کے لئے تعلیم کی سہولتیں بڑھ رہی ہیں۔ انکے لئے ڈاکٹر یا معلمہ بننا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ اب وہ سرکاری یا غیر سرکاری دفاتر میں ملازمت بھی کر سکتی ہیں حتیٰ کہ کھلے مقابلہ میں انتخاب کے ذریعے ایم۔ این۔ اے بھی بن سکتی ہیں۔

عمری حیثیت کو پاکستان میں جو اہمیت حاصل ہے وہ بہت واضح ہے۔ والدین کی حیثیت بڑے اختیارات کی حامل ہوتی ہے چھوٹے ہمیشہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بزرگوں سے "جی" کہہ کر خطاب کرنا چاہیے۔ انکی رائے کے مقابلے میں اپنی رائے پر زور نہیں دینا چاہیے خواہ وہ رائے صائب ہی کیوں نہ ہو۔

مذہبی حیثیت کی اہمیت سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ اسلام دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں حیثیتی اختلافات سے بالکل پاک اور صاف ہے۔ خاندانی اور نسلی امتیاز یہاں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اگر کسی شخص کو مولوی یا عالم دین کی حیثیت سے عزت اور احترام حاصل ہے تو صرف اس وجہ سے کہ وہ قرآن و سنت پر عبور رکھتا ہے۔ اسلام پاپائیت، برہمنیت اور پیشوائیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسمیں کوئی پیدائشی برہمن نہیں ہر مسلمان اپنا امام آپ ہے۔ اجماع میں ہر مسلمان کو حصہ لینے کا حق حاصل ہے یہ ان مذاہب سے بالکل مختلف ہے جنمیں مذہبی پیشواؤں کو بڑا اختیار و اقتدار حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ چاہیں تو کسی پر جنت کے دروازے بھی بند کر دیں اور اگر خوش ہو جائیں تو جنت کا پروانہ بخش دیں۔ اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں تو سزا و جزا کی خوشخبری دی جاتی ہے۔

پاکستان میں تعلیمی حیثیت پر بھی بڑا زور دیا جاتا ہے مغربی ملکوں میں اگر کوئی شخص اپنے نام کے آگے اپنی ڈگریاں لکھے تو بڑا عجیب سا معلوم ہو گا لیکن پاکستان میں اس سے یقیناً حیثیت بلند ہو جاتی ہے اور لوگ فخر کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ ایم اے، ایل ایل بی یا ایچ پی ڈی وغیرہ لکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں پاکستان میں بیشتر آسامیوں کیلئے خاص قسم کی علمی لیاقت کا معیار درکار ہوتا ہے۔ دفتر میں ترقی اسی کو ملتی ہے جس نے کسی خاص درجے کا امتحان پاس کیا ہو۔ ہو سکتا ہے

کہ امیروں کے لڑکوں کو اس سلسلے میں خاص مراعات اور آسانیاں حاصل ہوں لیکن انہیں بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ امتحانات پاس کرنا ہوتے ہیں۔ تعلیمی حیثیت ایک اکتسابی حیثیت ہے جب یہ حاصل کر لی جاتی ہے تو حاصل کرنے والے خاص خاص مراعات اور آسانیوں کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔

ہم پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے یہاں چھوٹے بڑوں کو آپ، جی، جناب وغیرہ سے خطاب کرتے ہیں لیکن بڑے اسکے جواب میں ایسا نہیں کرتے۔ وہ عموماً تم کہہ کر خطاب کرتے ہیں چنانچہ حیثیت کے اختلاف کو معلوم کرنیکا ایک طریقہ یہ ہے کہ دیکھیں زید بکر کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہے جیسا بکر زید کے ساتھ کرتا ہے یا نہیں۔ آیا ان میں کوئی ایسا تو نہیں کہ جب تک کوئی دوسرا اسے سلام نہ کرے وہ سلام نہیں کرتا بعینہ جیسے فوجی افسر اپنے سپاہی کو پہلے سلام نہیں کرتا۔ اگر سڑک پر دو آدمیوں کی ٹکر ہو جائے تو کیا ان میں سے کوئی ایک خندہ پیشانی سے اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرا لیتا ہے کہ نہیں

پنجاب کے دیہاتی کے متعلق وہ غیر ملکی مصنف جس کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں یہ کہتا ہے کہ ایہر دیہاتی کی چند خاص خواہشات ہوتی ہیں جن کو پورا کرنیکے لئے وہ ساری زندگی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسکی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے عزت حاصل ہے ہمگاؤں گا گویا جب بھی کسی سے ملتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ خدا آپکو عزت دے۔ آپکی فصلیں اچھی ہوں اور زمین سونا اگلے۔ دیہات میں عزت کے مقابلے میں روپے کی کوئی اہمیت نہیں۔ عام طور پر روپے کو ذاتی جاہ وحشمت کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا اور اولاد کے نیک کام ماں باپ کی عزت میں اضافہ کے موجب ہوتے ہیں اور انکی بداخلاقی سے خاندان بھر کی ناک کٹ جاتی ہے۔ بلکہ اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یا تو دولت حاصل کر لو یا عزت و نیک اولاد۔ عزت و مرتبہ حاصل کرنیکی خواہش اکثر نہایت نفیس قسم کے معاشرتی طرزِ عمل کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

کسی سوسائٹی میں رہتے ہوئے اسکی ہیئت کا تجزیہ بہت مشکل ہو جاتا ہے تاوقتیکہ اسکا مقابلہ کسی دوسرے معاشرے سے نہ کیا جائے مثلاً اہل امریکہ کا خیال ہے کہ انکی طرزِ زندگی عین جمہوری ہے۔ انکی معاشرتی تنظیم میں جو غیر جمہوری عناصر ہیں ان پر کبھی انکی نظر نہیں پڑتی۔ اسلئے تجزیہ کرنے نفت

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہمارا کام ہے کسی امر کی تعریف و تضحیک کرنا یا تردید کرنا نہیں ہے بلکہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا ہے یقیناً پاکستانی سوسائٹی میں گوناگوں تبدیلی کے ساتھ ترقی بھی ہو رہی ہے لیکن معاشرہ کا رخ مثلث کی کسی سمت ہو رہا ہے ۔ یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جسکا تجزیہ معاشرتی نفسیات کے ماہر کے لئے اگر زیادہ مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔

حیثیت حاصل کرنیکے طریقے ہم بتا چکے ہیں کہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی قسم کا مقابلہ ضرور ہوتا ہے اب یہاں ذرا تفصیل سے یہ دیکھنا ہے کہ پیدائش کے بعد حیثیت کیسے حاصل کیجاتی ہے اسکے مندرجہ ذیل تین طریقے ہیں :۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ کوئی حیثیت براہ راست لیاقت ۔ قوت کوشش اور جدوجہد سے حاصل کیجا سکتی ہے ۔ جیسے جانور ، سپاہی اور کھلاڑی جسمانی طاقت سے کام لیکر کوئی اعلےٰ حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح تاجروں میں حصول زر طلبہ میں امتحان میں امتیاز حاصل کرنے یا غنڈوں میں غنڈہ گردی میں مقابلہ ہو سکتا ہے فاتح اپنے مدمقابل کو شکست دیکر ہی فاتح بنتا ہے حیثیت کوششوں کا ثمرہ ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۱ پر جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ اسمیں ایک اور مغربی مصنف کا مضمون بعنوان پشاور کی وادی[1] کے پٹھان ہے جسمیں اس نے لکھا ہے کہ پٹھانوں کے ہاں "مہمان نوازی"[2] عزت حاصل کرنے کی ایک اہم کوشش ہے ۔ مہمان کی بڑھ چڑھ کر خاطر تواضع کیجاتی ہے ۔ رخصت ہونے وقت مہمان بھی مذاقاً اکثر یہ کہہ جاتا ہے کہ آپ ہمارے ہاں آئیں گے تو میں اس سے بھی زیادہ آپکی "عزت" کروں گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تقدم ملازمت[1] کے قواعد و ضوابط کے مطابق حیثیت حاصل کی جائے۔ سرکاری ملازموں فوجی افسروں اور استادوں کی ترقی تقدم کے اصول کے مطابق آپ ہی آپ ہوتی جاتی ہے ۔ جو کلرک دفتر میں سب سے سینیئر ہوتا ہو اسے ترقی دیکر ہیڈ کلرک بنا دیا جاتا ہے خاص مراعات ان لوگوں کو ملتی ہیں جو پرانے ہوتے ہیں اسی طرح مدت ملازمت کے مطابق تنخواہوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

1 Vreeland: Pathans of the Peshawar Valley

ت ۱

2 Seniority [illegible]

اس قسم کے مقابلے کو ہم انفعالی مقابلہ* کہتے ہیں جسمیں اعلےٰ حیثیت کسی جارحانہ اقدام اور خطرہ میں پڑے بغیر صرف صبر و انتظار سے حاصل ہو جاتی ہے۔ بادی النظر میں اس قسم کے مقابلے سے جد و جہد کا ولولہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ لوگ کچھ اسطرح سوچنے لگتے ہیں کہ جان کھپانے سے کیا فائدہ۔ اعلیٰ حیثیت صبر و استقلال کے ساتھ بیٹھے رہنے سے خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

تیسرے طریقہ میں کسی کو اعلےٰ حیثیت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ افسران بالا کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہی ترقی دے کر اعلیٰ عہدے پر پہنچا سکتے ہیں یا الیکشن کے ذریعے کوئی اعلےٰ حیثیت حاصل کیجا سکتی ہے مثلاً یہ فیصلہ کارخانہ دار کرتا ہے کہ ملازمین میں سے کسے ترقی دے پرنسپل اساتذہ میں سے بعض استادوں کو اونچے عہدے۔ اچھی تنخواہ کے لئے منتخب کرنیکا مجاز ہوتا ہے وزیر اعلےٰ کابینہ کے اہم عہدے ان لوگوں کو پیش کرتا ہے جنکے متعلق اسکو خیال ہوتا ہے کہ وہ کارگذار اور اہل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حیثیت محنت دیانت اور جانفشانی سے کام کر کے حاصل کی جا سکتی ہے یا صرف افسروں کی خوشامد یا ظاہری ٹیپ ٹاپ سے بہتر طور پر حاصل ہو سکتی ہے درا صل اسکا انحصار افسرانِ بالا کی ذہنیت اور شخصیت پر ہوتا ہے جو ترقی دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر ملازمین یہ محسوس کرتے ہیں کہ انکی خدمات کو سراہا جائیگا۔ انکی کارگذاری اور جانفشانی سے اعلیٰ افسر متاثر ہونگے اور انکی اور انکے کام کی قدر کریں گے تو وہ بہتر سے بہتر کام کرنیکی کوشش کریں گے لیکن انکو اگر یہ احساس ہو جائے کہ افسر اعلےٰ کے یہاں خوشامد و سفارش سے زیادہ کام چلتا ہے۔ لیاقت اور اہلیت کی کوئی قدر نہیں تو یہ لوگ اپنا زیادہ تر وقت اثر و رسوخ پیدا کرنے میں صرف کریں گے اگر اسمیں انکو ناکامی ہو جائے تو ہو سکتا ہے انکی ساری ہمتیں ٹوٹ جائیں اور انکا جوش سرد پڑ جائے اور اگر انکو کسی مرحلے پر یہ احساس ہو جائے کہ ان کا افسر ذاتی تعصبات کے مطابق کام کرتا ہے تو انکی تمام تر کوشش تملق میں صرف ہو گی۔ اسی طرح اگر کسی امیدوار کو یہ گمان ہو جائے کہ "چائے کی دعوت" دیکر کام نکالا جا سکتا ہے تو وہ ٹھیک طور سے کام

* PASSIVE COMPETITION

کرنیکی کوشش ہی نہ کرے گا:-

طریقہ انتخاب کا کارکردگی پر اثر

اب رہا یہ سوال کہ کسی ادارہ کے طریقہ انتخاب کا اسکی کارکردگی پر کیا اثر پڑتا ہے تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں قوت اور مہارت سے براہِ راست کچھ حاصل ہو سکتا ہے وہاں یقیناً مقابلہ سخت ہو گا جیسے تفریحی مشاغل میں حصہ لینے والوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن ترقی اگر محض مدت ملازمت کے لحاظ سے دی جائے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہاں حیثیت کے اختلاف و اقتدار کے احترام کا شدید احساس ہو لیکن سرگرم رقابت یا بدخواہی نہیں ہو گی ہو سکتا ہے کہ ایسے معاشرے میں نوجوان نئے خیالات اور توانائی کے مالک ہوں لیکن چونکہ انکو برابر اس بات کا احساس رہے گا کہ وہ دوسروں کے تابع فرمان ہیں اور مدتوں انکے کہنے پر چلنا ہو گا اسلئے ممکن ہے اس طویل انتظار کے خیال سے وہ اس رٹ پر پڑ جائیں جس پر کہ باقی چل رہے ہوں۔ ان میں کسی نئی چیز کے لئے خواہش ہی نہ رہے یا وہ اسکے ساتھ موافقت پیدا نہ کر سکیں۔ اسکے برعکس اگر انہیں واقعی اپنے کام سے دلچسپی ہے اور وہ افسران بالا کی عزت کرتے ہیں تو وہ ہر قسم کی تشویش اور زیردستی سے بالاتر ہو کر اپنا کام سرانجام دیتے رہیں گے۔ ایسے لوگ مرور زمانہ کے ساتھ یقیناً ترقی کرتے ہیں۔ جہاں ترقیوں کا فیصلہ اعلےٰ افسروں کے ہاتھ میں ہو وہاں رقابت اور سازش کا امکان بھی زیادہ ہو گا کیونکہ ایک ساتھ کام کرنے والوں کو یہ اچھی طرح احساس ہوتا ہے کہ مقابلہ صرف اعلیٰ افسر کے لطف و عنایت کے حصول کے لئے ہے۔ اس لئے وہ دوسرے کی کامیابی اور ترقی پر خوش اور مطمئن نہیں ہونگے لیکن اگر ان کو اس بات کا یقین ہو کہ ترقی از روئے انصاف و لیاقت ہو گی تو ہر شخص کو بہتر سے بہتر کام کرنیکی رغبت ہو گی۔

متعلقہ افسر کی نفسیات

اب ذرا اس امر کا تجزیہ کریں کہ ترقی دینے والے افسر کی نفسیات کس طور پر کام کر سکتی ہے۔ اسکی ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف لائق اور قابل آدمیوں ہی کو آگے بڑھائے اور نااہلوں کو نظرانداز کر دے

کیونکہ اگر نا اہل ترقی کر گئے تو خود اسکی حیثیت کمزور ہو جائے گی۔ جو دکاندار کسی خوشامدی اور کاہل کلرک کو ملازم رکھے وہ خود خسارے میں رہے گا۔ جو پرنسپل کسی نالائق استاد کو ترقی دیگا اس سے اسکے کالج اور خود اسکے وقار کو دھکا پہنچے گا۔

دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ افسر اعلے خود ہی نا اہل ہو، اسے ادارہ کی ترقی کے امکانات کا کوئی احساس و ادراک نہو۔ اسکے لئے صرف یہی خیال باعث تسکین و تسلی ہو کہ یہ میرا ادارہ ہے میری مرضی کے مطابق چل رہا ہے۔ اگر کوئی زیادہ ذہین معاملہ فہم اور نئے ارادوں اور امنگوں والا نوجوان ترقی کر گیا تو اسکو اپنی عزت کے جاتے رہنے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ ایسی نوجوان کو ادارہ کی روح رواں سمجھیں گے لہذا وہ اس قسم کے نوجوان کو کبھی بڑھنے نہیں دیگا۔ اسے اپنی بھلائی اسی میں نظر آتی ہے کہ نا اہل لوگ ہی آگے بڑھتے رہیں تاکہ اسکی افسری قائم رہ سکے۔ اس بات سے اگرچہ ادارہ کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے مگر حسد اور خود پرستی کے جذبے کے تحت وہ ادارے کے نقصان کی پرواہ نہ کریگا۔ اسکی توجہ مستقبل کی بجائے حال پر زیادہ رہتی ہے۔

ممکن ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ مدت ملازمت کے سبب ترقی پانیکو لوگ اتنا اچھا نہیں سمجھتے جتنا لیاقت کی بنا پر ترقی مل جانے کو لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر لیاقت کے اصول پر ترقی ملتی رہے تو ممکن ہے ذہانت اور اہلیت دکھانیکے موقعے زیادہ ملیں مگر ناکامی اور کمزوریوں کے فاش ہو جانیکے امکانات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ترقی غیر یقینی بھی ہوسکتی ہے۔ مزدوروں کی انجمنیں عموماً کام کے مطابق اجرت کی مخالفت کرتی ہیں۔ وہ ایک مقررہ اور یقینی اجرت اور تقدم ملازمت کے اعتبار سے ترقی کی ضمانت چاہتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو ملازمت سے علیحدہ کرنا ہو تو انکے خیال کے مطابق جس شخص کی مدت ملازمت سب سے کم ہو اسکو نکالنا چاہیئے نہ کہ سب سے زیادہ نا اہل کو۔ ایسی انجمنیں مقابلے کی حامی معلوم نہیں ہوتیں۔ انکے خیال میں اس سے بددلی پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مدت یا تقدم ملازمت کی حیثیت چاہتی ہیں۔

مدت ملازمت کے اعتبار سے ترقی دینے اور اختیار و اقتدار سونپنے میں زبردست معاشرتی

نقصان کے امکانات بہت زیادہ ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جب ترقی کی رفتار بہت تیز ہو تو مدتِ ملازمت
کا اصول قطعاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے جسمانی اور ذہنی شباب کو عموماً ۲۰ سال کی عمر میں پہنچ
جاتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ اس عمر کے بعض لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں۔ ایسے لوگوں
کو ایک خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے موقعہ نہ دینا گویا انکی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ لہذا تقدم
کے اعتبار سے ترقی بھی کچھ زیادہ معقول نہیں ہے۔ ان حالات میں چارہ کار یہ ہے کہ کسی ماہر
نفسیات کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور اسکا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ وہی یہ بتا سکتا ہے
کہ کس کو ترقی دی جائے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ جدید ترین نفسیاتی معلومات سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اور لوگوں کی اہلیت اور کام کرنیکی صلاحیت اور استعداد نفسیات ہی کی مدد سے
پرکھی اور ماپی جا رہی ہے۔ تاہم کردار کے بعض اہم پہلو اور خوبیاں ایسی ہیں جنہیں ماہر نفسیات بھی اچھی طرح
تول ناپ نہیں سکتے۔ اگر اس نقص کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود ماہر
نفسیات کے انتخاب کا حق کس کو حاصل ہوگا پھر ماہر نفسیات عالم الغیب تو نہیں وہ بھی انسان ہی ہے
دوسرے انسانوں کیطرح اس سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ اچھے ماہر نفسیات کی ذات سے اگر معاشرے
کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو متعصب ماہر نفسیات سے نقصان کے خدشات بھی ہو سکتے ہیں۔ علاوہ
اسکے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کام کرنے والا بجائے محنت سے کام کرنیکے ماہر نفسیات کو کسی حد تک
دھوکہ دینے اور اپنی صحیح شخصیت چھپانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس لئے یہ طریقہ بھی درست
معلوم نہیں ہوتا ہاں ایک مشیر کی حیثیت سے ماہر نفسیات ضرور مددگار ہو سکتا ہے لیکن وہ تنہا یہ مسئلہ
حل نہیں کر سکتا چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ادارے کی کارگذاری اور استعداد کار کو بڑھانیکے لئے تقدم
ملازمت کا اصول زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور نا خالص تقابلی۔ واحد طریقہ کسی ادارے کو زندہ اور
کارگذار بنانے کا یہ ہے کہ ادارے کے ہر فرد کو اسمیں ایک ایسی حیثیت حاصل ہو جسمیں وہ اپنے
آپ کو برابر کا شریک سمجھے یعنی ادارے میں حقیقی جمہوری احساس پیدا ہونا چاہیئے۔ وقت طلب
مسئلہ دراصل یہ نہیں ہے کہ کسطرح ایسا آدمی چنا جائے جسے تمام اختیارات دیدئے جائیں بلکہ یہ

کسطرح سبھی افراد میں اجتماعی یا گروہی احساس پیدا کیا جائے تاکہ دفتر کے منشی ہوں یا کالج کے استاد، ملز مزدور ہوں یا فوج کے سپاہی ان میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ ادارے میں معزز حیثیت حاصل ہو۔ ہر شخص کو یہ سہولت ہونی چاہیے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی کسی کام کو از خود شروع کرنے کی صلاحیت کو بروئے کار لا سکے اور اجتماعی منصوبہ بندی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکے۔ صرف یہی جاننا ضروری نہیں کہ افسر اپنے ماتحتوں کے متعلق یا ماتحت اپنے افسروں کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ رفیق کار ایک دوسرے کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔

عام طور پر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ صرف افسران بالا ہی کسی کام کو از خود شروع کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ماتحتوں کو کبھی اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ اگر تمام لوگوں کو یکساں مواقع ملیں تو جنہیں صلاحیت ہو گی وہ یقیناً اسے کہیں نہ کہیں ضرور استعمال کرینگے

انسانی فطرت کے متعلق چند نظریات

یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا مختلف قسم کے معاشروں اور انسانی فطرت کے متعلق ماہرین نفسیات کی معلومات اور انکے درمیان جو باہمی ربط و تعلق ہے اسکے متعلق ہم کوئی قطعی رائے قائم کر سکتے ہیں؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک قسم کا معاشرہ دوسری قسم کے معاشرے سے بہتر ہے کیونکہ وہ انسانی فطرت سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آخر کار یہی معاشرہ کامیاب رہے گا اور دوسرا ناکام ہو گا۔ انسانی فطرت سے متعلق جن چند نظریات کو سامنے رکھ کر اس قسم کے فیصلے کئے جاتے ہیں انکے متعلق تفصیلی بحث تو یہاں ممکن نہیں البتہ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک عام خیال ہے کہ چونکہ فلاں قوم۔ نسل۔ قبیلہ خاندان یا صنف تخلیقی طور پر بلند مرتبہ ہے اسلئے اس قبیلہ خاندان یا صنف کے جملہ افراد کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہونی چاہیئے اور اعلےٰ حیثیت انہیں کے حصہ میں آنا چاہیئے۔ ہندوستان میں ذات پات کا نظام اسی بنیاد پر صدیوں تک درست سمجھا جاتا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض خاندان کے افراد خاندان سے باہر شادی کر کے اپنے نسب کو خراب نہ کرنا چاہیں اور اپنے سید یا قریشی یا

راجپوتی خون میں کوئی اور خون نہ ملانا چاہیں۔ اور مرد عورتوں پر اپنی فضیلت و برتری جتاتے رہیں لیکن ماہر نفسیات اس قسم کی باتوں کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں ایسا کہیں دیکھنے میں نہیں آتا کہ کسی خاص قوم یا صنف کے سبھی افراد دوسری قوم جماعت یا صنف کے افراد سے افضل ہوں۔ بہ الفاظ دیگر اعلےٰ خصائص کسی خاص قوم خاندان یا صنف کی جاگیر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اوسط درجے کے مرد اور اوسط درجے کی عورت میں چند ایک نفسیاتی نوعیت کے اختلاف ہوں لیکن اسکے یہ معنی تو نہیں کہ ایک دوسرے کی نسبت بلند و ارفع بھی ہو۔

یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ تمام بچے یکساں صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور صرف ماحول سے ان میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ اور طرزِ زندگی کے مختلف سانچوں میں ڈھل کر انکی شخصیتیں بالکل مختلف نظر آنے لگتی ہیں۔ کبھی یہی نظریہ جمہوریت کو درست ثابت کرنیکے لئے پیش کیا جاتا ہے تو کبھی ذات پات کے نظام کی تائید میں اسکو پیش کیا جاتا ہے۔ اور اسکے جواز میں حیلہ یہ تراشا جاتا ہے کہ معاشرے میں ہر حیثیت اور ہر پیشے کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے کیوں نہ ان میں سے بعضوں کو حکمرانی بعضوں کو جنگ، زراعت یا خدمت کیلئے تربیت دے کر تیار کیا جائے ہر بچے کو اسکے باپ کی حیثیت اور پیشے کیلئے تیار کرنا زیادہ آسان ہے۔ چونکہ تمام بچوں میں ہر طرح کی طرزِ زندگی آسانی سے سیکھ لینے کی صلاحیت ہوتی ہے اسلئے کیوں نہ لوگوں کو ذات پات یا طبقات میں تقسیم کر کے انکی تربیت کی جائے۔

یہ درست ہے کہ انسان "سیکھنے والا حیوان[1]" ہے اور ہر قسم کے رسوم اور عادات سیکھ سکتا ہے تاہم جیسا کہ ہم اگلے باب میں بتائینگے ہر شخص کی اپنی مخصوص فطرت ہوتی ہے۔ جماعتوں یا قوموں میں بہ حیثیت مجموعی زیادہ فرق نہیں ہوتا لیکن انفرادی طور پر افراد میں یقیناً فرق ہوتا ہے بعض لوگوں میں دوسروں کے مقابلے میں سیکھنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، ماحول خواہ کتنا ہی موافق اور سازگار کیوں نہ ہو ہر بچہ آئین سٹائن یا قائدِ اعظم محمد علی جناح نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم پہلے ہی سے

[1] LEARNING ANIMAL

یہ متعین کر دیں کہ کس کو کس قسم کی طرزِ زندگی گذارنا ہے۔ تو اچھی خاصی تعداد میں ذہنی صلاحیتوں کا خون ہوگا۔ اور بہت سے لوگوں کو ہم ایسے فرائضِ منصبی سونپ دیں گے جنکے وہ قطعاً اہل نہ ہونگے

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص قسم کی زندگی ہی کے لئے موزوں پیدا ہوتا ہے۔ یہ لڑکا پیدائشی "ڈاکٹر" ہے۔ یہ "پیدائشی صحافی" ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو انکے مخصوص پیشے کے علاوہ کسی دوسرے پیشے یا طریق زندگی کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ یقیناً ناکام رہے گا۔ اس قسم کا دعا مبالغہ سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ہر بچہ ہر طرح کی طرزِ زندگی کیلئے یکساں طور پر موزوں نہیں ہوتا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ اسکے اندر مختلف سمتوں میں بڑھنے اور ترقی کرنیکی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی بچہ میں صرف کسی ایک خاص ہی بات میں بے پناہ شفقت اور دلچسپی ہو انسان اپنے مزاج اور طبیعت کو بدلنے اور موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ بآسانی مختلف قسم کے طریق ہائے زندگی میں کھپ سکتا ہے۔ ذات پات کا نظام ہو یا انقلابی نظام۔ وہ دونوں میں بخوبی ڈھل سکتا ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ ہر بچہ صرف ایک خاص قسم کی طرزِ زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے درست نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بعض لوگ ہمیشہ اسی پر زور دیتے ہیں کہ معاشرے میں اونے اور اعلےٰ طبقے ضرور ہونا چاہیں کیونکہ اقتدار حاصل کرنا جبلی ہے۔ وہ تو بعض اوقات یہ حکم بھی لگا دیتے ہیں کہ مقابلہ کی جبلت اتنی قوی ہے کہ جو معاشرہ اسپر استوار نہیں ہوگا وہ جامد ہوگا بغیر مقابلے کے زندگی میں جد و جہد باقی نہیں رہتی بغیر تگ و دو کے زندگی رواں دواں ہی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے نظریات بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں۔

چوتھا باب

ورثہ اور ماحول

ابتدائیہ کسی شخص کی نشو و نما اور بالیدگی پر ورثہ اور ماحول کا جو اثر پڑتا ہے۔ اس باب میں اسکی تفصیلات سے بحث ضروری ہے بہ الفاظ دیگر دیکھنا ہے کہ کسطرح ایک فرد استقرار حمل سے لیکر زندگی کی آخری سانسوں تک بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر اسے اپنے اسلاف سے کیا ملتا ہے۔ اور اس کے حیاتیاتی ورثے کو کسی مخصوص شخصیت و طرز زندگی میں کس طرح ڈھالا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کسطرح کسی شخص کا وجود بنتا۔ بڑھتا اور تخلیق ہوتا ہے۔ اور ازاں بعد وہ کیونکر نشو و نما پاتا رہتا ہے۔۔

حیاتیاتی ورثہ کے متعلق چند تفصیلات دراصل کسی فرد کا جسمانی وجود اس وقت شروع ہوتا ہے جب ماں اور باپ کے جنسی ملاپ سے باپ کا کوئی مخصوص ذرہ منی[1] ماں کے کسی خاص بیضہ[2] میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی کو استقرار حمل کہتے ہیں۔ استقرار حمل ہی کے وقت بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما کے امکانات

1 Sperm. 2 Egg.

یہ متعین کر دیں کہ کس کو کس قسم کی طرزِ زندگی گذارنا ہے۔ تو اچھی خاصی تعداد میں ذہنی صلاحیتوں کا خون ہوگا۔ اور بہت سے لوگوں کو ہم ایسے فرائضِ منصبی سونپ دیں گے جنکے وہ قطعاً اہل نہ ہونگے

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص ایک خاص قسم کی زندگی ہی کے لئے موزوں پیدا ہوتا ہے، یہ "پیدائشی ڈاکٹر" ہے، یہ "پیدائشی صحافی" ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو انکے مخصوص پیشے کے علاوہ کسی دوسرے پیشے یا طریق زندگی کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ یقیناً ناکام رہے گا۔ اس قسم کا دعا مبالغہ سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ہر بچہ ہر طرح کی طرزِ زندگی کیلئے یکساں طور پر موزوں نہیں ہوتا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ اسکے اندر مختلف سمتوں میں بڑھنے اور ترقی کرنیکی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی بچہ میں صرف کسی ایک خاص ہی بات میں بے پناہ شغف اور دلچسپی ہو انسان اپنے مزاج اور طبیعت کو بدلنے اور موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ بآسانی مختلف قسم کے طریق ہائے زندگی میں کھپ سکتا ہے۔ ذات پات کا نظام ہو یا انقلابی نظام۔ وہ دونوں میں بخوبی ڈھل سکتا ہے۔ اسلئے یہ کہنا کہ ہر بچہ صرف ایک خاص قسم کی طرز زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے درست نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بعض لوگ ہمیشہ اسی پر زور دیتے ہیں کہ معاشرے میں ادنے اور اعلےٰ طبقے ضرور ہونا چاہئیں کیونکہ اقتدار حاصل کرنا جبلی ہے۔ وہ تو بعض اوقات یہ حکم بھی لگا دیتے ہیں کہ مقابلہ کی جبلت اتنی قوی ہے کہ جو معاشرہ اسپر استوار نہیں ہوگا وہ جامد ہوگا بغیر مقابلے کے زندگی میں جدوجہد باقی نہیں رہتی بغیر تگ و دو کے زندگی رواں دواں ہی نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے نظریات بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں۔

چوتھا باب

ورثہ اور ماحول

ابتدائیہ کسی شخص کی نشو و نما اور بالیدگی پر ورثہ اور ماحول کا جو اثر پڑتا ہے۔ اس باب میں اسکی تفصیلات سے بحث ضروری ہے بہ الفاظ دیگر دیکھنا ہے کہ کسطرح ایک فرد استقرار حمل سے لیکر زندگی کی آخری سانسوں تک بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر اسے اپنے اسلاف سے کیا ملتا ہے۔ اور اس کے حیاتیاتی ورثے کو کسی مخصوص شخصیت و طرز زندگی میں کس طرح ڈھالا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کسطرح کسی شخص کا وجود بنتا۔ بڑھتا اور تخلیق ہوتا ہے۔ اور ازاں بعد وہ کیونکر نشو و نما پاتا رہتا ہے۔

حیاتیاتی ورثہ کے متعلق چند تفصیلات دراصل کسی فرد کا جسمانی وجود اس وقت شروع ہوتا ہے جب ماں اور باپ کے جنسی ملاپ سے باپ کا کوئی مخصوص ذرہ منی[1] ماں کے کسی خاص بیضہ[2] میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی کو استقرار حمل کہتے ہیں۔ استقرار حمل ہی کے وقت بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما کے امکانات

1 Sperm. 2 Egg.

متعین ہو جاتے ہیں۔ اسکے حیاتیاتی ورثے کو متعین کرنیوالے وہ چھوٹے چھوٹے جواہر تخلیق[1]
ہوتے ہیں جو سینکڑوں کی تعداد میں اس بیضہ اور ذرہ منی میں موجود ہوتے ہیں اور جنکے اتصال سے
بچہ وجود میں آتا ہے۔ یہی جواہر تخلیق بچے کی نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیتوں کو محدود اور متعین کرتے
ہیں۔ انہیں کی وجہ سے بچے کیلئے کسی خاص سمت بڑھنا اور ترقی کرنا آسان ہوتا ہے :۔

ورثے کو سمجھنے کیلئے اس پورے نظام کو سامنے رکھنا چاہیئے جو انسان کے وجود میں جاری و
ساری ہے۔ انسان کا سارا وجود خلیوں[2] سے بنا ہوا ہے جو بڑھتے رہتے ہیں۔ اُن خلیوں کے بیچ میں
مرکزہ[3] ہوتا ہے جسمیں تقسیم ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب کوئی خلیہ تقسیم ہونے لگتا ہے تو مرکزہ
ایک لمبے دھاگے کی شکل اختیار کر کے ۲۴ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ ان ٹکڑوں کو مادہ لونیہ یا اجسام
لونیہ[4] کہتے ہیں۔ مادہ یا جسم لونیہ کی شکل موٹے پتنگے کی سی ہوتی ہے اور اسکے گرد چھوٹے چھوٹے
کئی سو کے قریب کیمیائی ذرات ہوتے ہیں انہی کو جواہر تخلیق کہتے ہیں۔ یہ جواہر ..... کسقدر چھوٹے
ہوتے ہیں اسکا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۲ کروڑ بیضوں کا وزن تقریباً ایک اونس یا نصف
چھٹانک ہوتا ہے۔ ایک بیضہ پچاسی ہزار ذرات منی کے برابر ہوتا ہے جدید تحقیق کے مطابق ہر ذرہ
منی یا بیضہ میں ۲۴ اجسام لونیہ کی بجائے ۲۳ اجسام لونیہ ہوتے ہیں اور ہر مادہ لونیہ میں جیسا کہ ابھی لکھا گیا ہے کئی سو کے
قریب جواہر تخلیق ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ یہی وہ ننھی ہستیاں ہیں جو ورثے کو متعین کرتی ہیں اور ورثہ اور تجربات زندگی دونوں
ملکر کسی شخص کے کردار اور سیرت کو تعمیر و صیقل کرتے ہیں۔ (دیکھیئے کرچ کرچ فیلڈ کی کتاب

حیوانوں کی ہر نوع اپنے مخصوص جواہر تخلیق کی حامل ہوتی ہے اور صرف اپنی ہی نوع کے بچے
پیدا کر سکتی ہے۔ انسان ہی انسانی بچے پیدا کر سکتا ہے وہ کسی اور نوع کے بچے کو جنم نہیں دے سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہر بچہ اپنے ہی والدین سے جواہر تخلیق حاصل کرتا ہے تو کسی ایک جوڑے
کے سبھی بچے ایک جیسا ورثہ کیوں حاصل نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ لڑکے اور کچھ لڑکیاں کیوں
ہوتی ہیں یا وہ ایک دوسرے سے کئی ایک لحاظ سے مختلف کیوں ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ

1- Genes. 2- Cells. 3- Nucleus. 4- Chromosomes

ہر بچہ کسی خاص ماں باپ کی اولاد ہوتا ہے اور اسکے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے والدین کے سبھی اجسام لونیہ اور جواہر تخلیق حاصل کر سکے۔ یوں سمجھئے کہ ہر انسان کے اندر خواہ وہ مرد ہو یا عورت ابنیۂ خلئے موجود ہوتے ہیں جن سے ذرات منی یا بیضے بنتے ہیں لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی ابنیۂ خلیہ جنسی خلیہ بنے اسکے دو حصے ہوجاتے ہیں یعنی اس سے قبل کہ کوئی ذرہ منی کسی بیضہ سے پیوست ہونیکے لئے تیار ہو وہ دونوں اپنی اپنی جگہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اتفاقی طور پر حصوں میں بٹے ہوئے ۴۷ اجسام لونیہ میں سے کوئی سے ۲۳ اجسام لونیہ حاصل کر لیتا ہے۔ بات کو اور زیادہ وضاحت سے ذہن نشین کر نیکے لئے یوں کہئے کہ فرض کیجئے ہمارے پاس سرخ اور سیاہ پتوں کے تاش کی ایک جوڑی ہے جس پر ترتیب وار ہر پتے پر ایک سے لے کر ۲۳ تک ایک ایک نمبر درج ہے۔ سرخ پتے ماں کے اجسام لونیہ کو ظاہر کرتے ہیں اور سیاہ باپ کے اجسام لونیہ کو۔ جب کوئی خلیہ تقسیم ہوتا ہے تو گویا کوئی ایک سرخ پتہ یا کوئی ایک سیاہ پتہ اپنے جوڑے سے نکل آتا ہے۔ ذرا غور کیجئے اس قسم کے ۸٬۰۰۰٬۰۰۰ مختلف جوڑ ممکن ہوسکتے ہیں پھر یاد رہے کہ ان میں سے کوئی سے دو بیضے اور ذرہ منی بار آور ہو سکتے ہیں۔ اور (۲) جدید تحقیق کے مطابق بعض اوقات جواہر تخلیق ایک جسم لونیہ سے دوسرے جسم لونیہ کو چلے جاتے ہیں اسلئے ہر بچے کے ورثہ کی لاتعداد ممکنات ہوسکتی ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی ماں باپ کے جنسی ملاپ سے پیدا ہونے والا بچہ ان کروڑوں حیاتیاتی عناصر میں سے کسی ایک کا حامل ہوتا ہے ان حقائق کی روشنی کے پیش نظر ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونیوالے بچوں میں یکساں وراثتی صفات اگر نہ ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یکساں صفات وراثتی فقط مماثل جوڑواں بچوں میں ہی ہوسکتی ہیں۔ اسکا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے۔ لیکن مادہ لونیہ چونکہ اپنے ہی والدین سے ملتا ہے۔ اسلئے بچے والدین پر جاتے ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں وہ اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ وہ مخصوص جواہر تخلیق جو کسی ایک فرد کے حصے میں آتے ہیں۔ ان کا انحصار اسکے پورے سلسلہ نسب پر

1 Mother cells: 2 Sex cell. 3 line of ancestors
- Elements of Psy: Kretch + Crutchfield

متعین ہو جاتے ہیں۔ اسکے حیاتیاتی ورثے کو متعین کرنیوالے وہ چھوٹے چھوٹے جواہر تخلیق[1]

ہوتے ہیں جو سینکڑوں کی تعداد میں اس بیضہ اور ذرہ منی میں موجود ہوتے ہیں اور جنکے اتصال سے

بچہ وجود میں آتا ہے۔ یہی جواہر تخلیق بچے کی نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیتوں کو محدود اور متعین کرتے

ہیں۔ انہیں کی وجہ سے بچے کیلئے کسی خاص سمت بڑھنا اور ترقی کرنا آسان ہوتا ہے :-

ورثے کو سمجھنے کیلئے اس پورے نظام کو سامنے رکھنا چاہیئے جو انسان کے وجود میں جاری و

جاری ہے۔ انسان کا سارا وجود خلیوں[2] سے بنا ہوا ہے جو بڑھتے رہتے ہیں۔ اُن خلیوں کے بیچ میں

مرکزہ[3] ہوتا ہے جسمیں تقسیم ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب کوئی خلیہ تقسیم ہونے لگتا ہے تو مرکزہ

ایک لمبے دھاگے کی شکل اختیار کر کے ۴۸ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے ان ٹکڑوں کو مادہ لونیہ یا اجسام

لونیہ[4] کہتے ہیں۔ مادہ یا جسم لونیہ کی شکل موٹے پتنگے کی سی ہوتی ہے اور اسکے گرد چھوٹے چھوٹے

کئی سو کے قریب کیمیائی ذرات ہوتے ہیں انہی کو جواہر تخلیق کہتے ہیں۔ یہ جواہر ...... کسقدر چھوٹے

ہوتے ہیں اسکا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ۲ کروڑ بیضوں کا وزن تقریباً ایک اونس یا نصف

چھٹانک ہوتا ہے۔ ایک بیضہ پچاسی ہزار ذرات منی کے برابر ہوتا ہے جدید تحقیق کے مطابق ہر ذرہ

منی یا بیضہ میں ۴۸ اجسام لونیہ کی بجائے ۲۳ اجسام لونیہ ہوتے ہیں اور ہر مادہ لونیہ میں جیسا کہ ابھی لکھا گیا ہے کئی سو کے

قریب جواہر تخلیق ہے ہیں۔ بایں ہمہ یہی وہ ننھی ہستیاں ہیں جو ورثے کو متعین کرتی ہیں اور ورثہ اور تجربات زندگی دونوں

ملکر کسی شخص کے کردار اور سیرت کو تعمیر و صیقل کرتے ہیں۔ (دیکھیئے کرج کرج فیلڈ کی کتاب

حیوانوں کی ہر نوع اپنے مخصوص جواہر تخلیق کی حامل ہوتی ہے اور صرف اپنی ہی نوع کے بچے

پیدا کر سکتی ہے۔ انسان ہی انسانی بچے پیدا کر سکتا ہے وہ کسی اور نوع کے بچے کو جنم نہیں دے سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہر بچہ اپنے ہی والدین سے جواہر تخلیق حاصل کرتا ہے تو کسی ایک جوڑے

کے سبھی بچے ایک جیسا ورثہ کیوں حاصل نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ لڑکے اور کچھ لڑکیاں کیوں

ہوتی ہیں یا وہ ایک دوسرے سے کئی ایک لحاظ سے مختلف کیوں ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ

1- Genes. 2- Cells. 3- Nucleus. 4- Chromosomes.

ہر بچہ کسی خاص ماں باپ کی اولاد ہوتا ہے اور اسکے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے والدین کے
سبھی اجسام لونیہ اور جواہر تخلیق حاصل کر سکے۔ یوں سمجھئے کہ ہر انسان کے اندر خواہ وہ مرد ہو یا عورت
ابنیۂ خلیے[1] موجود ہوتے ہیں جن سے ذرات منی یا بیضے بنتے ہیں لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی ابنیۂ خلیہ
جنسی خلیہ[2] بنے اسکے دو حصے ہو جاتے ہیں یعنی اس سے قبل کہ کوئی ذرہ منی کسی بیضہ سے پیوست
ہونیکے لئے تیار ہو وہ دونوں اپنی اپنی جگہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک
اتفاقی طور پر حصوں میں بٹے ہوئے ۴۷ اجسام لونیہ میں سے کوئی سے ۲۳ اجسام لونیہ حاصل کر لیتا
ہے۔ بات کو اور زیادہ وضاحت سے ذہن نشین کرنیکے لئے یوں کہئے کہ فرض کیجئے ہمارے پاس
سرخ اور سیاہ پتوں کے تاش کی ایک جوڑی ہے جس پر ترتیب وار ہر پتے پر ایک سے
لے کر ۲۴ تک ایک ایک نمبر درج ہے۔ سرخ پتے ماں کے اجسام لونیہ کو ظاہر کرتے ہیں اور
سیاہ باپ کے اجسام لونیہ کو۔ جب کوئی خلیہ تقسیم ہوتا ہے تو گویا کوئی ایک سرخ پتہ یا کوئی ایک سیاہ پتہ اپنے
جوڑے سے نکل آتا ہے۔ ذرا غور کیجئے اس قسم کے ۸۰۰۰۰۰۰ مختلف جوڑ ممکن ہو سکتے ہیں پھر یاد رہے کہ (۱)
ان میں سے کوئی سے دو بیضے اور ذرہ منی بار آور ہو سکتے ہیں۔ اور (۲) جدید تحقیق کے مطابق بعض اوقات جواہر تخلیق
ایک جسم لونیہ سے دوسرے جسم لونیہ کو چلے جاتے ہیں اسلئے ہر بچے کے ورثہ کی لاتعداد ممکنات
ہو سکتی ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی ماں باپ کے جنسی ملاپ سے پیدا ہونے والا
بچہ ان کروڑوں حیاتیاتی عناصر میں سے کسی ایک کا حامل ہوتا ہے ان حقائق کی روشنی کے پیش نظر
ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونیوالے بچوں میں یکساں وراثتی صفات اگر نہ ہوں تو کوئی تعجب
کی بات نہیں۔ یکساں صفات وراثتی فقط مماثل جوڑواں بچوں میں ہی ہو سکتی ہیں۔ اسکا ذکر پہلے باب
میں آ چکا ہے۔ لیکن مادہ لونیہ چونکہ اپنے ہی والدین سے ملتا ہے۔ اسلئے بچے والدین پر جاتے ہیں
اور دوسروں کے مقابلے میں وہ اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ وہ مخصوص جواہر
تخلیق جو کسی ایک فرد کے حصے میں آتے ہیں۔ ان کا انحصار اسکے پورے سلسلہ نسب[3] پر

1. Mother cells. 2. Sex cell. 3. Line of ancestors
- Elements of Psy: Kretch & Crutchfield

اندازہ لوبیہ کی اس کانٹ چھانٹ پر ہوتا ہے جو انہیں ورثہ میں ملتی ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ کر حیران تو ہوتا ہوگا کہ لاکھوں ممکنات میں سے اسکے حصے میں ہی جوہر تخلیق بننے جو اسے والدین کی طرف سے ورثہ میں ملے :۔

ورثہ اور نشو ونما کا ڈول

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی فرد فقط اپنے ورثے کے مطابق بڑھے اور نشو ونما پائے۔ کیا استقرار حمل کے وقت یہ قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایک بچہ کس سمت اور کیونکر بالیدگی حاصل کریگا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ ورثہ ماحول کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا۔ کوئی میز لکڑی اور بڑھئی کے بغیر نہیں بنائی جاسکتی! جواہر تخلیق نشو ونما کا رخ اور بالیدگی کی مخصوص نوعیت متعین کرتے ہیں ۔

ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ انسانی جوہر تخلیق انسان کی شکل وصورت میں ظاہر ہوتا اور نمو پاتا ہے۔ وہ کوئی اور جسم وقالب اختیار نہیں کرسکتا لیکن ماں کے بطن میں اگر اسکے لئے مناسب ماحول نہیں ہے تو ہوسکتا ہے جنین رحم کے اندر ہی مرجائے اور بڑھ نہ سکے ۔ اسی طرح اس جوہر کا یہ خاصا ہے کہ بچے کی دو آنکھیں ایک ناک منہ اور دو ٹانگیں اور دو باز و وغیرہ ہوں لیکن رحم کے اندر اگر بچے کو کوئی سخت چوٹ یا نقصان پہنچ جائے تو عجیب وغریب نقائص بھی پیدا ہوسکتے ہیں مثلاً ہوسکتا ہے کہ بچے کی دو آنکھیں نہ ہوں۔ ایک ہی آنکھ ہو اور وہ بھی پیشانی پر بنی ہوئی۔ اور پیدا ہوتے ہی یا چند دنوں بعد مرجائے۔ علاوہ بریں متعدد و نسبتاً کم زوردار صلاحیتوں کا تعین بھی ابتدا ہی سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہر بچے کے ورثے کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت بہت مختلف قد وقامت کا مالک ہوگا۔ دو بچوں کو ایک ہی قسم کی خوراک ملتی رہے انکی نگہداشت میں بھی کوئی فرق نہ ہو تب بھی ہو سکتا ہے ان میں سے ایک کا قد ۵ فٹ ۴ انچ ہو اور دوسرے کا ۶ فٹ ۱۲ انچ تک پہنچ جائے۔ چونکہ انکے جواہر تخلیق مختلف بنے اسلئے انکی قد وقامت میں فرق ناگزیر تھا۔ ان جواہر کے باوجود یہ عین ممکن ہے کہ ان میں سے ایک بچہ کسی حادثے یا بیماری کے سبب اپاہج ہوکر رہ جائے۔ خوراک

بھی کسی حد تک نشوونما پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اور دوسرا بچہ غیر معمولی غدود[1] کے سبب طویل قامت حاصل کر لے غدود جسم کے وہ مخصوص اعضا ہوتے ہیں جو جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کی نشوونما پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں اور مردوں کے جنسی غدود میں جو اختلاف ہے اسکے سبب مردوں کے چہروں پر داڑھی کے بال اگ آتے ہیں انکی آواز نسبتاً بھاری ہوتی ہے اور عورتوں میں ماں بننے اور بچے کو پرورش کرنے کی واضح خواہش ہوتی ہے۔ بعض دوسرے غدود طبیعتوں کے اختلاف کو متاثر کرتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی فطرتاً تیز اور جوش میں آنے والا ہوتا ہے اور دوسرا خاموش ہوتا ہے اور آہستہ روی کا قائل ہوتا ہے۔ یہ سب غدود بذات خود ورثے کے ہی مرہون منت ہوتے ہیں مگر انکی رطوبتیں جب انجکشن کے ذریعے انسان کے جسم میں پہنچائی جائیں تو خود یہ غدود اس سے ایک بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو فلاں سمت میں ترقی کرنے کی صلاحیت ورثہ میں ملی ہے تو اسکا یہی مطلب ہوتا ہے کہ خواہ دونوں کو یکساں قسم کا ماحول میسّر آجائے اکبر کے اس سمت بڑھنے کے زیادہ امکان ہیں اور اصغر کے دوسری سمت۔ اور ماحول کا اختلاف وراثتی اثرات پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جواہر تخلیق کے سبب جو رجحانات ورثے میں کسی شخص کو ملتے ہیں۔ انکا خلاصہ یہ ہوگا (۱) وہ انسان کے ہاں جنم لینے والا بچہ انسانی شکل وصورت کا ہوگا۔ اسمیں چند ایک عمومی انسانی خصوصیات بھی ہونگی۔ (۲) وہ جسمانی اور ذہنی صفات کے لحاظ سے کسی ایک صنف سے تعلق رکھے گا۔ جسمانی ساخت کا تعین بچے کے حصے میں آنیوالے ۴۸ اجسام لونیہ میں سے کسی ایک جسم لونیہ سے ہوتا ہے۔ اور ایک دفعہ تعین ہو جانے کے بعد اسکی صنف کو کلی طور پر بدلا نہیں جاسکتا۔ البتہ مردانگی اور نسائیت کا انحصار صرف اسی ایک جسم لونیہ پر نہیں ہوتا۔ دوسرے اجسام لونیہ پر اس کا جو اثر ہوتا ہے وہ تو مسلم ہے مگر وہ بھی اپنی جگہ اہم ہوتے ہیں ہم سب جانتے ہیں کہ بعض مردوں میں دوسرے مردوں کی نسبت نسائیت زیادہ ہوتی ہے اور بعض عورتیں کسی حد

1 Unusual glands.

تک مرد نما ہوتی ہیں۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے عورتوں میں مردانہ پن اور مردوں میں نسائیت ورثے اور ماحول دونوں کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ (۳) وہ ایک خاص قد و وزن اور قوتِ جسمانی کا مالک ہو سکے گا۔ وہ کس رفتار و نہج سے بڑھے گا اسکا انحصار بھی جواہرِ تخلیق پر ہے۔ چنانچہ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض بچوں کو دیکھکر واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی کھلاڑی ہیں انکے اعضا کی ساخت کچھ اس وضع قطع کی ہوتی ہے اور انکا تال میل ایسا ہوتا ہے کہ وہ نہایت آسانی سے کرکٹ ہاکی باسکٹ بال بیس بال سیکھ سکتے ہیں چاہے انہیں مہارت حاصل کرنیکے کبھی زیادہ مواقع نہ ملے ہوں۔ (۴) کوئی لمبی عمر پاتا ہے اور کوئی نسبتاً تھوڑی۔ بعض دوسروں کی نسبت جلدی کسی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض ایک خطرناک مرض کا مقابلہ کر سکتے ہیں اسکا انحصار بھی جواہرِ تخلیق پر ہی ہوتا ہے۔ (۵) بدن کی رنگت چہرے کی بناوٹ ہاتھ پاؤں کی نزاکت سبھی کا تعلق ورثے میں ملنے والے جواہرِ تخلیق سے ہوتا ہے (۶) بعض خاص یا عام قسم کی ذہنی استعداد بھی ورثہ کا ہی جزو ہوتی ہے۔ استعداد سے مراد کسی کام کے کرنیکی قابلیت نہیں ہوتی بلکہ کسی کام کے سیکھنے کی وہ صلاحیت ہوتی ہے جو مواقع ملنے پر حاصل کیجا سکتی ہے۔ ماہرین نفسیات کسرِ ذہانت[1] ماپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کسی فرد کی اس صلاحیت کو جانچتی ہے جو اسے کسی کام کو سیکھنے کیلئے ورثہ میں ملتی ہے۔ ان سب کا انحصار دماغ کی چند صفات[2] پر ہے جنکا براہِ راست مطالعہ نہیں کیا جا سکتا مثلاً یکساں مواقعوں کی موجودگی میں بھی بعض بچے موسیقی کے زیادہ دلدادہ نظر آتے ہیں اور بعض مصوری کے بعض ریاضیات کے شوقین ہوتے ہیں بعض ادبیات کے۔ بعض کا دلچسپ مشغلہ مشینوں کے پرزے کھولنا اور جوڑنا ہوتا ہے۔ بعض نئی نئی کتابیں پڑھنے میں محو رہتے ہیں۔ پس رجحان کے معنی کسی کام کو نسبتاً جلدی سیکھنے کی قابلیت ہوئی خواہ اسکے لئے سبھی کو ایک سے مواقع حاصل ہوں چنانچہ جب قابلیت ہی محدود ہو گی تو ماحول کتنا ہی سازگار کیوں نہ ہو نمایاں ترقی نہیں ہو سکتی۔ (۷) بعض خاص قسم کے غدود بھی انہی جوہروں کے طفیل نشو و نما پاتے ہیں۔ ان غدود کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں البتہ انکے متعلق ہم یہ

1. Intelligence quotient 2. Qualities

ضرور قیاس کر سکتے ہیں کہ ایک ہی کنبے کے بچوں میں مزاج کا جو اختلاف پایا جاتا ہے اسکا سبب یہی غدود ہوتے ہیں۔ بعض زندہ دل ہوتے ہیں اور بعض سنجیدہ اور خاموش بعض مستقل مزاج ہوتے ہیں اور بعض ہلون مزاج۔ بعض جھگڑالو اور بعض صلح پسند ہوتے ہیں اور جب ماحول اور تجربات زندگی کی کوئی وجہ نہیں ملتی تو نتیجہ یہی نکالا جاتا ہے کہ ہو نہ ہو اسکا سبب یہ غدود ہیں۔ المختصر یہی وہ صفات اہم رجحان ہیں جو استقرار حمل کے وقت کسی بچے کو ورثہ میں ملتے ہیں۔ اور ابتدا ہی سے اسکی بالیدگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مگر ان باتوں کے باوجود بہت سی باتوں کے متعلق ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ مثلاً ابھی تک اسکے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے کہ بڑا ہو کر ایک بچہ خوش و خرم رہے گا دوسروں کی مدد کیا کرے گا یا مجرمانہ حرکات کا مرتکب ہوگا۔ اسکا مذہب کیا ہوگا۔ وہ کونسی زبان بولے گا۔ کن رسومات کی پیروی کرے گا۔ ان باتوں کے متعلق بھی ابھی وثوق سے کچھ نہیں جا سکتا۔ اور نہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو کسطرح استعمال کرے گا بلکہ ان سب سے فائدہ اٹھانے کیلئے زندہ بھی رہے گا کہ نہیں۔

بچے کا وجود پیدائش اور شیر خوارگی

استقرار حمل کے بعد بچے پر کیا گزرتی ہے ۹ ماہ کے عرصے میں جب کہ وہ رحم مادر میں رہتا ہے وہ محض ایک ننھے بیضے سے بڑھتے بڑھتے ایک مکمل بچے کی شکل و صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ جسامت میں غالباً ۲۰۰ (دوسو) کروڑ گنا بڑھ جاتا ہے۔ استقرار حمل اور پیدائش تک یہ سارے نو ماہ تکمیل[1] کی مدت ہوتی ہے جنین کو ماں کے جسم کے اندر ہی سے غذا ملتی ہے۔ اور اسکی حفاظت بھی ہوتی رہتی ہے۔ ماں خواہ بھوکی مرتی ہو یا اسے سخت اور تلخ تجربوں سے گزرنا پڑ رہا ہو اس کا جسم جنین کی حفاظت کی حتی الامکان کوشش کرتا رہتا ہے۔ ماں کے وجود سے اسے ہر وہ چیز ملتی رہتی ہے جسکی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ کمزور ماں کا بچہ بھی بہت

---

[1] ماں کے رحم کے اندر بچہ جو نشو و نما پاتا ہے اسے بھی کہتے ہیں Maturation.

Maturation. ویسے عام داخلی نشو و نما کو بھی اسی نام یعنی سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے پانچواں باب صفحہ نمبر ۱۱۰

تندرست اور توانا ہو سکتا ہے لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ ماں کو اگر کوئی سخت چوٹ آجائے یا اسے کوئی بیماری ہو جائے تو جنین مر بھی جاتا ہے کسی اندرونی عمل کی خرابی کے سبب اسقاطِ حمل بھی ہو سکتا ہے یا پھر جان بوجھ کر حمل گرانیکی کوشش بھی کیجا سکتی ہے۔ ماں کی طرف سے پہنچنے والے بعض دوسرے اثرات بھی بچے کی نشو و نما پر کئی اور طریقوں سے اثر انداز ہو سکتے ہیں جیسے مثلاً ہو سکتا ہے اس کے سبب بچے میں اعصابی میلانات کے میلانات زیادہ ہو جائیں۔ ماں کی غذا یا اسکی کوئی ہیجانی کیفیت بھی ممکن ہے بچے کی بالیدگی اور کیمیائی حالت پر اس انداز سے اثر ڈالتی ہو جسے ابھی ہم اچھی طرح نہ سمجھ سکتے ہوں۔ بہر حال ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ نشو و نما کی بعض خامیاں پیدائش سے پہلے ماحول کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں یا جواہر تخلیق کی کسی کمزوری کے سبب۔ پیدائش سے پہلے بچے کی مدد کا بس ایک طریقہ ہے کہ ماں کی صحت کا خیال رکھا جائے پیدائش سے پہلے اسکے علاوہ ہمیں کوئی اور ایسا طریق معلوم نہیں ہے جس سے اسکی ذہانت یا کسی خاص استعداد کو بڑھایا جا سکے۔

حمل کے بعد وضع حمل یا پیدائش کا وقت آتا ہے۔ اور یہیں سے معاشرتی ورثہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ بعض ماہرین نفسیات کی رائے میں پیدائش کے وقت بچے کے سر پر جو زبردست دباؤ پڑتا ہے وہ اسکے لئے ایک سنگین حادثہ کا حکم رکھتا ہے اس سے بچے کی آئندہ جذباتی اور ہیجانی نشو و نما اور شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے لیکن یہ نظریہ درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ معمول کے مطابق پیدا ہونیوالے بچوں کا جب ان بچوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے جو آپریشن کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں تو اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ پیدائش کے وقت اگر بچے کو خراشیں یا چوٹیں آجائیں تو ان سے اسکی آئندہ نشو و نما پر نمایاں اثر پڑے۔

وضع کے بعد شیر خوارگی کا زمانہ آتا ہے۔ جسمیں بچے غذا اور حفاظت کیلئے بڑوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ خیال عام تھا کہ شیر خوارگی کا زمانہ بھی پیدائش سے پہلے کے زمانہ کیطرح ہوتا ہے اور سبھی بچوں کے لئے قریب قریب ایک سا ہوتا ہے۔ انکو دودھ پلایا

جاتا ہے۔ سونے کیلئے موقعے اور سہولتیں بہم پہنچا دی جاتی ہیں۔ انہیں کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ وہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور نہ سیکھ سکتے ہیں لیکن ماہرین اس نظریے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں انکے نزدیک شیر خوارگی کے ابتدائی دو سال پوری زندگی میں اثر پذیری کے لحاظ سے سب سے اہم ہوتے ہیں :-

ماحولی اور ثقافتی عوامل کا بچے کی بالیدگی پر اثر

پیدا ہوتے ہی جن اہم ماحولی اور ثقافتی اختلافات سے بچوں کو واسطہ پڑتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ مثال کے طور پر اس سلوک کو سامنے رکھیے جو جنوب مشرقی افریقہ کے بعض قبیلے اپنے بچوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پھر دیکھئے کہ اسکا بچوں پر آئندہ چل کر کیا اثر پڑتا ہے مثلاً آریپش[1] قبیلہ کے لوگ بڑے بھلے ہوتے ہیں۔ انکے نزدیک زندگی ایک مہم ہے جسمیں انسان سبھی کام کرتا ہے بچے پیدا کرتا ہے سبزیاں اگاتا ہے سور پالتا ہے۔ چنانچہ بچوں کی تربیت اور کھجوروں کے متعدد درخت اگانے کے بعد وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی رائیگاں نہیں گئی اور درمیانی عمر میں ہی زندگی کی گہما گہمی سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ مرد اور عورت زندگی کی مہم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، انکی معاشی زندگی کسی قدر سخت ہے لیکن انہوں نے ایک ایسا زرعی نظام قائم کر لیا ہے جسمیں محنت اور وقت تو صرف بہت لگتا ہے مگر اس سے ان میں گہرا تعاون اور ہمدردی کا ایسا جذبہ ابھرتا ہے جس کے مقابلے میں وہ کارگذاری اور کارکردگی کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ انکے درمیان لڑائی جھگڑا تقریباً مفقود ہے قتل اور غارت گری کو وہ بہادری کا لازمی خاصہ نہیں سمجھتے۔ ایک آریپش ماں شروع ہی سے بچے کے اندر دوسروں پر اعتماد کرنیکے جذبات ابھارتی ہے۔ وہ اسے اپنی غذا اردگرد کے پرندے، جانور اور دیگر اشخاص سب سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی عادت پیدا کرانے کی کوشش کرتی ہے مثلاً اپنے کسی رشتے دار خالہ یا ممانی سے اسے ان الفاظ سے متعارف کراتی ہے۔ دیکھو منے یہ تمہاری خالہ ہیں میری بہن بہت اچھی ہیں یہ بالکل میری طرح تم سے پیار کرتی ہیں۔ دیکھو تو کتنی

1 Arapesh.

پیاری ہیں۔ اور ساتھ ساتھ مسکرائی بھی جاتی ہے۔

اب ان کا مقابلہ منڈوگمر[1] قبیلہ کے لوگوں سے کرو جو زیادہ مالدار اور طاقتور ہیں۔ یہ اپنی بے باکی اور وحشیانہ رویہ کے سبب بڑی بڑی زرخیز زمینوں کے مالک ہیں لیکن اسکے باوجود بے اطمینانی اور بے اعتباری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کنبہ کے تمام مردوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد ہوتا ہے حتیٰ کہ باپ بیٹا یا بھائی بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں اگر کوئی شادی شدہ عورت اپنی شکار کی ہوئی مچھلی اپنی نند کے ساتھ بانٹ کر کھاتی ہے تو پیار یا خلوص کے باعث نہیں بلکہ اس خوف سے کہ کہیں وہ اسے گالیاں اور کوسنے نہ دے۔ لڑکے کے بالغ ہونے کو باپ کے زوال کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے تعارف یا روشناسی[2] کے موقعہ پر جو دعوت دی جاتی ہیں انہیں سردار قبیلہ کی خاطر بڑی ظالمانہ قسم کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں بعض دوسرے قبیلوں میں بھی تقریب روشناسی بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ جب لڑکا بالغ ہوتا ہے تو ایک عام دعوت کی جاتی ہے اور اسے عام مجمع میں متعارف کرایا جاتا ہے اور سب کو بتایا جاتا ہے کہ اب وہ مردوں کی طرح معاشرہ کی ذمہ داریوں کو اٹھا سکتا ہے۔ کسی لڑکی کو بیاہ کر لا سکتا ہے گھر بنا کر رہ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قبیلہ کی تقریب روشناسی کو دیگر قبیلوں کی اسی رسم سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ اور نہ اسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قبیلہ کے بالغ مردوں میں ایک اور مرد کے بلوغ کے اضافے کا اعلان کیا جائے۔ اکثر اس قبیلہ میں جنکی روشناسی ہو چکی ہے وہ ان لوگوں کا تمسخر اڑاتے ہیں جنکی ابھی روشناسی نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ منڈوگمر قبیلہ کا لڑکا ہمیشہ ایک معاندانہ فضا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ پیدائش کے دن سے ہی زندگی اسکے لئے ناخوشگوار بنائی جاتی ہے۔ اسے تنگ اور سخت ٹوکری میں لٹایا جاتا ہے جہاں وہ ذرا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اور تکلیف کے ساتھ پڑا رہتا ہے۔ چاہے وہ بھوکا بلبلاتا ہی کیوں نہ ہو اسے فوراً دودھ نہیں ملتا۔ جب ماں اسے دودھ پلاتی بھی ہے تو کھڑے ہو کر۔ اور وہ بھی کچھ اس انداز سے

[1] Mundgumor [2] Initiation feast

کہ خود اسے اور بچے دونوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اراپیش کیطرح منڈوگمرماں کیلئے بچے کو دودھ پلانا کوئی دلچسپ اور ناخوش گوار کام نہیں۔ جونہی بچہ دودھ چوسنا بند کر دیتا ہے اسے پھر اسی چھوٹی سی ٹوکری میں پٹخ دیا جاتا ہے۔ اسلئے بچہ ابتدا ہی سے معاندانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ ماں کی چھاتی سے سختی کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اور بہت جلدی جلدی اور کھینچ کھینچ کر دودھ پیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اسے دودھ اچھو ہو جاتا ہے۔ اسپر ماں کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور بچے کا غصہ بھی بھڑک اٹھتا ہے اسکے بعد دودھ پینے اور پلانے کا کام غصہ اور کشمکش میں ختم ہو جاتا ہے اور وہ پہلے کی سی چھوٹی سی تسلی اور دلدہی بھی باقی نہیں رہتی۔ ان دونوں قبیلوں کا بچوں کیساتھ برتاؤ اور سلوک معلوم ہو جانے کے بعد یہ اندازہ لگا لینا زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا کہ انکے یہاں مردوں اور عورتوں کی شخصیتوں میں اتنا فرق کیوں ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات خاص طور پر اس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ بچوں کو کسطرح دودھ پلایا اور چھڑایا جاتا ہے۔ انکے ساتھ کسقدر پیار کیا جاتا ہے نہانے دھونے اور بول و براز کے سلسلے میں انہیں کیسے تربیت دی جاتی ہے۔ یہ تربیت اگر مناسب عمر سے پہلے ہی شروع کر دی جائے اور اسمیں اصرار اور شدت برتی جاتی تو بچے کی شخصیت پر اسکا بجائے اچھا اثر پڑنیکے برا اثر پڑتا ہے بعض نفسیات کے ماہر تو یہاں تک کہہ دیتے کہ یہی چیزیں اس بات کا تعین کرتی ہیں کہ کسی تمدن میں بنیادی شخصیت کی نوعیت کیا ہوگی۔

جوں جوں بچے بڑے ہوتے جاتے ہیں کئی دوسرے عوامل اہم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے باب میں ہم ایک امریکی ماہر نفسیات خاتون کا ذکر کر چکے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ ہندوستانی والدین اور امریکی والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ بالکل جداگانہ ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ امریکہ میں زیادہ تر بچوں کے ساتھ بہ حیثیت فرد سلوک کیا جاتا ہے۔ انکی قدر کیجاتی ہے۔ انکو اہمیت دی جاتی ہے۔ انکو آگے دھکیلا جاتا ہے منتبہ کیا جاتا ہے جھڑکا اور دھمکایا جاتا ہے۔ بسا اوقات

1 Sex and Temperament in Primitive Societies: Mead

والدین انہیں کامل سمجھ لیتے ہیں۔ اور انکے مستقبل کے متعلق حسن ظنی ہو جاتی ہے۔ اسکے برعکس ہندوستان میں بچے محض فرد کی حیثیت سے نہیں دیکھے جاتے وہ والدین کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں۔ کنبے کے افراد کی باہمی محبت اور یکجہتی زندگی کو بامعنی اور پُر رونق بنا دیتے ہیں۔ ہر فرد کی اپنی مختصر زندگی بذات خود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ کوئی اپنے بچوں کی تربیت کیسے کرتا ہے، انکی صحت اور بہبودی کا کتنا خیال رکھتا ہے انکی توالد و تناسل کی صلاحیتیں کیسی ہیں یا اپنی آل اولاد کی درازی عمر کے بارے میں وہ کس حد تک متفکر ہوتا ہے۔ اپنے مطالعہ کی بنا پر مسز ال بی مرفی کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ ہندوستان میں مائیں بچوں کو گود میں اٹھائے پھرتی ہیں اور دو سال یا اس سے بھی زائد اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ اسلئے ہندوستانی بچوں میں امریکی بچوں کے مقابلے میں قطعاً کوئی بخریص کار اور کامرانی پیدا نہیں ہوتی۔ امریکی بچوں کو یہاں کے بچوں کی نسبت اپنا کام خود کر سکنے کہیں زیادہ مواقعے ملتے ہیں۔ اور کامیابی حاصل کر لینے پر تحسین بھی یہاں کے بچوں کی نسبت زیادہ ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں رویے اپنے طور پر درست اور مفید ہوں۔ ممکن ہے امریکی رویے کا نتیجہ یہ ہو جیسا کہ ہم آئندہ باب میں پائیں گے کہ بچوں کی کسی کام کو از خود کرنے کی عادت نسبتاً جلدی استوار ہو جاتی ہو لیکن اسمیں بڑی قباحت یہ ہے کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بچے کو اس کی اپنی رفتار سے بڑھنے دینا چاہیے۔ عجلت اور جلد بازی سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ وقت سے پہلے نشو ونما پا لے یا کسی کام میں ماہر و طاق ہو جائے۔ اسے یقیناً صحت مند اور آزاد ماحول ملنا چاہیے جسمیں قدم قدم پر اسے کوئی آگے نہ دھکیلے۔ بیشتر امریکی والدین اب یہ اصول ماننے لگے ہیں کہ بچے کو اسکی ہمت اور رفتار سے بڑھنے دینا چاہیے مگر ثقافتی رسوم کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج سے کوئی تیس سال پہلے مغربی ملکوں کے بیشتر ماہرین نفسیات اس بات پر بڑا زور دیتے تھے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے صحیح عادات استوار کرنیکی تربیت دینا چاہیے۔ انہیں دوسروں کا سہارا حاصل کرنیکے رجحان سے روکنا چاہیے۔ بچوں سے یہی توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ بھی ذمہ دار بالغوں کیطرح کام کریں گے حتیٰ کہ ماں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور اسکے مضر اثرات پر بھی بڑی لے

دے ہوتی تھی لیکن اب نفسیات دانوں کو اس بات کا بخوبی علم ہو گیا ہے کہ انکی یہ رائے درست نہ تھی۔ بچوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ماں کی شفقت اور محبت ہی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ مائیں بچوں کی پرورش کرتے وقت نفسیات کی کتابوں میں دیئے ہوئے اصولوں کی حرف بہ حرف پیروی کریں یقیناً وہ پاکستانی ماں جو اپنے بچے سے پیار و محبت سے پیش آتی ہے ناز و نعمت سے اسے پالتی ہے، یا جو ماں بچے کی پرورش کے فریضہ کو کوئی وبال جان تصور نہیں کرتی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرورت سے زائد اہمیت نہیں دیتی اور ہنسی خوشی اسکی ضرورتیں پوری کرتی رہتی ہے وہ یقیناً بچے کیلئے نہایت صحت مند اور ساز گار ماحول فراہم کرتی ہے۔ جہاں بچوں کی قدر ہوتی ہو والدین کو اپنی کثیر اولاد پر فخر و ناز ہو اور ہر بچے کی پیدائش پر وہ خوش اور مطمئن نظر آئیں تو یہ چیز اس امر کی ضمانت ہے کہ بچہ شروع ہی سے مناسب ماحول میں پرورش پائے گا۔

چند دوسرے موثرات

مندرجہ بالا عوامل کے علاوہ وہ کون کونسے اثرات ہیں جنسے بچے کی بالیدگی شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اسکے جواب میں بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ خاندان کے جملہ افراد کا باہمی جذباتی ہیجانی لگاؤ بچے کی تربیت و شخصیت کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک ماں جسکی شادی شدہ زندگی خوشگوار نہ ہو یہ کوشش کرے کہ بچہ ہمیشہ اسکے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہے۔ اسکے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرے۔ ممکن ہے اسے یہ خدشہ ہو کہ اگر یہ بڑا ہو گیا تو جی بہلانے کا یہ بھی سہارا چھن جائے گا لہذا ہو سکتا ہے وہ اسے لاڈ و پیار سے بگاڑ دے "۔ اور ماں کا سہارا لئے بغیر وہ کسی کام کو سر انجام دینے سے خوف کھانے لگے یا ہمیشہ ننھے بچوں کی سی حرکتیں کرے۔ ماں کے اس قسم کے پیار کو "ماں کی از حد محبت" نہیں کہنا چاہیے اسے تو ماں کی اپنے بچے کیلئے غلط محبت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ بچے کی بہبودی کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ اسکی یہی محبت تو بچے کے حق میں غیر مفید ہے۔ ایسا بچہ بڑے ہو کر ممکن ہے اپنی بیوی سے خاطر خواہ محبت نہ کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی بیوی اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہ کر سکے اور ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہونے دے۔

والدین کے باہمی ناخوشگوار تعلقات ممکن ہے کسی بچے کو یہ احساس دلادیں کہ اسے کوئی نہیں چاہتا سبھی اسے "فالتو" سمجھتے ہیں۔ اور وہ "بے چارہ" اداس اور پژمردہ رہنا شروع کردے۔ علاوہ بریں بعض خاندانوں میں بچوں کے ساتھ انکی جنس اور عمر کی بنا پر مختلف اور امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ بڑا لڑکا موردِ عنایات ہوتا ہے سب سے چھوٹا بچہ ماں کا لاڈلا یا سب کا "غلام"۔ سب سے بڑی لڑکی "بھاگوان" سمجھی جاتی ہے۔ اور سب سے چھوٹی منحوس کیونکہ پہلی کی پیدائش پر ہو سکتا ہے کہ ابا کو ترقی مل گئی ہو اور چھوٹی کے پیدا ہوتے ہی اماں کا انتقال ہو گیا ہو۔ مثلاً چین میں جب کسی بچے کی پیدائش کے وقت کنبے کے کسی فرد پر کوئی مشکل آن پڑے تو اس بچے کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بعض معاشروں میں بچوں کو سختی سے "تعمیل حکم" کی تعلیم دی جاتی ہے ذرا سی نافرمانی بھی موجب سزا بن سکتی ہے تاہم جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے بہت سے معاشرے ایسے ہیں جنہیں سزا بالکل مفقود ہے خصوصاً "وحشی" قوموں میں۔ بچوں کو سزا قطعاً نہیں دی جاتی۔ یہی حال جاپان میں بھی ہے وہاں کے لوگ بھی بچوں کو سزا نہیں دیتے بلکہ غیرت دلانے یا "شرمندہ کرنے کی" مختلف تدابیر استعمال کرتے ہیں چنانچہ بچہ وہاں سزا سے نہیں ڈرتا لیکن وہ دوسروں کے اظہار ناپسندیدگی کو فوراً بھانپ لیتا ہے یعنی اس تربیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ نہایت آسانی سے یہ پہچان لیتا ہے کہ اسکا کون کام پسندیدہ ہے اور کونسا ناپسندیدہ۔ والدین کے اس قسم کے رویوں کا یقیناً بچوں کی شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ذہنی ماہر نفسیات خاتون جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں لکھتی ہیں کہ ہندوستانی بچوں میں امریکی بچوں کے مقابلے میں مقاومت اور مزاحمت کا جذبہ بہت کم ابھرتا ہے سخت طیش میں اگر ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے کا احساس بھی انہیں اتنی شدت اختیار نہیں کرتا جتنا کہ امریکی بچوں میں۔ اور اگر کبھی یہ احساس بہت شدید بھی ہو جاتا ہے تو اسکے اظہار کے لئے یہاں کا معاشرہ وہ بچے تلے طریق بھی مہیا کرتا جو امریکہ میں عام طور پر رائج ہیں۔

ان تاثرات کے علاوہ بچے کی نشوونما پر اس بات کا بھی خاص اثر ہوتا ہے کہ اسے کس

Mrs. Murphy

صنف کے فرد کی حیثیت سے پرورش کیا جاتا ہے۔ اسے "لڑکوں" کیطرح پالا جاتا ہے یا لڑکیوں کیطرح ہم میں سے ہر فرد اپنے تئیں سوچ سکتا ہے کہ اسکے اپنے گھر میں بہن بھائیوں کے ساتھ کس قسم کا امتیازی سلوک برتا جاتا ہے، دونوں کی کب تعریف ہوتی ہے اور کب انکا مذاق اڑایا جاتا ہے اور دونوں کو مختلف قسم کے کاموں میں حصہ لینے کی کیونکر ترغیب دلائی جاتی ہے۔ لڑکوں سے توقع کیجاتی ہے کہ وہ لڑکیوں کے مشاغل میں دلچسپی کا اظہار نہ کریں۔ اسی طرح ہمارے گھروں میں لڑکیوں سے یہ توقع نہیں کیجاتی کہ وہ لڑکوں کی طرح ڈنڈ پیلیں گی۔ بعض معاشروں میں لڑکے اور لڑکی کے بارے میں یہ امتیازی رویہ اوائل عمر سے ہی برتا جاتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں اور لڑکی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اسکے برعکس بعض جگہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ زیادہ محبت کا برتاؤ کیا جاتا ہے اسکے بھائیوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ بہن کا خاص طور پر خیال رکھیں گے مگر عام طور پر دادی کو نواسی کے مقابلے میں نواسہ زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ چین میں بھی نواسہ ہی زیادہ لاڈلا ہوتا ہے۔ یا یہ بھی ہوتا ہے کہ اوائل عمر میں بچے اور بچی میں زیادہ تمیز نہیں کی جاتی۔ دونوں سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ ازاں بعد جب اسکول جانیکی عمر آجاتی ہے تو دونوں کو الگ الگ اسکول بھیجا جاتا ہے اور انکی مختلف طریق پر تربیت کیجاتی ہے بعض اوقات بلوغت کے ایام تک لڑکے اور لڑکی میں کچھ زیادہ فرق و تمیز نہیں کیجاتی۔ دونوں کے ساتھ امتیازی سلوک اسوقت شروع ہوتا ہے جب انمیں نمایاں جسمانی اور نفسیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لڑکی کو برقعہ اوڑھنے کی ہدایت کیجاتی ہے یا اسے خبردار کر دیا جاتا ہے کہ وہ "لڑکی" ہے اور اسے اس کے بھائیوں جیسی "آزادی" نہیں مل سکتی لیکن تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو "ازدواجی زندگی" ہی اسکی "ساری قسمت" تصور کیجاتی ہے اور دوسری طرف اگر اسکو تعلیم حاصل کرنیکے موقعہ مل جائے تو اسے وہی تعلیم دی جاتی ہے جو اسکے کسی بھائی کو میسر ہوتی ہے۔ اسے بھی وہی امتحان پاس کرنے ہوتے ہیں اور انہیں نصابی کتب کی ورق گردانی کرنا ہوتی ہے۔ تاہم بعض معاشروں میں ایک بالغ بیٹے کو تو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ گھریلو معاملوں میں بول سکے یا عام دنیاوی باتوں کے متعلق

اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کر سکے مگر "بالغ بیٹی" کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ فرزند ارجمند تو کسی بات
میں والدین سے اختلاف بھی کر سکتا ہے مگر دختر نیک اختر سے کبھی توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ایسا کوئی
خیال بھی اپنے دل میں لائے۔ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ
بلوغت کے قریب پہنچ کر بچہ اکثر والدین کی دی ہوئی تربیت یا انکے احکامات میں مین میخ نکالتا ہے
اور نسبتاً زیادہ آزادی چاہتا ہے۔ اکثر سکول اور گھر کی تربیت میں نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے اور
بعض اوقات سکول میں بھی ماحول کے اندر تھوڑا سا فرق پڑ جائے تو بچے کی شخصیت پر کافی اثر پڑتا
ہے کہ کوئی ایک سمت اجاگر ہونے کی بجائے اسکی نشوونما کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیتی ہے اور
بچے کیلئے کچھ ایسی دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں جنکا ابتدا میں نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک جیسی
طبیعتوں کے دو لڑکے ایک دن سکول جاتے ہیں۔ کھیل کے وقفے میں ایک کے ساتھ استاد بات
چیت کرنے لگتا ہے۔ اور دوسرا دور کھیل کے میدان میں یونہی گھومنے پھرنے کیلئے نکل جاتا ہے
ان میں سے کسی نے پہلے کبھی ہاکی نہیں کھیلی ہے کچھ عرصہ کے بعد دونوں کو ایک میچ میں حصہ لینے
کو کہا جاتا ہے۔ استاد کے ساتھ باتیں کرنے والا بچہ اس دعوت سے قبل
دوسرے بچوں کے ساتھ کچھ کھیل کی مشق کر چکا ہے۔ اس لئے وہ بڑی آسانی
سے کھیل میں شامل ہو جاتا ہے لیکن دوسرا بچہ گراؤنڈ سے باہر کھڑے ہو کر انکو کھیلتے دیکھنا ہی
زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے
ہیں یہ اتنا ہی ان سے دور ہوتا جاتا ہے۔ سال کے آخر میں ان دونوں کی خود اعتمادی میں فرق
دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کی نسبت سپورٹس سے زیادہ لگاؤ ہو گا۔

ورثہ یا ماحول

علاوہ بریں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ لوگوں کے درمیان جو مختلف قسم کے اختلاف
ملتے ہیں انکا سبب فقط ورثہ ہے یا ماحول ہو سکتا ہے ایک خاص عمر میں بچے
کو کوئی بیماری لاحق ہو جائے جو اسکی نشوونما کا رخ ہی بدل ڈالے۔ والد یا والدہ کا تبادلہ ہونے کی صورت
میں بھی ہو سکتا ہے کہ بچے کو بالکل نئے ماحول میں نئے دوست بنانے پڑیں کوئی نا سمجھ استاد

کس بات پر نہایت شرمیلے بچے کو سختی سے جھڑک دے تو عین ممکن ہے وہ اس مضمون سے ہی نفرت کرنے لگے جو وہ استاد پڑھاتا ہے۔ ایک نہایت ذہین بچے کے ساتھ کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ایک دفعہ انگریزی کا کوئی لفظ اس نے غلط پڑھا تو اسکے اپنے ہی ساتھی نے جو گھر پر انگریزی کی عمدہ تعلیم حاصل کرتا تھا اس زور کا قہقہہ لگایا کہ آئندہ اس بچے نے کسی کے سامنے انگریزی بولنے سے ہمیشہ احتراز کیا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انگریزی میں اسکی استعداد گرنے لگی اور وہ ہم جماعتوں سے پیچھے رہ گیا۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ پرائمری سکول میں کوئی طالب علم نہایت اچھے نمبر لیتا ہے مگر مڈل یا ہائی سکول میں پہنچ کر وہ پچھڑی رہنے لگتا ہے اور یہ خدشہ ہو جاتا ہے کہ اسکی ذہانت کم ہو گئی ہے اور وہ شاذ ہی زندگی میں کامران ہو سکے۔ پاکستان اور ہندوستان میں نظام تعلیم ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اکثر طالب علموں کو آئے سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں متذکرہ بالا باتوں کی وضاحت دیگر ملکوں کے مقابلے میں آسان ہے جہاں کامیابی حاصل کرنے کے عام مواقع ہیں اور ناکامی کبھی کبھار ہی حصے میں آتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی طالب علم کالج میں پہنچ جاتا ہے تو بعض اوقات اسے ایسے طالب علموں سے راہ و رسم بڑھانا پڑتی ہے جن کے گھر کی فضا اور ماحول نسبتاً بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خود کئی اہم فیصلے کرنا پڑیں۔ بعض اوقات اسے مذہبی مسائل سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر ابتدا میں اپنے مخصوص مذہبی عقائد اختیار کرتے وقت اس نے قطعاً سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیا تو عین ممکن ہے اب انہیں انکی صحت پر شک ہونے لگے اور وہ ان سے کنارہ کش ہو جائے یا محض نام نہاد طریق پر انہیں مانتا رہے۔ اسکے برعکس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے تجربات اور احساس کی بدولت پختہ مذہبی عقائد کا مالک ہو جائے اور ذاتی طور پر خدا کی ہستی میں اس کا ایمان قوی تر ہو جائے اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کی خوشی کا انحصار اسکے خاوند کے کردار اور شخصیت پر ہوتا ہے جس کا انتخاب اسکے والدین کرتے ہیں لیکن لڑکے سے یہ توقع عام ہے کہ وہ خود اپنے روزگار کی فکر کرے ہو سکتا ہے کہ کسی بڑے زمیندار کا لڑکا بھی محض اپنے باپ کی زمینوں پر پڑا رہنے کو خوب تر نہ سمجھے اور جب تک وہ کوئی آزادانہ طریق پر کام سنبھال نہ لے اسے اپنے ذمہ دار ہونے کا احساس ہی

پیدا نہ ہو۔ جب وہ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھنے لگتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ استادوں یا کتابوں میں لکھی ہوئی سبھی باتوں کو درست تسلیم کر لے اور امتحان میں انہیں من وعن نقل کر دے۔ اب بعض اوقات اسے خود اپنے آپ یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کونسی چیز صحیح ہے اور کونسی غلط اور کبھی کبھار تو اسے اپنے آپ سے لڑنا بھی پڑتا ہے تاکہ غلط کام کرنیکی تحریص سے خود کو روک سکے۔ اس کشمکش میں بعض اوقات اسے شکست بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کاہل اور سست بھی ہو سکتا ہے یا رشوت خور اور بددیانت بھی ہو سکتا ہے یا اسمیں کردار اور اخلاق کی جملہ خوبیاں اور توبیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

بعینہٖ شادی کے مسئلے کو لیجئے جو مرد اور عورت دونوں کیلئے ایک بڑے امتحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد کے خاندان کی اپنی اپنی گھریلو زندگی ہوتی ہے۔ اسکا ایک خاص انداز و طریق ہوتا ہے۔[1] رسم ورواج ہوتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ فقط ہمارا خاندانی طریق زندگی ہی درست ہے۔ والدین کے ساتھ گھر میں رہتے ہوئے ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان ایک خاص قسم کا رشتہ یا دیگر رشتے داروں کے ساتھ خاص قسم کے مراسم بالکل فطرتی بات ہے۔ اخراجات کا حساب کتاب یوں رکھنا چاہیے نہ کہ یوں۔ یہ جائز مصارف ہیں اور اگر یوں کیا تو فضول خرچی تصور کیجائیگی اور یہ کہ بچوں میں ڈسپلین کی عادت ڈالنے کیلئے خاص خاص طریقوں سے کام لینا چاہیئے وغیرہ۔ اگرچہ اس نوع کی سبھی باتوں میں عام ثقافتی رسوم[2] کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے تاہم انفرادی طور پر ایک کنبہ دوسرے کنبے سے بڑی حد تک مختلف بھی ہو سکتا ہے شادی کے بعد میاں بیوی دونوں غیر شعوری طور پر اپنی اپنی جگہ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی خاندانی طرز زندگی کو اپنائیں گے جب انکے طرز ہائے زندگی میں تصادم ہوتا ہے تو شکر رنجی پیدا ہوتی ہے اور دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اسکا اصل سبب کیا ہے۔ ایسی رنجش اس وقت دور ہوتی ہے اور دونوں اسی لمحہ اسوقت محسوس کرتے ہیں جب ایک نئی گھریلو زندگی[3] پیدا ہوتی

[1] Family Pattern. [2] Cultural customs.
[3] Home life.

شروع ہوتی ہے ۔

جب ماں باپ کی متاہل زندگی خوشگوار نہ ہو اور بچہ کی خواہش یہ ہو کہ اسکی اپنی بیاہتا زندگی ان سے مختلف ہو تب بھی خاندانی طرزِ زندگی کی چھاپ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے چاہے وہ غیر شعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ بچے کی شخصیت کی نشو و نما میں نا خوشگوار گھریلو فضا کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ بچہ ہمیشہ ہی ماں یا باپ کی طرف داری کرے ۔ مثلاً ممکن ہے ایک بچی یہ سیکھ لے کہ سبھی مرد بُرے ہوتے ہیں ۔ اور ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے ۔ یا اسے اپنے باپ سے اسقدر ہمدردی پیدا ہو جائے کہ وہ کسی ایسے مرد کو اپنا خاوند سمجھ ہی نہ سکے جسمیں اسکے باپ جیسی صفات نہ ہوں ۔ اسی طرح ممکن ہے لڑکا باوجود اس احساس کے کہ اسکا باپ اسکی ماں کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے یہی مناسب خیال کرے کہ بیوی کو رعب داب ہی میں رکھنا چاہیے ۔

بعض معاشروں میں شادی سے پہلے کافی دولت کا موجود ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے ۔ دولت کمانے یا فراہم کرنے کا بندوبست یا تو خود لڑکا کرتا ہے یا اسکے والدین کبھی کبھار اسکا بوجھ لڑکی کے والدین کے کندھوں پر بھی ڈالا جاتا ہے شادی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری انہیں کو اٹھانی پڑتی ہے ۔ صنعتی معاشروں میں نوکری چھن جانے اور عارضی طور پر بے روزگار ہونے بیمار پڑ جانے اور بڑھاپے میں بے کس رہ جانے کے شدید امکانات ہوتے ہیں ۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ انگلستان اور امریکہ میں حکومت کی طرف سے سماجی بہبودی کے ادارے کھولے گئے ہیں ۔ جنکی بدولت مذکورہ خدشات کچھ کم ہوئے ہیں ۔ دیہی طرزِ زندگی میں ایسے تفکرات نسبتاً بہت کم ہوتے ہیں پاکستان میں مغربی ممالک کی نسبت بڑی عمر کے لوگوں کو یہ فکر دامن گیر نہیں ہے کہ نوجوان یا ان سے زیادہ کارکردگی کے مالک لوگ انکی جگہ حاصل کر لیں گے غرضیکہ ہر سوسائٹی کے چند اپنے مخصوص حادثات[1] اور تقاضے[2] ہوتے ہیں جو شخصیت کو بنانے میں اہم حصہ لیتے ہیں ۔ لیکن زندگی کے یہ مختلف تجربات کسی فرد کو کبھی ادھر اور کبھی ادھر اسطرح نہیں دھکیل سکتے جسطرح کہ فٹ بال کو

1 Life-crises. 2 Pressures

ٹھوکر لگائی جاسکتی ہے۔ انسان موم کا کوئی پتلا تو ہے نہیں کہ اسے جدھر چاہا موڑ لیا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک خوفناک واقعہ بچے کو بے انتہا خوف زدہ کر دے اور اس سے اسکی ساری ہمتیں چھین لے مگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ باحوصلہ اور جواں ہمت بنا دے خاص طور پر جب کہ اسمیں اتنی جرأت ہو کہ وہ پامردی سے اسکا مقابلہ کرسکتا ہے۔ مشکلات ہماری تمام ہمتیں پست کر دیتی ہیں یا ہمیں مزید جواں حوصلہ بناتی ہیں، اسکا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم انکا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ آگے بڑھ کر ان کا رخ موڑ دیتے ہیں یا پیچھے ہٹ جانے میں ہی سلامتی سمجھتے ہیں سپنج[1] کے ٹکڑے کو چاہے آپ کتنا ہی کیوں نہ توڑیں اور مروڑیں چند ثانیوں بعد وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے گرم و سرد تجربات کسی فرد کو متاثر کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ کیلئے اسے ناکارہ بنا دیں۔ علاوہ بریں انسان کوئی تنکا یا پتہ تو نہیں کہ بادِ مخالف کا ہر جھونکا اسے خس و خاشاک کیطرح بہائے جائے۔ یہ درست ہے کہ بعض انسان ساحلِ سمندر پر بھی ڈوب جاتے ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو منجدھار میں بھی نہیں ڈوبتے۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ جس درجہ حرارت پر مکھن پگھل جاتا ہے انڈا اسی پر سخت ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ ماحول کو یکساں کر دینے سے افراد میں مماثلت اور یکسانی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جتنا ماحول کو یکساں کر دیں افراد کا باہمی فرق نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ کند ذہن طلبہ ذہین طلبہ کے مقابلے میں زیادہ وقت پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔ اگر دونوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ایک جتنا وقت لگائیں تو انکے درمیان جو فرق ہے وہ بہت زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر ماں سبھی بچوں کی ایک جیسی نگرانی کرتی ہے یا انہیں ایک ہی طرح کی تربیت دیتی ہے تو فطری اختلاف کے سبب انمیں بڑا فرق ہوسکتا ہے لیکن ہر بچے کی ضرورت کے مطابق اگر وہ اسکی دیکھ بھال کرتی ہے تو وہ گویا سبھی کو بالیدگی حاصل کرنے کے مساوی موقعے دیتی ہے۔ استاد کو یقیناً بعض بچوں کے مقابلے میں بعضوں کے لئے زیادہ تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر وہ

1- Sponge

بچوں کی مدد کرکے اور ذہین بچوں کو نسبتاً نظرانداز کرکے وہ ان میں یکسانی پیدا کرسکتا ہے۔ اگر اسطرح وہ ان سب کو ایک سطح پر نہیں لاتا اور سب کی طرف برابر کی توجہ دیتا ہے تو ان میں بعض بہت آگے نکل جائیں گے اور بعض پیچھے رہ جائینگے۔ پیدائش کے وقت ہی سے یہ بات عیاں ہونے لگتی ہے کہ ایک جیسے ماحول کی طرف مختلف بچوں کا ردعمل مختلف یا جداگانہ ہوتا ہے۔ ماحول اور ورثہ دونوں ان اختلافات کو پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں:۔

امریکہ کا منشورِ آزادی یہ کہتا ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر آزاد اور مساوی ہیں۔ اگر اسکے معنی یہ ہیں کہ انکے جواہر تخلیق یکساں ہیں تو یہ غلط ہے۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو بالکل یکساں ماحول ملنا چاہیے تو یہ بھی صحیح نہیں مثلاً اگر ہم کسی بچے کو جسمیں موسیقی کی صلاحیت بہت زیادہ ہے ایک خاص قسم کا باجا دیں اور ویسا ہی باجا ایک دوسرے بچے کو دیں جو موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہے اور جسے انجنوں اور مشینوں سے دلچسپی ہے تو یہ مساوات و جمہوریت کے منافی ہوگا مساوات اور جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کا بہ حیثیت انسان یکساں احترام ہو اسکو یکساں روح انسانی کا حامل سمجھا جائے۔ اسکی خلقی صلاحیتوں کے مطابق حتی الوسع سازگار ماحول فراہم کیا جائے۔ اگر امریکی منشورِ آزادی کے خوش آیند الفاظ کے یہی معنی ہیں تو ہمیں اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی ہے کہ ہر شخص کو اس کے قد و قامت کے مطابق لباس دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس پر فٹ آجائے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ ہر شخص کو ایک ہی ناپ کے جوتے پہنانے کی سعی کی جائے۔

زندگی کے وہ تجربات جو شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں انفرادی بھی ہوتے ہیں اور ثقافتی بھی۔ جو ثقافتی ہوتے ہیں وہ ہمیں فطری دکھائی دیتے ہیں۔ انفرادیت کا دارمدار ہمارے اپنے انفرادی تجربات پر ہوتا ہے خاص طور پر والدین۔ اساتذہ دوست احباب کا ہمارے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اسکا بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ انفرادی تجربات ہمارے ثقافتی تقاضوں سے ہی متعین ہوتے ہیں اور انکی کسی عام طرز کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ کسی فرد کے انفرادی تجربات اسکے تمدن یا ثقافت سے بالکل جداگانہ نہیں ہوتے۔ ان کا ضرور کوئی نہ کوئی باہمی رشتہ

اور تعلق ہوتا ہے ۔

ایک مثال

شخصیت کی نشو و نما میں اہم حصہ لینے والے عوامل کا ہم ایک مختصر سا جائزہ لے چکے ہیں لیکن اس سے پیشتر کہ ہم اس باب کو ختم کریں یہ دیکھنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایک چینی بچے میں ابتدائی گھریلو ماحول کے سبب ایک خاص صفت کیسے پیدا ہوگئی اور بعد میں ساری بات کو خود سمجھ کر اس نے اسمیں تبدیلی کیونکر پیدا کی ۔ بچے کا بیان یوں ہے کہ میرے والد اس شور کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو ایک چیز کو کسی دوسری چیز پر رگڑنے سے پیدا ہوتا ہے مثلاً میرے والد کو جوتوں گھسٹ کر چلنے سے جو شور پیدا ہوتا ہے سخت ناپسند تھا ۔ مجھے بھی اس شور سے ڈر لگنے لگا ۔ کئی سالوں تک میری بھی کوشش رہی کہ چلتے وقت کسی قسم کا شور نہ ہو ۔ مجھے ایسے جان پڑتا ہے جیسے میں نے اس قسم کے شور سے خوف کھانا ورثہ میں حاصل کیا ہے ۔ مگر کیا واقعی ایسا تھا آئیے ذرا اسکا جائزہ لیں میں اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں ان میں سے فقط میری شکل و صورت ہی والد سے بیحد مشابہت رکھتی ہے سبھی جانتے ہیں کہ میری جسمانی ساخت، ذہانت، ناک نقشہ حتی کہ میری بعض حرکات و سکنات بھی میرے والد سے ملتے جلتے ہیں ۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ یہ لڑکا تو ہو بہو اپنے باپ پر گیا ہے خود امی نے کئی بار مجھے کہا ہے کہ تو تو بالکل ان ہی کی چھاپ ہے ۔

ایسی باتیں سن کر میں نے اکثر فخر سے اپنا سر بلند کیا ہے مجھے یہ معلوم کر کے ازحد خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنے والد سے استفدر مشابہ ہوں میں تین سال کا تھا اور کنڈر گارٹن میں یہ میرا پہلا دن تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد ایک خادمہ کو سلیپر زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چلنے پر بُری طرح ڈانٹ رہے تھے بلکہ یوں کہیئے کہ انکی اس ڈانٹ ہی سے میری نیند کھلی تھی ورنہ میں سو رہا تھا ۔ ناشتہ کے بعد جب والد اپنے دفتر چلے گئے تو میری ماں نے سب نوکروں کو جمع کیا اور تنبیہ کی کہ جب صاحب گھر پر ہوں کسی قسم کا شور نہیں ہونا چاہیئے اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی پاؤں گھسیٹ کر نہ چلے ۔ کیونکہ اس سے انہیں بے انتہا غصہ آتا ہے وہ کانپنے لگتے ہیں اور انکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ میں ماں کی گود میں بیٹھا یہ سب باتیں سن رہا تھا اسی طرح ایک اور موقعہ پر مجھے یاد ہے

کہ ماں نے باورچی کو خوب گھور کر دیکھا تھا اور اسے بچوں کے بل احتیاط سے سیڑھی اترنا پڑی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ میں کب پہلی بار اپنے باپ کیطرح اس قسم کے شور سے خوف زدہ ہوا تھا۔ میں نے بھی ماں سے اکثر یہی کہا کہ اس شور سے میری بُری حالت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے تسلی دی اور کہا کہ کوئی بات نہیں یہ خوف یقیناً تمہیں باپ سے ورثہ میں ملا ہے۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا میرا یہ خوف بھی پختہ ہوتا گیا۔ امی نے سب کو ڈانٹ رکھا تھا کہ میری موجودگی میں بھی کوئی پاؤں گھسیٹ کر نہیں چلے گا اور نہ کوئی گھسٹ گھسٹ کی آواز پیدا کرے گا حتیٰ کہ چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی فرش پر کھلونوں کو گھسنے تک کی ممانعت تھی۔ اور تو اور دادی اماں بھی اس بات کا خیال رکھتی تھیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں مبادا میری نازک حس مجروح ہو جائے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرا ڈر اتنی تیزی سے کیونکر بڑھ گیا کوئی دو سال بعد ہوسٹل کے میرے ایک ساتھی کو اچانک پتہ چل گیا کہ مجھے اس قسم کی آواز سے نفرت ہے اس نے مجھے ستانے اور پریشان کرنیکے لئے ٹوٹے ہوئے قلم کو کھڑکی کے شیشوں پر رگڑنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے ایسا کرنے سے بہت روکا مگر جب وہ نہ رکا تو میں نے جھپٹ کر اس سے قلم چھین لیا اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ اسکے بعد سے میرے سب دوست میری موجودگی میں ایسی آواز پیدا کرنے سے گریز کرتے رہے۔ میں جہاں کہیں گیا میرا یہ ڈر میرے ساتھ گیا حتیٰ کہ جب کالج میں داخل ہوا تب بھی میرے پیچھے لگا رہا۔ ابھی حال ہی میں جب میں نے کہیں یہ پڑھا کہ اعصابی عادتیں[1] موروثی نہیں ہوتیں تو مجھے اپنے ڈر کے متعلق شکوک پیدا ہونے لگے اور میں نے اپنے خیالات کا تجزیہ شروع کر دیا۔ اب میں سمجھا ہوں کہ میں نے اس ڈر کو کیوں اپنایا تھا۔ میں نے اسکو اسلئے اپنایا تھا تاکہ ابا سے میری مشابہت اور زیادہ ہو جائے اور والدین مجھ سے اور بھی زیادہ محبت کرنے لگیں یقیناً جب میں بچہ تھا تو غالباً یہی خیال میرے ذہن میں تھا۔ اسکے علاوہ دوسری پسندیدہ خواہش جو میرے دل میں تھی وہ یہ تھی کہ دوسرے بہن بھائیوں پر برتری کیونکر حاصل کیجائے۔ اب جب میں

1 Nervous Habits.

ان باتوں کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ڈر کو اپنانے کی یہی وجوہات تھیں اب میں نے اپنے خوف کی حقیقت معلوم کر لی ہے لہذا میرا خوف بھی جاتا رہا ہے میرے کمرے کے اوپر جو لڑکے رہتے ہیں وہ میخ دار جوتے گھسیٹ گھسیٹ کر ناچتے رہتے ہیں لیکن اس سے میں قطعاً خوف زدہ نہیں ہوتا ہاں مطالعہ میں ضرور خلل ہوتا ہے۔ آج ہی کالج جاتے وقت میں نے جمعدار کو بیلچے سے برف صاف کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اسکا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں بڑے اطمینان سے اسکے پاس سے گذر گیا حالانکہ اگر وہ تین دن پہلے ایسا ہوتا تو میں غصہ سے بھڑک اٹھتا۔ اب نفسیاتی طور پر میں صحت یاب ہو گیا ہوں۔ اب چھٹیوں میں جب میں گھر جاؤنگا تو بچے نہایت اطمینان سے کھلونوں سے ساتھ کھیل سکیں گے۔ انہیں جدھر چاہیں گے گھسیٹ کر یا کھینچ کر لے جا سکیں گے۔ ڈر ایک دوسرے میں منتقل ہوتا ہے ایک دوسرے سے ورثہ میں نہیں ملتا۔ اس واقعہ کے متعلق ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ ڈر میں موروثی عناصر بالکل نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ اس بچے نے ورثہ میں جو جواہر تخلیق حاصل کیے تھے ان میں کوئی ایسی خاصیت نہ تھی جسکے سبب وہ اس قسم کے شور کے متعلق اتنا حساس ہو گیا تھا۔ اسے یہ خوف باپ سے ورثہ میں نہیں ملا تھا لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انہیں جواہر تخلیق کی بدولت اس نے اپنے باپ سے خاص قسم کی جسمانی اور مزاجی منتہا ہتیں ورثہ میں پائی تھیں۔ انہی منتہاؤں نے اسکے لئے آسان کر دیا کہ وہ باپ سے تعینیت پیدا کر لے اور معاشرتی ورثے کے ذریعے اپنے باپ کا یہ خوف بھی اپنا لے زندگی کے تجربات کو ورثے سے پوری طرح علیحدہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ اگلے باب میں ہم اسی واقعہ کو مزید واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

پانچواں باب

شخصیت پر آموزش کا اثر

آموزش

پچھلے باب میں ہم نے کچھ مخصوص حیاتیاتی اور معاشرتی عوامل کا ذکر کیا ہے جو شخصیت کی نشوونما پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس باب میں اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ ہم معاشرتی ورثہ کیونکر حاصل کرتے ہیں اور ہماری شخصیت زندگی کے تجربات سے کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ دراصل یہ باب آموزش کی نفسیات کے متعلق ہے۔ آموزش سے مراد یہاں انگریزی، اردو، تاریخ، جغرافیہ یا دوسرے مضامین کا سیکھنا نہیں ہے بلکہ عادات و خصائل، شوق و دلچسپی، اندازِ فکر و عمل، پسند و ناپسند، کریکٹر اور شخصیت کے اوصاف کا سیکھنا اور اپنانا ہے۔ بچہ آموزش ہی کے ذریعے اپنے معاشرے کے رسوم و رواج سیکھتا ہے۔ کام کاج کرنے کے ڈھنگ اخذ کرتا ہے اور معاشرہ کے فرد کی حیثیت سے اپنا مخصوص منصب ادا کرنا سیکھتا ہے۔ اور اسی کے ذریعے اسے اپنی شخصی خصوصیات کو ترقی و نشوونما دینا آتا ہے۔

کیا معاشرتی ورثہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ والدین بچوں کو بتا دیں کہ انہیں کیا کرنا ہے

1 How our personalities are formed by learning

2 Learning

اور کیا نہیں۔ کیا والدین خود ہی بچوں کا کردار متعین کر کے انکی شخصیتوں کو کسی خاص قالب میں ڈھال دیتے ہیں؟ یا کوئی اور طریقہ اور اسلوب بھی ہے جو شخصیت کی تعمیر اور بالیدگی پر اندازہوتا ہے۔ کسی حد تک والدین کی اس قسم کی کوشش ضرور اپنا رنگ لاتی ہیں اور بچے کی شخصیت کو مخصوص طریق پر بڑھنے میں مدد دیتی ہیں لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین کی راہنمائی کے بغیر بھی بچے بدستور بڑھتے اور سیکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات انکی آموزش کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ عموماً بچے "حکماً" کم سیکھتے ہیں اور اپنے والدین کی پیروی اور نقل سے زیادہ۔ اگر بزرگ انہیں جھوٹ نہ بولنے کی نصیحت یا تلقین کرتے رہیں اور خود جھوٹ بولنے کے عادی ہیں تو گمان یہی ہے کہ بچے انکی باتوں پر کان نہیں دھریں گے اور بلاتکلف جھوٹ بولیں گے۔ نمونہ پند و نصائح سے بہتر ہوتا ہے۔ اسلئے کسی چیز کو سکھانے کیلئے خود اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

ایک تجزیہ

آئیے اس بچے کے تجزیہ کا پھر جائزہ لیں جسکا ذکر پچھلے باب کے آخر میں کیا جا چکا ہے، اور جو کچھ اس نے سیکھا اسکے چند خاص پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ مذکورہ بالا واقعہ کی غور طلب باتیں یہ ہیں کہ (۱) لڑکے نے باپ کی عادت کی نقل کی۔ حالانکہ اس نے کبھی اسے اس قسم کی آواز سے ڈرنے کیلئے نہیں کہا۔ اور نہ کبھی اسکے متعلق کوئی نصیحت کی یا ہدایت جاری کی۔ (۲) اسکے دوسرے بہن بھائیوں نے اس معاملہ میں باپ کی کبھی نقل نہ کی آخر اسی نے ایسا کیوں کیا؟ پھر باپ ہی کی نقل کیوں کی۔ ماں، آیا یا کسی بڑے بھائی یا بہن کی نقل کیوں نہ کی۔ (۳) بیشتر لڑکوں کیطرح وہ بھی اپنے باپ کا بہت مداح تھا۔ اسکی چھوٹی سی دنیا میں باپ سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر شخصیت تھا۔ وہ باپ کی صرف عزت ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اسے دل سے چاہتا بھی تھا لیکن یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ اسکے باقی بہن بھائی بھی باپ کی عزت کرتے تھے اور اس سے محبت رکھتے تھے۔ (۴) دوسرے لوگ مسلسل اس سے کہتے رہتے تھے کہ تم شکل و صورت اور چال ڈھال میں بالکل اپنے باپ کیطرح ہو۔ ممکن ہے بچے کو حکم دینا بھی اپنی جگہ اہم ہو مگر یہاں یہ دیکھنا ہے کہ بچے کو کچھ کرنے کیلئے نہیں کہا جاتا

اسے تو یہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ کیا ہے' یوں بار بار دھیان دلانے سے اسکے لئے یہ یقین کر لینا آسان ہو گیا کہ وہ واقعی باپ سے پوری طرح مشابہ ہے۔ اسکی فطرت اور باپ کی فطرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیئے کہ باپ سے مماثلت یا عینیت قائم کرنا اسکے لئے بالکل آسان ہو گیا۔ (۵) ہر دم اسکی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے باپ کیطرح بن جائے اس سے اسکو خوشی حاصل ہوتی تھی اور اسکے جذبہ غرور کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ ہم جو کرنا چاہتے ہیں اسکو سیکھنا نسبتاً بہت آسان ہوتا ہے۔ (۶) اسے اپنی طبیعت کے اس امتیازی وصف کے متعلق ایک خاص واقعہ بھی یاد تھا اگرچہ وہ اس وقت صرف تین سال کا تھا اکثر ہم دوسرے واقعات کے مقابلے میں جو زیادہ جاذب نظر نہیں ہوتے یا جنکی ہمارے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی کسی ایک خاص واقعہ سے کہیں زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔ (۷) چونکہ اسے اس قسم کی آواز سے نفرت تھی لہذا دوسرے لوگ اس بات کا خاص خیال رکھنے لگے کہ یہ آواز اسکی موجودگی میں نہ ہو۔ گویا اپنی اس کرامت کے سبب اسے کچھ حاصل ہو گیا۔ (۸) غیر شعوری طور پر اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ باپ سے زیادہ مشابہ ہونے کا "ایک خاص فائدہ" یہ ہوا کہ اسے لوگوں کی خاص نوعیت کی محبت و عنایت حاصل ہو گئی ہے ہمارے بیشتر محرکات[1] شعوری نہیں ہوتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم طبعاً ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی سعی کرتے ہیں جن سے ہمیں کسی نہ کسی طرح کی تسکین و آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ (۹) باوجود اسکے کہ اس خوف و کراہت کے سبب اسکی اپنے دوستوں سے نہیں بنتی تھی مگر اسے ان سے چھٹکارا نہ ملا جونہی اسے اس خوف کے غیر شعوری محرکات معلوم ہو گئے جو اسکے قیام کے باعث تھے نہ وہ خوف رہا اور نہ متعلقہ کراہیت۔ جن عادتوں کی بنیاد چھپے ہوئے محرکات پر ہوتی ہے انکے قائم رہ جانے کا امکان ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ شخص خود ہی انکو ڈھونڈ نہ نکالے۔ اگر دوسرے ان اسباب کی نشان دہی کرتے بھی ہیں تو اسکا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا ۔

1 Motives.

آموزش کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ حیوان ہو یا انسان وہ انہیں کاموں کی طرف جھکتا ہے اور سیکھنے کا "اشتیاق" ظاہر کرتا ہے جن سے اسے فوری تسکین اور آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ تسکین کی ایک صورت یہ احساس ہوتا ہے کہ میں جو کام کر رہا ہوں وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ میری شخصیت اور انفرادیت کے مطابق مجھ سے جن افعال کی توقع کی جاتی ہے میں بعینہٖ وہی کر رہا ہوں۔ تیسرے باب میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح انسان اپنے متعلق اپنے ذہن میں ایک تصور قائم کرتا ہے جو اس کا "تصور ذات" کہلاتا ہے۔ تصور ذات شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بچے کے اندر تصور ذات ۲ یا ۲ سال کی عمر سے ابھرنے لگتا ہے۔ بعض معاشروں میں یہ نسبتاً جلدی اور شدت کے ساتھ بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ اگر والدین مسلسل کسی بچے کا مقابلہ اور موازنہ دوسرے بچوں کے ساتھ کرتے رہیں اور اس کو مختلف صفات سے متصف کرتے رہیں جیسے "تم بہادر ہو" "تم نرے احمق ہو" "تم بڑے ذہین ہو توصیف تم سے کہیں زیادہ لائق ہے۔" "راحیل کی تو کیا بات ہے کس قدر ہوشیار بچہ ہے" "سہیل اپنی بہن سے زیادہ احساس ہے وغیرہ تو تصور ذات آسانی سے ترقی کرتا ہے۔ جس چینی بچے کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس کے تصور ذات میں ابتدا ہی سے یہ احساس شامل ہو گیا تھا کہ میں اپنے والد سے بالکل الگ رہنا جانتا ہوں۔

آموزش کی دو اور مثالیں

پیشتر اس کے کہ ہم آموزش کے اصولوں کا باقاعدگی سے ذکر کریں آئیے آموزش کی دو اور مثالوں کا تجزیہ کریں۔ اس مثال میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچی "نسائیت" کی تعلیم کیسے حاصل کرتی ہے۔ "اور بچہ" "مردانہ صفات" کیونکر سیکھتا ہے پہلی مثال ایک چینی بچی کے متعلق ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ "ہم کین ٹاؤن[1]" میں رہتے تھے جب میں چھوٹی تھی تو اپنے بھائیوں کے ساتھ بلا تکلف کھیلتی تھی۔ اپنی گڑیوں کے ساتھ کھیلنے کے علاوہ وہ ان کے کھیل میں بھی شامل ہوتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہم نے اپنا گھر تبدیل کر لیا۔ ہمارے نئے ہمسائے پہلے ہی دن سے غیر ملنسار سے معلوم ہوتے تھے۔ پھر ایک دن کیا ہوا کہ ہمارا محبوب کبوتر غائب ہو گیا ہمیں شک تھا کہ یہ کبوتر پڑوسیوں کے لڑکوں نے غائب کیا ہے۔ میرے بڑے بھائی معلوم

1 Canton

کرینگی خاطر انکے ہاں گئے تو دیکھا کہ کبوتر کے پر کاٹ لیے گئے ہیں اور خون بہہ رہا ہے ۔ ہمیں بے حد غصہ آیا اور اس تاک میں رہے کہ کب موقعہ ملے اور ان سے بدلہ لیں ۔ ایک دن جب میں اور میری چھوٹی بہن باہر اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھیں تو پڑوسیوں کا ایک لڑکا آیا ۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جھپٹ کر اس نے ہماری گڑیا اٹھائی اور دور کیچڑ میں پھینک کر زور زور سے ہنسنے لگا ۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا کہ تم ذرا ادھر ہٹ جاؤ اور خود چھڑی پکڑ اسکے پیچھے بھاگی اور اسے اس زور سے پیٹا کہ وہ رونے لگا اور بھاگ نکلا ۔ میں نے اس "کارنامے" پر بڑا ناز محسوس کیا کیونکہ وہ مجھ سے کہیں بڑا تھا فخریہ انداز میں اندر جا کر میں نے اپنی آپا کو سب واقعہ من وعن سنایا ۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے شاباش کہے گی مگر مجھے یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ الٹا وہ مجھ پر خفا ہونے لگی ۔ "تمہاری ماں کیا خیال کریں گی کہ تم لڑکوں کیطرح پھرتی ہو" پھر اس نے تنبیہہ کی کہ اس قسم کی باتیں لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں ۔ میں سمجھی آپا بیوقوف ہے' بات کو نہیں سمجھتی ۔ لیکن جب میں نے اپنی ماں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی مجھے بہت ڈانٹا اور کہا آئندہ میں کبھی یہ نہ سنوں کہ تم لڑکوں سے جھگڑتے پھرتی ہو ۔ ذرا اپنے کپڑے تو دیکھو کسقدر مٹی سے اٹے ہوئے ہیں' تمہاری ان حرکتوں سے خاندان کی عزت پر حرف آنیکا خدشہ ہے ۔ تمہارے ابا ایسی باتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے" ۔ ماں کی ان باتوں سے مجھے دکھ ہوا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ انہوں نے ایسا کیوں محسوس کیا ۔ مجھے ماں سے کہنا ہی پڑا کہ کیا آپ خوش نہیں کہ میں نے اپنے سے بڑے لڑکے کو رونے پر مجبور کر دیا ۔ کیا آپ بھول گئی ہیں انہوں نے ہمارا کبوتر غائب کر دیا تھا' اور اسکے پر نوچ ڈالے تھے ۔ ماں نے کہا کہ انہیں سب کچھ یاد ہے مگر پھر بھی انہیں میری اُس حرکت" پر افسوس ہے ۔ ماں کے اس جواب سے مجھے بیحد افسوس ہوا میرا خیال تھا کہ جب بھائی گھر آئیں گے اور میں انہیں یہ سارا قصہ سناؤں گی تو وہ واقعی "فخر" محسوس کریں گے اور سب کچھ سمجھ جائیں گے لیکن میری بات سنکر انہوں نے جو جواب دیا اس نے تو گویا میری کمر ہی توڑ دی "لڑنا جھگڑنا لڑکیوں کے لئے اچھا نہیں ہوتا یہ کام تم ہمارے لیے رہنے دو ہم خود ہی ان سے نپٹ لیں گے ۔ جاؤ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا تمہیں اپنے کیے پر شرم محسوس کرنا چاہیئے" بھائیوں کے یہ الفاظ

میرے دل پر بُری طرح چبھتے رہے اور میں روتے روتے سو گئی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے لڑکوں کے کھیل کبھی نہیں کھیلے فقط اپنی بہن کے ساتھ گڑیوں سے کھیلنے میں ہی سلامتی دیکھی۔ رفتہ رفتہ مجھے صرف لڑکیوں کی چیزیں ہی پسند آنے لگیں میں خاص طور پر اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے لگی اب مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ مجھے لڑکا بننا منظور نہیں میں خوش ہوں کہ میں لڑکی ہوں" ملاحظہ کیا آپ نے کہ اس لڑکی کا "تصورِ ذات" کیسے تبدیل ہوا کس طرح اسکی ساری شخصیت بدل گئی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ "تصورِ ذات" کی تعمیر میں اس بات کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے کہ دوسرے ہمارے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ اگر اپنے اردگرد کے سب لوگ ہمیں ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ کوئی اسے کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ زیرِ نظر واقعہ کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچی نے فقط ایک ہی تجربہ سے بچوں کے سے کام کرنا چھوڑ دیا اور لڑکی بننا جو منظور کر لیا تو اس نے اپنے منصب میں سو فیصدی تبدیلی نہیں کی۔ یہ تبدیلی گویا کلی نہیں بلکہ جزئی تھی کیونکہ وہ پہلے بھی گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی۔ اور اسے معلوم تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اسی وجہ سے جب لڑکا اسکے ہاتھوں پٹ کر رہ گیا تھا تو اسے نمایاں خوشی ہوئی تھی اور فخریہ ہر ایک سے اسکا ذکر کرتی تھی۔

اب اس واقعہ سے بھی زیادہ جاذبِ توجہ واقعہ دیکھئے کہ کس طرح ایک بچہ اپنی "جنس" سے متعلق منصب ادا کرنا سیکھتا ہے اور فقط ایک ہی تجربہ سے اسکی شخصیت کیونکر تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم اس امر کو نہایت سنجیدگی سے بیان کریں گے تاکہ اس قسم کی آموزش میں جو جو نفسیات اصول کارفرما ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جا سکے۔ چنانچہ بورنیو کا یہ باشندہ اپنی کہانی یوں بیان کرتا ہے[1] ۔ میرے والد بڑے نڈر اور خون خوار تھے۔ دور دور تک لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ وہ مجھے بھی اپنے جیسا بہادر اور نڈر بنانا چاہتے تھے۔ ایک روز وہ بوڑھے "بالو لاہنگ"[2] کو جنگل میں گھسیٹ لے گئے اور اسکے ہاتھ پاؤں رتن[3] سے کس کر ایک

1: Quoted in Miller : The child in Primitive Society.

2 Ballo Lahing.

3 Rattans. مشرق الہند کی کھجور سے مشابہ بیل

درخت سے اسے باندھ دیا۔ بالولابنگ ایک کمزور اور اغر غلام[1] عورت تھی جو بڑھاپے اور اندھے پن کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتی تھی میرے والد نے کہا کہ "یہ خون دیکھ کر گھبرانا اور یہ چیخ سنکر ڈرنا" مجھے اس کو زخم پہنچانے کے خیال ہی سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں نے بھالا پکڑنے سے انکار کر دیا لیکن میرے والد نے تحکمانہ انداز میں اصرار کے ساتھ کہا کہ اسمیں کوئی ہرج نہیں تمہیں بھالا مارنا پڑے گا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور مجھے ان کا حکم ماننا ہی پڑا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے، میں درخت کے پیچھے چھپ گیا اور برچھی کی نوک آہستہ سے اسے چھو دی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کیا کہتی ہے دوسری مرتبہ میں نے ذرا زور سے برچھی گھونپی۔ وہ صرف چیختی اور کراہتی رہی اسکے بعد ایک دوسرے لڑکے نے جو مجھ سے بھی چھوٹا تھا اپنی برچھی اسکی ران میں گھسیڑ دی "آہے ننابانی بہت خوب" بوڑھوں نے قہقہہ لگایا پھر ـــ بھر اسکے بعد مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ بوڑھی بولابنگ تھی میں صرف خون دیکھتا رہا۔ میرے والد نے ہماری بڑی تعریف کی خاص طور پر میری کہ "تم بڑے اچھے بچے ہو تم نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ مجھے اس بڑھیا کا کیا دکھ ہو سکتا تھا میرے ذہن میں یہ خیال گھوم رہا تھا کہ میں اپنے والد کا حکم بجا لا کر میں بڑا بہادر اور سورما ہو گیا ہوں۔ اب میں "ہارن بل"[2] کے پر اور جنگلی بلی کے دانت پہن سکتا ہوں یہ ہے طریقہ جواں مرد بننے کا۔ میرے والد ٹھیک کہتے تھے"۔

آیئے اس واقعہ کا تجزیہ کریں۔ "میرے والد بڑے نڈر اور بہادر تھے جن سے دور دور تک لوگ ڈرتے تھے" باپ کی جرأت، بہادری اور شہرت" پر لڑکے کا فخر کرنا قابل غور ہے۔ باپ کیطرح دلیر بننے میں لڑکے کو اطمینان اور تسکین ہوتی ہے۔ لڑکے سے بار بار کہا جا رہا ہے کہ وہ بڑا ہو کر باپ کیطرح نامور بنے گا۔ یہ "توقع" کہ بچہ اپنے باپ جیسے کام کرے گا اسکے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے اور وہ اپنی دنیائے تخیل میں اپنے آپ کو باپ جیسا سمجھ لیتا ہے اور یوں ایک خاص قسم کا "تصور ذات" استوار ہونے لگتا ہے۔ اگر کسی بچے یا بڑے سے ہمیشہ یہ توقع کی جائے کہ وہ قابل اعتماد ہو گا تو قرین قیاس

1. Slave woman. 2. Horn bill.

ہے کہ وہ واقعی بااعتماد ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی بچے کو چور اور بے ایمان خیال کیا جاتا رہے تو اسکے لیے ایماندار بننا بڑا مشکل ہو جائے گا۔

"توقع" کی اثر اندازی کی بہت ہی دلچسپ مثال منڈوگمر[1] قبیلہ میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیدائش کے وقت جس بچہ کی گردن کے گرد آنول نال[2] لپٹی ہوئی ہوتی ہے وہ فطری آرٹسٹ ہوتا ہے۔ ایسے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی اس صلاحیت کو نشوونما اور ترقی دے سکیں لیکن دوسرے بچوں کا حوصلہ یہ کہہ کر پست کر دیا جاتا ہے کہ تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس اعتقاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے سچ مچ آرٹسٹ بن جاتے ہیں چنانچہ انہیں نتائج کو دیکھ کر اس عقیدہ پر ان کا ایمان اور پختہ ہو گیا ہے "خود سے پوری ہونے والی پیشین گوئی"[3] اسی کو کہتے ہیں جس کا اطلاق ہماری شخصیت کی تعمیر پر ہی نہیں ہوتا بلکہ روزانہ کے کاموں پر بھی ہوتا ہے مثلاً اگر لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ فلاں "تعویذ" سے ہماری دولت میں اضافہ ہو جائے گا تو امکان ہے کہ وہ پورے اعتماد سے کام کریں اور واقعی دولت مند ہو جائیں گے۔ جس لڑکے کو یقین ہے کہ وہ فیل ہو جائے گا اسکے گھبرانے اور ہمت ہار بیٹھنے کے زیادہ امکان ہونگے۔ اسی طرح اس پالینیشن[4] کی مثال پیش نظر رکھیے جو سردار قبیلہ کا جھوٹا کھانا کھانے سے مر گیا تھا۔ ہمارے متعلق ہماری اپنی رائے دوسروں کی رائے سے تقویت حاصل کر کے ہم پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ مندرجہ بالا مثال میں صرف "توقع" اس بچے کو نڈر اور بہادر نہیں بنا سکتی تھی لیکن یہی توقع دوسری نفسیاتی قوتوں کے ساتھ مل کر ایک زبردست قوت بن جاتی ہے اب آگے بڑھیے "ایک دن وہ بوڑھی بالولاہنگ کو جنگل میں گھسیٹ لے گئے اور اس کو ایک درخت کے ساتھ کس کر باندھ دیا" گویا ایک ایسا موقعہ پیدا کر دیا گیا جس میں بچہ خود اپنے فعل سے سیکھ سکتا ہے بشرطیکہ

---

1. دیکھیے چوتھا باب 2. Birth Cord.

3. Self-full-filling prediction ایسی بات جس کے متعلق پیشین گوئی کر کے اس کے وقوع کے امکان کو بڑھا دیا جائے

4. Polynesian (Chapter 2)

اس فعل سے اسے آسودگی اور تسکین ملتی ہو۔ ایسے افعال خالی نصیحتوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

"میرے والد نے کہا ہمیں خون دیکھ کر گھبرانا اور چیخ سن کر ڈرنا نہیں چاہیئے" کسی بات کا کہنا یا سننا تعلیم و تربیت کا جزو ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ اسکا مقصد بچہ کو آئندہ تجربہ کے لئے تیار کرنا ہو پھر یہ بتانے والا اس کا باپ تھا۔ سب سے زیادہ باوقار محترم اور اسکے لئے بے حد محبوب ہستی!

"میں نے برچھا پکڑنے سے انکار کر دیا مگر میرے والد نے کہا کہ نہیں تم کو برچھا پکڑنا ہوگا" یہاں باپ کا رعب و اثر استعمال کیا جا رہا ہے۔ بچہ عموماً ایسے کام ضرور کرنے کی عادت ڈالتا ہے جن کے متعلق باپ تاکیداً حکم دیتا ہے یہاں لڑکے کو یہ بھی احساس ہے کہ اگر میں نے باپ کا حکم نہ مانا اور یہ کام نہ کیا تو مجھے اسکی سزا ملے گی اسلئے کہ اس علاقہ میں اسکے باپ کی کوئی شخص حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔

"انہوں نے کہا اسمیں کوئی حرج نہیں یہ بالکل جائز اور درست ہے تمہیں ضرور برچھا پکڑنا ہوگا" یہاں باپ صرف اپنا رعب واثر ہی استعمال نہیں کر رہا بلکہ ایک برے فعل کو مستحسن ٹھیرا رہا ہے۔ اسکو تعلیم دی گئی ہے کہ بعض چیزیں بری ہوتی ہیں اور بعض جائز اور درست اگرچہ یہ فعل اسے نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً یہ ایسا نہیں ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہی باپ جس کا وہ اتنا مداح اور شیدائی ہے قتل کو "مناسب" یا "جائز" قرار دے رہا ہے۔

"انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور مجھے حکم ماننا پڑا" لڑکے کے ذہن میں کشمکش جاری ہے وہ برضا و رغبت قتل کیلئے آمادہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو اس فعل پر مجبور کیا جا رہا ہے صورتِ حال ہی ایسی ہے اور اسے زبردستی اسمیں دھکیلا جا رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار لڑکا نہیں اسکا باپ ہے۔

"مجھے خوف تھا کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ میں درخت کے پیچھے چھپ گیا اور آہستہ سے برچھی کی نوک اسے چبھودی دوبارہ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتی ہے میں نے ذرا زور سے برچھی چبھوئی" بھالا لڑکے کے ہاتھ میں ہے اور عورت سامنے۔ اسکی خواہش، تجربہ اور تجسس نے باقی کام خود ہی کر دیا۔ تجسس انسان کی فطرت میں ہے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ "یہ کیا ہوتا ہے" "وہ کیا ہے" چیزوں کو چھونے اور پرکھنے کی وہ اکثر و بیشتر سعی کرتا ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لڑکا اپنے تجسس کے سبب ظلم سے تسکین حاصل کرنے کی ابتدا کر رہا ہے۔

"پھر ایک دوسرے لڑکے نے جو مجھ سے بھی چھوٹا تھا اپنا بھالا اسکی ران میں چبھو دیا۔ بڑوں نے قہقہہ لگایا "ایسے! شاباش! بہت خوب"۔ اگر یہ حالات کسی دوسرے موقعہ پر پیش آتے تو لڑکا اپنے ساتھیوں سے خوف اور نفرت کرنے لگتا لیکن یہاں اسکے غرور اور خود پرستی کو ابھارا جا رہا ہے۔ خوف اور نفرت یہ دیکھ کر دب جاتے ہیں کہ اس سے چھوٹے لڑکے نے ایسا کام کر دکھایا ہے۔ اس کے اندر بھی بزرگوں کی تحسین و آفرین حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی! اسکے علاوہ دوبارہ اس کام کو "اچھا" کہہ کر سراہا گیا!

اس کے بعد مجھے دھیان بھی نہیں رہا کہ یہ بالولاہنگ ہے، میں صرف خون دیکھنا "۔" لڑکے کی توجہ بالولاہنگ سے ہٹا کر خون کی طرف لگا دی جاتی ہے۔ ہماری توجہ جدھر ہوتی ہے ہم وہی سیکھتے ہیں۔ "تب میرے والد نے ہماری بڑی تعریف کی خاص طور پر میری اور کہا کہ تم بڑے اچھے بچے ہو۔ تم نے بڑا اچھا کام کیا ہے"

دوسرے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اظہار خوشنودی یا پسندیدگی کتنی موثر اور زبردست قوت ہوتی ہے "پھر مجھے اس بوڑھی خادمہ کا کیا دکھ ہو سکتا تھا" گویا اسکے نزدیک بوڑھی بالولاہنگ نہ تو وہ دایہ رہی تھی جس نے اسکی پرورش کی تھی اور نہ کوئی قابل رحم بے کس بوڑھی عورت۔ بالولاہنگ کی حیثیت اب محض ایک "پرانی بے کار چیز" سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نئے رجحانوں کی آموزش کا سوال چیزوں کو نئی طرح آراستہ کرنے کے سوا کچھ اور نہیں۔ جماعت بندی[1] کا عمل ایک ایسا عمل ہے جسمیں ہم چیزوں کو جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کرکے ایک خاص نام دے دیتے ہیں پھر ہر چیز کو انفرادی طور پر سمجھنے کی بجائے پوری جماعت یا گروہ کو خاص صفات سے متصف کر لیتے ہیں مثلاً ہم سے کہا جاتا ہے کہ سکھ یا یہودی ہمارے دشمن ہیں۔ اب ہم ہر سکھ یا یہودی کو ایسا ہی سمجھ بیٹھتے ہیں اور اسکو اسی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ جب بھی ہم کسی کو اپنا "دوست" یا "دشمن" کہتے ہیں تو ہم اسے بلا وجہ دوست یا دشمن نہیں کہنے لگتے بلکہ اسے ایسا کہنا سیکھتے ہیں۔ زیر مطالعہ لڑکا بھی قتل کو یقیناً درست سمجھنا سیکھ رہا ہے۔

"میرے ذہن میں صرف یہ خیال گھومتا رہا کہ میں اپنے والد کا حکم بجا لایا ہوں "میں ایک بڑا سپاہی ہو رہا ہوں (دنیا تصور ذات ابھر رہا ہے) ہرن بل کے بڑا اور وحشی بلی کے دانت پہن سکتا ہوں"۔ اب اس لڑکے کی توجہ خون "

1 Classification

اور ظلم سے ہٹ کر اسکی اپنی نیکی اور اچھائی کی طرف اور انعام کیطرف بند دل ہو رہی ہے۔ انعام کا مطلب ہے آسودگی اور تسکین۔ اور تسکین ہی آموزش کو سہل بناتی ہے یہ ہے طریقہ جواں مرد بننے کا لڑکے کا تصورِ ذات اب بدل چکا ہے اس سے پہلے وہ خود کو ایک چھوٹا سا بودا اور شرمیلا بچہ سمجھتا تھا مگر اب وہ بہادر اور سورما بن گیا ہے۔ ایک جوان مرد۔ ہم اپنے آپ کو جیسا خیال کرتے ہیں ویسا ہی عمل بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے تصورِ ذات کی کرشمہ سازی۔

"میرے والد ٹھیک کہتے تھے" اسکی تعلیم کے مکمل ہونے میں اب کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ والدہ کی باتوں پر ایمان پختہ اور راسخ ہو گیا ہے۔ بچے کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آ چکی ہے اب وہ اپنی نئی استوار کردہ راہوں کی سمت بڑھے گا۔

مندرجہ بالا تین مثالیں نہایت خوبی سے یہ واضح کرتی ہیں کہ شخصیت میں کیا کچھ تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی:

پہلی مثال یہ ظاہر کرتی ہے کہ چینی بچے نے کسطرح اپنے باپ کا ایک خاص وصف چن لیا اور ایک مدت تک اسے اختیار کیے رکھا۔ دوسری اور تیسری مثال میں متعلقہ اشخاص کی شخصیتوں میں جو مستقل تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن بتدریج نشو و نما پانے سے بچے کے کردار میں آئے دن جو فرق پڑتا ہے کیا اسکے متعلق بھی ہم کچھ کہہ سکتے ہیں؟ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ جہاں تک کسی بھی تمدن کو سیکھنے اور اپنانے کا تعلق ہے سبھی بچے یکساں صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم ان ہی سے ہر ایک چند ہی سالوں میں گفتار رمز و کنایہ کے مختلف انداز سیکھ لیتا ہے متعدد ایسی رسوم، خیالات، عقائد، اقدار، رجحان احساس اور پسند و ناپسند کے انداز سیکھ لیتا ہے جو فقط اس کے اپنے تمدن سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسرے تمدنوں سے بڑی حد تک مختلف ہوتے ہیں وہ کونسا ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک بچہ تو قبائلی پٹھانوں کی سی زندگی اختیار کرنا سیکھ لیتا ہے اور دوسرا بچہ سائبیریا کے کسان لندن کے ایک وکیل کی سی طرزِ رہائش کو اپنا لیتا ہے وہ کیونکر ایک محدود مدت میں اس قسم کی زندگی کا جزو بن جاتا ہے۔

آموزش کے متعلق چند اور حقائق

بعض اوقات آموزش سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ سکول یا کالج میں چند حقائق[1] کو ازبر یاد کر لیا جائے یہ

[1] FACTS

آموزش اس قسم کی ہوتی ہے کہ امتحان دینے والا امتحان کے فوراً بعد سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن سکول میں بھی یہ کوئی اہم آموزش تصور نہیں کی جاتی کیونکہ اگر اسی کو اہم سمجھ لیا جائے تو تعلیم کی کوئی حقیقی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اسکے رسوم رجحانات۔ اعتقادات پسند اور ناپسند کا سیکھنا حقائق کو زبانی یاد کرنے سے کہیں زیادہ بامعنی اور اہم ہیں۔

یقیناً بعض اوقات ہم شعوری محنت سے کچھ سیکھتے ہیں لیکن اکثر غیر شعوری طور پر بھی ہم بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں ممکن ہے جب کوئی بچہ پہلی بار سکول جائے تو یہ جاننے کے لئے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں دوسرے بچوں کی طرف غور سے دیکھے یا کوئی غیر ملکی اس ملک کی رسوم کو سیکھنے کی بہت کوشش کرے جسمیں وہ قیام پذیر ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے ملک کے تمدن کو سیکھنے کے لئے کوئی مخلص کوشش نہیں کرنی پڑتی یہ تو خود بخود فطرتی طور پر ہم اخذ کرتے چلے جاتے ہیں ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم اسے اپنا لیتے ہیں۔ غیر زبان سیکھنے کے لئے ہم کسقدر محنت کرتے ہیں لیکن اپنی زبان ہم یوں سیکھتے جاتے ہیں کہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم کوئی زبان سیکھ رہے ہیں آخر اس تمام آموزش کا راز کیا ہے؟ تقلید[1] اور القاء[2]۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ بچے ماں باپ، اور گرد و پیش کے لوگوں کی تقلید کرنا فطری ہے بلی کا بچہ بھی ماں کی دیکھا دیکھی چوہے پکڑنا سیکھ جاتا ہے عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بچہ القاد کے ذریعے اپنے معاشرہ کی ثقافت اپنانا سیکھتا ہے۔ اسی کے ذریعے والدین یا دوسرے لوگ اپنے خیالات، احساسات اور رمز و کنایہ[3] غیر شعوری طور پر بچوں تک منتقل کرتے جاتے ہیں۔ مگر تقلید اور القاد کے معنی کیا ہیں؟ یہ درست ہے کہ بچے بڑوں کے کردار کی نقل کرتے ہیں۔ اور ہم عمر بچوں کی تقلید بھی عام ہے۔ اسی طریق سے وہ معاشرتی رویئے کے متعلق بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ذرا بچوں کو دیکھئے کہ زبان سیکھتے وقت وہ نہ صرف وہی لفظ استعمال کرتے ہیں جو والدین استعمال کرتے ہیں بلکہ انہیں کے لب و لہجہ بھی انکو ادا بھی کرتے ہیں۔ انسان اکثر ایک دوسرے کے متعلق بہت حساس واقع ہوا ہے۔ اور احساس و فکر کے انداز عموماً غیر شعوری طور پر ہی دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے ایسے اسباب و حالات ہیں جنکے

1 Imitation 2 Suggestion 3 Gestures.

تحت تقلید اور القاء فعال ہوتے ہیں بچے اپنے گردوپیش کے سبھی کردار کی نقل تو نہیں کرتے اور نہ احساس و فکر کے سارے طریقے القاء کے ذریعے ایک شخص سے دوسرے تک منتقل ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ آموزش کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم تو ہے کہ ہم کوئی ایک نیا فعل یا کوئی فعل سیکھیں جیسے کوئی نئی آواز نکالنا۔ فقرہ بولنا یا چمچہ سے کھانا کھانے کی کوشش۔ عام طور پر اس قسم کی آموزش کو آموزش بذریعہ سعی[1] و خطا کہا جاتا ہے آموزش کی دوسری قسم وہ ہے جسمیں کسی سیکھی ہوئی چیز کو نئے طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے جیسے بچہ رفتہ رفتہ یہ سیکھ جاتا ہے کہ "ما" کے معنی "ماں" کے ہیں۔ اسے آموزش بہ تلازمہ[2] کہتے ہیں بعض اوقات اسے مشروط[3] آموزش بھی کہا جاتا ہے۔ اسمیں سینکڑوں قسم کے معنی۔ احساس اور اشارات و کنایات وغیرہ کا سیکھنا شامل کیا جا سکتا ہے

آموزش کی ان دونوں قسموں کو بالکل علیحدہ علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ اکثر دونوں ساتھ ہی ساتھ چلتی ہیں

عمر کے ابتدائی چند ایام میں بچے کے پاس صرف گنتی کی چند مہارتیں[4] ہوتی ہیں مثلاً وہ رو سکتا ہے سانس لے سکتا ہے دودھ چوس سکتا ہے اپنے بازو اور ٹانگیں ہلا سکتا ہے علی ہذا القیاس لیکن جلد ہی وہ کئی نئی مہارتیں حاصل کر لیتا ہے۔ داخلی نشوونما[5] کے ساتھ وہ گھسٹنا بیٹھنا چلنا اور دوڑنا سیکھ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ پڑھ سکتا ہے گھڑی دیکھ کر وقت بتلا سکتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے آداب اور رسوم کے مطابق کھانا کھانا کپڑے پہننا۔ سلام کرنا اور دائیں بائیں ہاتھ سے مناسب کام لینا سبھی کچھ سیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

تحصیل شدہ کاموں میں ردوبدل کر کے یا انہیں نئے طریقے سے استعمال کر کے وہ کئی نئے طریقے بھی سیکھ جاتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص خارجی اور معاشرتی ماحول میں ایسے ایسے کام چن لیتا ہے جو اس کی ضرورتوں کو خاص طور پر پورا کرتے ہیں۔ وہ کسی فرد کے کردار کو محض نقل ہی نہیں کر سکتا ہے بلکہ نیا کام کرنے کی ہمت بھی کرتا ہے۔ ممکن ہے کبھی اتفاق سے جب وہ کسی پرانے کام کی مدد سے کوئی نیا کام کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اپنے گزشتہ فعل کو دہرائے گا۔ نئی مہارتیں پرانی اور حاصل شدہ مہارتوں کی بدولت ہی سیکھی جا سکتی ہیں لیکن کوئی مہارت اسی وقت چابک دستی سے استعمال کی جا سکتی ہے جب

1. Trial and error learning 2. Association.
3. Conditioning. 4. Skills. 5. Maturation.

اسے اچھی طرح سیکھا جا چکا ہو۔ پرانی مہارت پر پوری طرح قدرت حاصل کئے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ شیر خوار ہوں یا بچے جوان ہوں یا بوڑھے کوئی بھی ہو نئی وضع کے کردار کو کامیابی سے نقل کرنے کے لئے اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اسے سیکھے۔ ہم انہیں مہارتوں کو سیکھتے ہیں یا سیکھنے کی انتہائی سعی کرتے ہیں جو ہمیں آسودگی بہم پہنچاتی ہے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں کس قسم کی آسودگی مہیا کرتی ہیں۔ دوسرے باب میں جہاں ہم نے یہ بتایا ہے کہ لوگ مختلف رسوم کی کیوں پیروی کرتے ہیں ہم نے ان آسودگیوں کا ذکر کیا ہے جو ہمارے افعال کی محرک ہوتی ہیں جسمانی معاشرتی اور جمالیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے انداز بھی سیکھے جاتے ہیں اور معاشرہ کی تحسین حاصل کرنے اور طنز سے بچنے کے طور طریقے بھی۔ اسی طرح ہم وہ کردار استوار کرنا بھی سیکھتے ہیں جو ایسے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ہماری مدد کرتا ہے جنکی ہماری ذات سے توقع کی جاتی ہے۔ یا جنہیں ہم مناسب سمجھتے ہیں اور جن کو ادا کئے بغیر شخصی وقار کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے

اگرچہ یہ درست ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں کو تسکین پہنچانے کے گوناگوں طریقے سیکھ لیتے ہیں لیکن کیا ہم نت نئی ضرورتیں وضع کرنا نہیں سیکھتے اور کیا ہم نو بہ نو چیزوں کی خواہش رکھنا نہیں سیکھتے؟ یقیناً ہماری اکثر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمیں نئی نئی چیزیں میسر ہوں لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ

آموزش کا ایک اہم پہلو

ہماری آموزش کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری پسند و ناپسند دلچسپیوں اور رجحانوں میں اضافہ ہوتا ہے اور انکو حاصل کرنے اور سیکھنے کی خواہش تیز تر۔ اب بچے کی احتیاجات کا اسکے والدین کی احتیاجات سے مقابلہ کریں۔ یا اسکے والدین اور کسی دوسرے معاشرے یا قوم کے متعلق لوگوں کی احتیاجات کا باہمی موازنہ کیا جائے تو انکے مابین جو فرق ہے وہ واضح ہو جائے گا اور نمایاں طور پر نظر آئے گا۔

نوزائیدہ بچے کی گنتی کی چند ایک احتیاجات ہوتی ہیں۔ دراصل اسے کسی خاص چیز کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اسکی ضروریات کا تعلق اسکی خوراک، آرام، ہوا اور ورزش سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اسکے خصائل نے کے بھی مخصوص طریقے ہیں مثلاً وہ چاہتا ہے سانس لے۔ لوٹے۔ وہ بیٹھے یا سو جائے لیکن جلد ہی

1 Wants.

اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسکی یہ ضرورتیں چند مخصوص طریقوں سے پوری ہوتی ہیں۔ مثلاً شروع شروع میں اسکا جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ چوسے چنانچہ ماں کا دودھ چوسنے سے اسے تسکین حاصل ہوتی ہے لہذا اب اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے ماں کا سینہ ملے بلکہ دودھ بھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ماحول کی بہت سی چیزیں چاہنے لگتا ہے اور نئے نئے تجربے حاصل کرنا چاہتا ہے مثلاً اسکا جی چاہتا ہے کہ اسے متعدد کھلونے ملیں، ہمیشہ ماں اسکے ساتھ رہے جب وہ ذرا اور بڑا ہو جاتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ پہننے کو خاص خاص کپڑے ملیں۔ اور سواری کے لئے اچھا سا سائیکل، بالغ ہونے پر اسے رفیق حیات، ملازمت اور گھر کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ خواہشات کے متعلق سوچنے کی بجائے ہم اکثر جن چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انکے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم اپنی بھوک مٹانا چاہتے ہیں بلکہ ایسے موقعوں پر ہم کھانا کھانیکی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور وہ بھی اس انداز سے کہ کسی خاص چیز کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ یہ بات سیکھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے کہ ہم اپنی حیثیت اور معاشرے کے مطابق کونسی چیز منتخب کریں اگر ہم کراچی کے تاجر ہیں تو ہماری خواہش ہوگی کہ دوسرے تاجروں کی طرح ہمارے پاس بھی کار ہو۔ قبائلی علاقے سے اگر ہمارا تعلق ہے تو کوئی اور چیز حاصل کرنیکی بجائے ہم رائفل حاصل کرنے کی سعی کریں گے، اسی طرح ایک عالم آدمی اپنے مرغوب مضمون کے متعلق نئی سے نئی کتاب خریدے گا۔ کرکٹ کا کھلاڑی کرکٹ کا بیٹ، ایک لڑکی کوئی خوبصورت سی گڑیا، اور کپڑوں کی شوقین عورت کوئی نیا لباس، علاوہ بریں ہماری یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ ہم کوئی ڈگری۔ کوئی ڈپلوما یا اعزاز کی جگہ حاصل کرلیں یا کم از کم کوئی بڑا آدمی مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھ ہی لے۔ گویا چند اشارے اور انکی اہمیت جاننا اور انہیں سیکھنا بھی ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ ہماری بعض احتیاجات صرف انفرادی حیثیت کی ہوتی ہیں۔ انکا تعلق صرف ہماری ذات سے ہوتا ہے لیکن انکی تعداد ان احتیاجات کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے جو ہم میں اور دوسرے لوگوں میں مشترک ہوتی ہیں۔ مثلاً جب تک ہم مردم آزار قبائل سے تعلق نہ رکھتے ہوں ہم کبھی انسانوں کا شکار کرنا گوارا نہیں کریں گے۔ گھر گرہستی والی عورت سے یہ توقع کہ وہ سپورٹس ٹرافی کی خواہش ظاہر کرے۔ عام

Symbols: Sports Trophy

طور پر ہم انہیں باتوں پر سوا توجہ دیتے ہیں جنہیں ہمارے معاشرے کے دوسرے لوگ بھی دلچسپی رکھتے ہوں تاکہ معاشرہ کے چند ایک افراد سے نمایاں پہچان[1] ہو جائے :

چند خواہشات بالیدگی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر ہی سیکھی جا سکتی ہیں مثلاً جب تک بچہ اس قابل نہیں ہو جاتا کہ وہ ماں کے چہرے کو غور سے دیکھ سکے وہ ماں سے مسکراہٹ کی خواہش اور اسکی ضرورت کو نہیں پہچان سکتا - جب تک بچے کے جسم میں چند ایک فعلیاتی تبدیلیاں[2] پیدا نہ ہوں اسمیں مخالف جنس کے قرب کی خواہش نہیں ابھرتی - انہیں تبدیلیوں کے بعد وہ مخالف جنس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اسکا قرب حاصل کرنا اس کے لئے آسان ہوتا ہے - جنسی خواہش کا اظہار عام بے چینی کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے لیکن جلد ہی وہ کسی ایک فرد یا افراد کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے :

بعض اوقات کسی چیز کے لئے شدید طلب[3] فقط اکتسابی ہوتی ہے مثلاً ایک فرد کسی نشہ آور شے کی معمولی سی مقدار کھا لیتا ہے یا ٹیکے کے ذریعے جسم میں داخل کر لیتا ہے ممکن ہے یہ حرکت اس نے محض تجسس کی غرض سے یا کسی یار دوست کے اصرار پر کی ہو - اس سے اسے ایک خاص آسودگی حاصل ہوتی ہے اور وہ دوبارہ اسے استعمال کرتا ہے - رفتہ رفتہ وہ اسکا اسقدر عادی ہو جاتا ہے کہ اسکے بغیر اسے کسی طرح آرام نہیں ملتا اور اسے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر قسم کی ضد کرتا ہے - ایک شرابی کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے کسی طور شراب نہ ملی تو اس نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا تاکہ خون بند کرنے کے لئے اسپرٹ آئے گی تو وہ اس کے چند گھونٹ پینے کی کوشش کرے گا چنانچہ جب الکحل کی بوتل آئی تو اس نے پھرتی سے اسے اچک لیا اور غٹا غٹ پی گیا - بعض سگریٹ نوش بھی اسی قسم کی "طلب" کا اکثر ذکر کرتے ہیں - ہو سکتا ہے کہ اس نوع کی شدید طلب فرد مذکور کی کوئی طبعی یا نفسیاتی ضرورت پورا کرتی ہو اور اسے آسودگی بہم پہنچاتی ہو مگر ہر حالت میں رفتہ رفتہ اسکی عادت پڑ جاتی ہے - یہ ضروری نہیں کہ تجربے اور وقت سے ہماری خواہشات پختہ تر ہی ہوں وہ کمزور بھی ہو سکتی ہیں اور بالکل مٹ بھی سکتی ہیں - مثلاً ایک بالغ مرد کیلئے بچوں کے کھیلوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی

1 Recognition. 2 Physiological Changes 3 Craving

ایک باپ بچے کو اکثر ایسی باتوں کے لئے جھڑکتا ہے جو عمر کے اس حصے میں وہ خود کیا کرتا تھا۔ مختلف افراد موسیقی، غذا اور رنگوں کے لئے ہماری پسند اور ناپسند یقیناً اکتسابی ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتی اور استوار ہوتی ہے کچھ سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی خواہش ہو اور پھر اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنے کی ایک نئی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ خواہشات سے خواہشات جنم لیتی ہیں لیکن ان ہزاروں قسم کے تلازمہ کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں جو ہم روز زندگی میں بناتے رہتے ہیں۔ کیا وہ سبھی کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ یہ تو ہم ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ واقعی ہماری گوناگوں ضرورتوں کو تسکین پہنچاتے ہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تلازمہ کے یہ سلسلے ایک دوسرے ہی کے ذریعے وجود میں آتے ہیں اور ان سب کی تہ میں "عینیت" کا ضرور کچھ دخل ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے ہم عموماً "عینیت" قائم کرتے ہیں، انہیں کے اشارات اور کنایات۔ احساسات اور جذبات کا اپنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ شعوری طور پر ہر بات میں انکی تقلید کی جائے لیکن اطمینان اور سکون ہم اسی وقت محسوس کرتے ہیں جب ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم انہیں کی پیروی کر رہے ہیں، وہ گویا ہمارے لئے "معیار" کا رتبہ رکھتے ہیں انکا کردار ہمارے لئے مثالی کردار ہوتا ہے۔ اور ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس مثالی کردار پر پورے اتریں ورنہ آسودگی بھی میسر نہیں آتی اور نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے درست کام کیا ہے۔ ماں اور بچہ اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ یونہی ماں کی نظر بچے کے جسم یا کپڑوں پر لگی ہوئی مٹی پر پڑتی ہے اور اسے کوفت محسوس ہوتی ہے۔ بچہ ماں کے اس ناپسندیدگی کے احساس کو بھانپ لیتا ہے اور اگر اس سارے تجربے میں تاثر شدید نوعیت کا ہو تو ہو سکتا ہے بچہ اپنی ساری زندگی اس چیز کو پھر کبھی رغبت سے نہ کھا سکے جو اس وقت اسکے سامنے ہے۔ اپنے اپنے معاشرے اور تمدن کے تعصبات[1] کچھ اسی طرح سیکھے جاتے ہیں۔ مختلف طبقوں اور معاشروں میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور خوب صورتی اور بدصورتی کے معیار بھی غالباً اسی طرح وضع ہوتے ہیں۔ جب ایک گروہ کے چند لوگ اپنے گروہ کے دوسرے لوگوں کی طرح محسوس کرتے، سوچتے یا عملی اقدام اٹھاتے ہیں تو انہیں خوشی ہوتی ہے اور وہ اپنے مال و جان کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض اوقات "عینیت" کا احساس زندگی برقرار رکھنے کی خواہش سے بھی زیادہ مضبوط

1_ Prejudices.

ہوتا ہے جب رچرڈسن اپنی ناول نگاری سمارہارلو[1] لکھ رہا تھا اور وہ بالاقساط ایک رسالے میں چھپ رہا تھا تو ایک لڑکی کے والد نے اسے متعدد خط لکھے کہ ناول کی ہیروئن کو زندہ رکھا جائے اسے مرنے نہ دیا جائے کیونکہ اسکی اپنی بیمار بچی نے ہیروئن کے ساتھ اتنی شدید عینیت قائم کر لی تھی کہ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اگر ناول کی ہیروئن مرگئی تو وہ بھی نہ بچے گی۔ اسے اپنی زندگی اتنی عزیز نہ تھی جتنی یہ خواہش کہ کہیں ہیروئن کے ساتھ عینیت ٹوٹ جائے۔

ایک ضروری سوال

کیا عینیت کا اصول ہمارے خیالات، عقائد اور آراء پر کلی طور پر حاوی ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم سیکھتے ہیں عینیت اسکی وضاحت کر سکتی ہے؟ کیا ہم صرف وہی چیز سیکھتے ہیں جو ہماری کسی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور ہمیں آسودگی مہیا کرتی ہے کیا جو بات صحیح یا درست ہو یا جس کی صحت کے متعلق ہمیں یقین دلایا جا رہا ہو اسے ہم نہیں سیکھتے؟ آیئے جو کچھ ہم اسکول میں سیکھتے ہیں اسکا جائزہ لیں۔ غالباً یہ کہنا بالکل درست ہے کہ مدرسہ میں ہم جو سیکھتے ہیں اسکا بیشتر حصہ محض امتحان پاس کرنے کے لئے یاد رکھا جاتا ہے گویا ایسی آموزش طالب علم کی شخصیت کا حصہ نہیں بن پاتی۔ نسبتاً کم پڑھے لکھے غریب امریکی والدین کا ایک بچہ ہمیشہ غلط انگریزی لکھتا تھا۔ آخر ایک دن استاد نے تنگ آ کر اسے یہ سزا دی کہ وہ چھٹی کے وقت گھر نہ جائے اور وہیں بیٹھ کر گرامر کے اصول کے مطابق صحیح فقرہ سو دفعہ لکھے پھر گھر جائے جب لڑکا سو دفعہ یہ صحیح فقرہ[2] لکھ چکا اور گھر جانے لگا تو استاد کے نام اپنی طرف سے اس نے جو فقرہ لکھا تھا اسمیں وہی غلطی[3] پھر کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئیے کہ درست انگریزی لکھنے کا اسکے ہاں "وسنو" نہ تھا وہ اپنے ماحول کا ایک جز بن گیا تھا اور اس سے باہر نکلنا اسکے لئے آسان نہیں تھا۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسکول میں وہی چیز سیکھتے ہیں جو ہماری شخصیت کا حصہ بن سکے یہ بات نہیں ہے اسکول کی زندگی میں ہم مستقل اہمیت کی چیزیں بھی سیکھتے ہیں لیکن یہ وہی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں ہم "مفید" پاتے ہیں۔ مثلاً ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ آٹھ اور چار بارہ ہوتے ہیں اسلئے نہیں کہ دوسرے بھی کہتے ہیں بلکہ اسلئے کہ آٹھ آنے اور چار آنے سے ہمیں وہی چیزیں مل جاتی ہیں جو بارہ آنے میں ملتی ہیں۔ یوں یہ صحیح حساب کرنے سے ہمیں

1. Clarissa Harlowe: Richardson

2. "I have gone" 3. "Dear teacher, I done it and I have went home."

جو ہم چاہتے ہیں مل جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انگریزی پڑھنے سے ہمیں ملازمت حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے یا انگریزی فلموں اور کتابوں سے لطف اندوز ہونا مشکل نہیں رہتا اور ہماری "عزت" میں اضافہ ہوتا ہے تو ہم انگریزی پڑھنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں ورنہ انگریزی کا شوق خود بخود سرد پڑ جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ گھر پر بہت سی سیکھی ہوئی چیزیں بعد میں ذاتی تجربے کی بنا پر زیادہ پختہ ہو جاتی ہیں اور درست معلوم ہونے لگتی ہیں مثلاً گھر پر سبھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ قہوہ پینے سے نیند اڑ جاتی ہے اور آدمی ساری رات جاگ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ میرے تجربے میں بھی یہی بات آئی ہو۔ بعض اوقات کسی دوا کے اوپر اعتقاد بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے کھانے سے آرام بھی ہو سکتا ہے حالانکہ دوا میں اس قسم کی کوئی صفت نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اعتقادات ہی کچھ ایسے رہے ہوں جو میرے ذاتی تجربے کے خلاف ہوں اور ان پر یقین کا سبب محض یہ ہو کہ انکے سبب میری کچھ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ان سے میری عزت نفس کو آسودگی ملتی ہو۔ ان لوگوں کے متعلق جو ہمارے وطن کے دوست ہیں اچھی باتیں آسانی سے تسلیم کر لی جاتی ہیں وطن کے مخالف لوگوں کے متعلق بری باتیں بھی اسی آسانی سے مان لی جاتی ہیں۔ اسی طرح اپنوں کے متعلق اچھی باتیں اور دوسروں کے متعلق بری باتیں بغیر کسی حیل و حجت کے درست تصور کی جا سکتی ہیں۔ کسی چھان بین کی ضرورت کو ہم بہت کم اہمیت دیتے ہیں اور اعزا و اقارب کی باتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مقبول عام اعتقاد کو مان لینے سے اپنی پسند کے کام کرنا ہمارے لئے نسبتاً "آسان" ہو جائیں مثلاً اگر میں خود سگریٹ کا شوقین ہوں تو میرے لئے اس "رائے" سے اتفاق کرنا آسان ہے کہ سگریٹ صحت کے لئے قطعاً نقصان دہ نہیں ہے اگر میں ایک افسر ہو کر رشوت لینا چاہتا ہوں یا بحیثیت ایک طالب علم کے کوئی قابل اعتراض رویہ اختیار کرنا چاہتا ہوں تو میرے لئے ثابت کرنا کیا مشکل ہے کہ "سبھی لوگ" ایسا کرتے ہیں یا کوئی اسکے بغیر ترقی کر ہی نہیں سکتا وغیرہ عدم یقین کی حالت ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جو رائے بھی پیش کی جائے اسے ماننا آسان ہوتا ہے۔ اگر کوئی موضوع زیر بحث ہو اسکے حق یا مخالفت میں برابر کے وزنی دلائل بھی موجود ہوں اور خود میری اپنی رائے کوئی نہ ہو تو جو رائے میرے دوست کی ہوگی وہی میں بھی قبول کر لوں گا۔ دوست کی رائے قبول کرنے سے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہوں اور مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اکیلا

نہیں ہوں مثلاً ایک امریکی رسالے نے پہلے پہل ایک متنازعہ فیہ مسلے کے متعلق مثبت اور منفی دونوں طرح کی دلائل پیش کرنا شروع کی تھیں مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی طرح امریکہ کے مشہور پرچے "ٹائم" نے شروع شروع میں لوگوں کے سامنے صرف "حقائق" پیش کئے اور انہیں دعوت دی کہ وہ خود اپنی اپنی "رائے" کا اظہار کریں۔ ازاں بعد اس نے خود "اپنی رائے" کا اظہار کرنا شروع کیا اور ایسے حقائق پیش کرنا شروع کیے جو اسکی وضاحت کرتے تھے غالباً اسکی مقبولیت کا راز یہی ہے۔ آخر میں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہم بعض باتوں میں اعتقاد اس لئے رکھتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے ہی انکو صحیح تصور کرنا سکھایا جاتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے سے اعلیٰ یا حاکم کے متعلق اعتقادات ہوتے ہیں اسلئے ہم بھی انہیں درست مان لیتے ہیں۔ شروع شروع میں والدین کی حاکمیت پر ہمارا ایمان ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بہت عالم فاضل اور دانا ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں صحیح کرتے ہیں۔ جب کبھی میں نے خود سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کی یا تو میرا مذاق اڑایا گیا یا کوئی نہ کوئی مشکل میری راہ میں حائل ہو گئی۔ مثلاً اسکول میں مجھے یہی سکھایا گیا کہ استاد سب کچھ جانتے ہیں۔ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہوتا ہے۔ کالج میں بھی بعض طالب علم ایسے کودن ہوتے ہیں جو مطبوعہ چیز کو بالکل درست سمجھتے ہیں اسکی صداقت پر شبہ کرکے وہ ناکامیابی کا خدشہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے اسی طرح بعض اوقات پر فیسروں کے ساتھ تبادلہ خیال کو بھی موزوں تصور نہیں کرتے جو کچھ کسی ناقد نے کہہ دیا ہے اسے تسلیم کر لیتے اور اپنی کوئی رائے نہ پیش کرنے ہی میں اپنی بھلائی اور نجات سمجھتے ہیں۔

دوسرے باب میں ہم لکھ آئے ہیں کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم میں سے اکثر لوگ خود اپنی رائے قائم کرنے کی بجائے "مسلمات" کو تسلیم نہ کریں۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ کسی معاشرہ میں رائے یا اعتقاد کا اختلاف نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ اسمیں مختلف ثقافتی گروہ شامل ہوں جو معاشرتی امتیاز، مذہبی اعتقاد یا محض پیشے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوں قابل غور امر اختلاف رائے نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جو اعتقاد کسی معاشرہ کے ہیں وہ اسکے اکثر بیشتر افراد کے ہیں یا فقط کسی ایک فرد کے کوئی مجنون اور فاترالعقل ہی صرف اپنے آپ کو درست اور حق پر سمجھ سکتا ہے صدیوں کے بعد آہستہ آہستہ اکثر کسی نئے اعتقاد کا خالق یا بانی وجود میں آتا ہے بھی اپنے بے شمار اعتقاد دوسروں سے مستعار لیتا ہے

ثقافت اور آموزشی عمل

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ثقافت ہی وہ آموزشی عمل ہے جسکی بدولت ہم چند ایک مشابہ اور غیر مشابہ چیزیں کو نوٹ کرتے ہیں اور چند دیگر مشترک اور مخالف چیزوں کو نظر انداز کر دینا سیکھتے ہیں۔ یہ بات بھی سیکھنے سے حاصل ہوتی ہے کہ معاشرہ میں کن باتوں سے "فرق پڑتا ہے" اور کس سے کوئی "فرق" نہیں پڑتا۔ اول الذکر کی طرف ہم توجہ کرنا سیکھ جاتے ہیں اور موخر الذکر کی طرف ہم کوئی توجہ نہیں دیتے اب ذرا اس آموزشی عمل کا جائزہ لیجئے:

ایک نوزائیدہ کے لئے یہ دنیا عجب تماشہ ہے جہاں کی کوئی چیز اسکی سمجھ میں نہیں آتی اسکی اس کیفیت غالباً وہی کیفیت ہوتی ہے جو اچانک کسی عجیب و غریب جگہ میں داخل ہونے سے ہم میں سے کسی کی بھی ہو سکتی ہے خصوصاً جب کہ وہاں ہر لحظہ کوئی نیا ہیولیٰ کوئی نئی روشنی کسی جانب سے بڑھتی ہوئی نظر آئے۔ اور ہمیں قطعاً یہ علم نہ ہو کہ انکا مفہوم کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ شروع شروع میں بچے کے ہر قسم کے احساسات عمومی اور مبہم ہوتے ہیں خوشی غم اور بھوک، پیاس، دکھ درد اور نیند وغیرہ کسی میں بھی وہ اچھی طرح تمیز نہیں کرسکتا اسکے لئے ان میں سے کوئی احساس بھی واضح اور روشن نہیں ہوتا۔ عرصے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ دائیں پاؤں میں تکلیف ہے یا بائیں انگوٹھے میں ٹیس ہو رہی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ متحرک اور غیر متحرک چیزوں کے درمیان فرق کرنا سیکھتا ہے ایک فرد کو دوسرے فرد یا جاندار سے بے جان اشیا کو ایک دوسرے سے الگ اور علیحدہ رکھ کر دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ اچھی اور بری غذا میں امتیاز کرتا ہے چہرے کی مسکراہٹ اور پیشانی کی تیوری میں تمیز کر پاتا ہے۔ اس قسم کے اختلافات سے واقف ہونیکے بعد وہ خود بھی اس قسم کے امتیازات روا رکھنا سیکھ لیتا ہے۔ ماں کو "ماں" کہنے لگتا ہے اور باپ کو دیکھ کر اسے ابا کے لفظ سے پکارتا ہے بائیں ہاتھ سے سلام کرنے کی بجائے دایاں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ ازاں بعد جلد ہی وہ اپنے خاص تمدنی اختلافات سے واقف ہو جاتا ہے آرنیش[1] بچے گرد و پیش کے لوگوں میں ٹھیک سے تمیز کرنا نہیں سیکھتے برخلاف اسکے امریکی بچے جلد ہی اپنی ماں اور دیگر عورتوں میں تمیز کرنے لگتے ہیں بعض معاشروں میں مختلف رشتے داروں سے رسم و راہ بڑھانے کے متعلق خاص واضح اصول ہوتے ہیں جنکی خلاف ورزی نہیں کیجا سکتی

[1] دیکھئے باب نمبر ۲

امریکی بچہ اپنی مختلف "آنٹس"[1] اور "انکل"[2] میں کوئی نمایاں فرق نہیں کرسکتا۔ اسکے برعکس پاکستانی بچے کو شروع ہی سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ چچا کون ہوتے ہیں اور تایا کون ہے خالہ کون ہوتی ہیں اور چچی کون۔ چنانچہ اردو میں انگریزی کے مقابلے میں ایسے کئی لفظ ہیں جو ان رشتوں کے باہمی فرق کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں اگر یہ فرق متعلقہ افراد کے لئے بہت اہم ہو تو انکی اپنی زبان میں اسکے لئے مختلف الفاظ بھی ضرور ہوتے ہیں مثلاً عربی زبان میں اونٹ کیلئے کوئی چھ سو لفظ ہیں اسی طرح اسکیمو کی زبان میں "برف" کے لئے بھی کئی سو لفظ موجود ہیں۔ اسی طرح اگر چینی لوگوں کو یہ کہنا ہو کہ انہیں کوئی چیز کہیں "لے جانا" ہے تو وہ موقعہ اور محل تک مطابق اسکے لئے مختلف لفظ استعمال کریں گے۔ ان سب کا مفہوم "لے جانا" ہی ہوتا ہے مگر محض "لے جانا" کی تکرار نہیں ہوتی ہر پیشے اور فن کی اپنی "مخصوص زبان" ہوتی ہے مثلاً ایک وکیل نقب زنی[3] اور قزاقی[4] میں تمیز کر سکتا ہے معمولی اور بڑی چوری[5] کے درمیان فرق تلاش کرے گا۔ اور ایک عام آدمی ہر قسم کی چوری کو "چوری"[6] کہے گا۔ اسی طرح اسکول کے بچے مختلف قسم کے "گٹیوں"[7] کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اسکے معنی ہوئے کہ باہمی فرق کسی نئے لفظ کے وضع کرنے میں مدد دیتا ہے اور پھر یا لفظ اپنے اس فرق کو مزید واضح کرنے میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ زبان دراصل ایسے اوزاروں[8] کا ایک سٹ ہے جو استعمال سے کند یا تیز ہوتے ہیں اگر ہیں مسلسل استعمال کیا جائے اور نئے نئے انداز سے استعمال کیا جائے تو انکی افادیت بھی نئے نئے اور جداگانہ طریق سے سامنے آتی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ زبان اسی وقت ترقی کرتی ہے جب اسکی مدد سے کوئی نئی تحقیق کی جائے اور اسکو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔ اسکی عاجزی و تنگ دامنی بھی اسی وقت دور ہوتی ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چھوٹے اور بڑے فرق سے کیا مراد ہے اسکا تعلق اپنی ذات سے ہے کہ کسی بات کا ہم پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ایران کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ انگلستان کی سیر کو آیا تو اس سے ڈربی کی مشہور گھوڑ دوڑ دیکھنے کی درخواست کی گئی کیونکہ انگلستان میں غالباً اس سے بہتر

1 Aunts. 2 Uncles 3 Burglary
4 Robbery. 5 Grand and petit larceny
6 Stealing. 7 Marbles. 8 Tools.

اور کوئی تفریح نہیں سمجھی جاتی تھی۔ شاہ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ ایک گھوڑا دوسرے
گھوڑے کے مقابلے میں تیز دوڑ سکتا ہے۔ اسکے نزدیک اور اس سے ملتے جلتے تمدنی ماحول میں پلے ہوئے
لوگوں کے نزدیک اس سے کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا کہ کونسا گھوڑا جیتتا ہے اور کونسا ہار جاتا ہے حالانکہ
انگلستان کے لوگوں کے لئے یہ انتہائی دلچسپ مشغلہ تھا کہ کونسا گھوڑا جیتتا ہے۔ اسی طرح اگر باسکٹ بال کی
کوئی ٹیم دو گول سے جیت جاتی ہے تو کیا آپ اسے بہت بڑی جیت سمجھیں گے۔ اگر جیتنے یا ہارنے والی
ٹیم آپکے اپنے کالج کی ہے اور وہ ایک اہم میچ جیت یا ہار جاتی ہے تو یقیناً آپ کے نزدیک بہت بڑا فرق
پڑ گیا اور اگر وہ ٹیم آپ کی نہیں ہے تو غالباً آپ یہ جاننے کی پرواہ نہیں کرتے کہ کون کتنے گولوں سے جیتا یا
ہارا کس بات سے فرق پڑتا ہے اور کس سے نہیں اسکا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کے معاشرے میں
کسی فعل یا لفظ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ کیا بڑے آدمی سے خطاب کرتے وقت "آپ" کا لفظ استعمال کرنا
چاہیئے اور اگر یہ لفظ استعمال نہ کیا تو کیا فرق پڑے گا۔ مہمانوں کی تواضع کرتے وقت بکرے کا گوشت پکانا اچھا ہے
یا گائے کا۔ موٹر خرید لینے سے معاشرے میں ہماری عزت بڑھ جاتی ہے یا آپکے مرتبہ میں اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا۔ اس قسم کے سوالوں کا جواب دینے کی لئے ضروری ہے کہ ہم اس معاشرے کا مطالعہ کریں جس
سے کہ ہمارا تعلق ہے کہ وہ معاشرہ ان چیزوں کو کیا اہمیت دیتا ہے

جسطرح اختلافات کو دیکھنا اور روا رکھنا سیکھا جاتا ہے اسی طرح یکسانیت اور مطابقت کو اہم سمجھنا بھی
سیکھنے سے آتا ہے لیکن ایسا عموماً کم ہوتا ہے۔ اختلافات کچھ زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ بہت سی لوک رسمیں[1]
کسی نہ کسی اشاریہ[2] کے تعلق سے معرض وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً بعض معاشروں میں شادی کے موقع پر دلہا دلہن کو چند
ایسی چیزیں دی جاتی ہیں جو اس بات کا شگون یا علامت یا خواہش ہوتی ہیں کہ انکے ہاں اولاد ہو جیسے یورپ
کے لوگوں میں ان موقعوں پر چاولوں کا بکھیرنا۔ پاکستان میں دلہن کی گود میں مختلف قسم کے خشک پھل اور میوے
ڈالنا وغیرہ چین میں یوم پیدائش کی تقریب پر نوڈل[3] کھائے جاتے ہیں۔ جن کی لمبائی درازی
عمر کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ چیزیں کھاتے وقت ان علامتوں[4] کے معنی شعوری طور پر ذہن میں نہیں

1 Folk-customs. 2 Symbol. 3 Noodles.
4 Symbols

ہونے لیکن اگر کوئی کسی ایسی رسم کی وجہ جواز پوچھ لے تو ان شگونوں کا ذکر بلا تکلف کر دیا جاتا ہے۔ بعض امریکی ریڈ انڈین قبیلوں میں کچھ ایسی دوائیں استعمال ہوتی ہیں کہ انکے کھانے سے ایک عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے اور آدمی بے تکان بولتا چلا جاتا ہے جسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دیوتاؤں کی طرف سے کوئی پیغام آ رہا ہے۔ ایک مدت تک پاگل آدمیوں کے متعلق یہی تصور کیا جاتا تھا کہ ان پر بدروحوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ انکے ساتھ اکثر مجرموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انسانی مروت اور سائنس کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی بیماری کے علاوہ ذہنی بیماری کا وجود بھی تسلیم کر لیا گیا اور پاگل پن کو ایک بیماری سمجھ کر پاگلوں کا علاج کیا جانے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک معاشرہ میں باہمی اختلاف کو زیادہ اہمیت دی جائے اور کسی دوسرے معاشرے میں باہمی مطابقت کو۔ ایک آدمی کو مار ڈالنا ہو سکتا ہے برا تصور کیا جائے مگر جنگ میں قصاص میں کسی کو مار ڈالنا معیوب قرار نہیں دیا جاتا لیکن اسکیمو کے نزدیک کسی کو مار ڈالنا ہر لحاظ سے برا ہے اسلئے انکی زبان میں قتل عمد[1] اور مار ڈالنے[2] میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اخلاقی باتوں کے انتخاب کا سبب

اب سوال یہ ہے کہ ہم چند اخلاقیات یا چند یکساں مشابہ باتیں کیوں دیکھ لیتے ہیں اور بعض دوسری مشابہ یا اخلاقی باتیں کیوں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے ماحول میں سے صرف ان اخلاقی باتوں کو چن لیتے ہیں جو ہم پر مختلف طریق سے اثرانداز ہوتی ہیں اور اپنے کردار کی بھی انہیں باتوں کی طرف ہم توجہ دیتے ہیں جنکے نتائج مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ اگر بچہ کا تجربہ یہ ہے کہ صرف ماں ہی اسکی غذا کا خیال رکھتی ہے اور وہی اس سے پیار کرتی ہے تو وہ جلد ہی ماں کو پہچاننے لگ جاتا ہے۔ اگر ایک دیہاتی یہ دیکھتا ہے کہ اسے ایک خاص ترکاری یا ساگ کھانے سے طاقت حاصل ہوتی ہے اور کسی دوسری قسم کا ساگ یا ترکاری سے شدید درد ہوتا ہے تو وہ انہیں کامیابی سے تمیز کر سکتا ہے چاہے وہ شکل میں کتنی ہی زیادہ مشابہت کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اگر صاحب اقتدار اور دولت ہمیں ادنے سمجھتے ہوں اور عام آدمی ہمارے ساتھ برابری کا سلوک کرتے ہوں تو ہم بہت جلد اقتدار کے اس قسم کے فرق کو بھی سمجھنا سیکھ جاتے ہیں۔ ایک عام آدمی آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے اور سیاہ بادل چھائے دیکھتا ہے تو اسے فکر ہوتی ہے کہیں بارش نہ ہو جائے اور وہ بھیگ نہ جائے

1 Murder. 2 Kill

اسکے علاوہ "سیاہ بادل" اسکے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے مقابلے میں وہ موسمیات کا ایک ماہر
جب اس قسم کے بادل آسمان پر دیکھتا ہے تو انکے سبب فضا میں جو تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں وہ سب اسکی نگاہوں کے
سامنے آجاتی ہیں مختلف قسم کے بادلوں کو وہ جدا جدا ناموں سے موسوم کرتا ہے اسکے لئے ان سب کی بڑی اور
الگ الگ اہمیت ہوتی ہے۔

بعینہ ہم اپنے مختلف افعال میں تمیز کرنا سیکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی لفظ کو غلط پڑھیں یا اسکے ہجے صحیح نہ کر سکیں اور لوگ ہنس
دیں تو ہم ایسے الفاظ بولتے اور لکھتے وقت نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور اگر کوئی ہمارے تلفظ یا ہجوں کی اہمیت
نہیں دیتا تو ہو سکتا ہے کہ ہم ساری زندگی بار بار وہی غلطی کریں اور ہمیں پتہ تک نہ چلے اگر ہمارے لباس پہننے کے انداز
لوگوں کو پسند نہ آئیں اور اسکے سبب وہ ہماری طرف غلط رویہ اختیار کریں تو ہمیں فکر ہونے لگتی ہے اور ہم غور کرنے لگتے
ہیں کہ آخر ہمارے لباس میں کونسی ایسی خامی ہے کہ لوگ ہماری طرف یوں دیکھتے ہیں پھر جہاں تک ہو سکتا ہے ہم جلد از جلد
اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اپنے کردار کی ان تفصیلات کی طرف خاص طور پر توجہ دیتے ہیں جنکے
سبب ہمیں اپنے معاشرے میں نمایاں مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ بہت سے لوگ چند ایسے اختلافات کو اہمیت دینا
سیکھ جاتے ہیں جنکی دراصل کوئی اہمیت نہیں ہوتی؟ کیا ہم بہت سی ایسی باتیں نہیں سیکھ لیتے جو ہمارے لئے قطعی
غیر اہم ہوتی ہیں۔ اور انکی غیر اہمی کا علم ہوتے ہوئے بھی انکو ترک نہیں کرتے۔ انسانی ذہن تلازموں کی کڑیاں جوڑنے
میں کمال مہارت رکھتا ہے۔ وہ یقیناً کئی تلازمے ایسے بنا لیتا ہے جو سرے سے غیر ضروری اور بیکار ہوتے
ہیں۔ عام طور پر ہم ایسی مماثلات اور اختلافات کو اخذ کرتے ہیں جو ہمارے متعلقہ معاشرتی یا تمدنی جماعت کی کسی نہ کسی ضرورت
کو پورا کرتے ہیں اور ہمیں آسودگی مہیا کرتے ہیں خواہ اس آسودگی کی نوعیت صرف یہ احساس ہی کیوں نہ ہو کہ ہم اپنے گروہ
کے دوسرے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اور ان سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم بالکل عجیب و غریب لوگ
نہیں ہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک قسم کے لوگ ہیں۔ ایسے تمدنی اختلافات کو سمجھنے کے لئے جنکی بنا ہیں جسمانی تفاوت بنیادی
ہو ذرا کتے اور اسکے مالک کی دنیا کا موازنہ کیجئے۔ بو کا معمولی سا فرق بھی کتے کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے
کیونکہ یہ فرق اسکے لئے "بہت بڑا فرق" ہے حالانکہ اس قسم کے فرق کا انسان کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ہمارے

لئے موزوں ترین فقروں میں نمایاں فرق ہو سکتا ہے کتے کے لئے دونوں کاغذ کے ٹکڑے سیاہی کے دھبوں کے سوا کچھ اور معنی نہیں رکھتے لیکن ایک انسان کی ضرورتوں اور اُسودگیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

الغرض یہی دخطا اور نظام ہی وہ ایسے ذریعے ہیں جن کی بدولت ہم تمدنی امتیازات کا ادراک کرنا سیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس آموزشی عمل کے دوران میں ہم غلطیاں بھی کریں اور ٹھوکریں بھی کھائیں لیکن آہستہ آہستہ اکثر غیر شعوری طور پر ہم کچھ نہ کچھ سیکھتے بھی رہتے ہیں بعض اوقات ایک ہی واقعہ کسی بات کو نقش کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے مثلاً اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ کوئی بپھرا ہوا بیل میرے پیچھے پڑ جائے تو اندازہ جب بھی کبھی مجھے بیل یا گائے نظر آتی ہے میں گھبرا سا جاتا ہوں۔ اور فوراً پہچان لیتا ہوں کہ غصے سے بھڑک اٹھنے کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

جب پہلے پہل ہمارا کسی نئے تمدن سے واسطہ پڑتا ہے تو ہمیں عجب پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ایک نظر میں بعض اوقات یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ عورتیں ہیں یا مرد۔ دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے ہوں تو اس سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ ممکن ہے وہ ان آداب کا خیال نہ کر رہے ہوں جنکو ہم نہایت ضروری سمجھتے ہوں وہ کچھ ایسی رسمی باتوں کو اہمیت دے رہے ہوں جنہیں ہم قطعاً بے کار سمجھتے ہیں ممکن ہے ہمارا طریقہ تخاطب انہیں نہایت غیر شائستہ نظر آتا ہو مثلاً کسی معاشرہ میں کالے اور گورے رنگ کی شدید تمیز کا مظاہرہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورتوں کے زیورات کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے ایک تیسرے معاشرے میں گھوڑسواری اور چوتھے معاشرے میں خطابت ہی سب سے زیادہ قابل قدر چیز سمجھی جاتی ہے۔ کسی تمدن سے واقف ہونے اور اسے سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی یہی امتیازات روا رکھنا شروع کر دیں جو اس میں مناسب تصور کیے جاتے ہیں اور انہیں چیزوں کی قدر و منزلت کریں جو اس ثقافت میں عزیز اور گراں بھی سمجھی جاتی ہیں۔

باب کا خلاصہ

چنانچہ ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں ہم نے محض اس آموزشی عمل کی وضاحت کی ہے جس کے سبب ہم کسی ثقافتی گروہ کے مختلف افعال، خیالات اور احساسات سیکھتے ہیں۔ نفسیات کے ماہروں کے نزدیک آموزش خاصا طویل اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور اسکے متعلق کئی نظریات پیش کیے جاتے ہیں ہم نے ان نظریات کے بارے میں یہاں تفصیلی طور

پر کچھ نہیں لکھا۔ اور پورے باب میں ایک ہی بات پر زور دیا ہے کہ ثقافت ایک آموزشی عمل ہے جو خاص اصولوں کے تحت سیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی بھر ہم اپنے ثقافتی گروہ کے دوسرے افراد سے سوچنے محسوس کرنے اور عملی کام کرنے کے طریقے اور انداز سیکھتے رہتے ہیں۔ ہم صرف ان سے سیکھتے ہی نہیں بلکہ ان کے کردار کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ اور ہماری آموزش کا اکثر و بیشتر حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کا ہمارے گروہ کے عام معاشرتی ورثے سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

چھٹا باب

کریکٹر اور ذات[1]

ذات کی نوعیت اور اسکی نشوونما

معاشرتی ورثہ اور اسکی تحصیل کے بارے میں ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اسے پڑھ کر آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ انسان صرف رسوم اور عادات کا مجموعہ ہے۔ اسکی حیثیت تو ایک ایسے جہاز کی ہے جسے موجیں ادھر سے ادھر لیے پھرتی ہیں۔ نہ اسکی کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ کوئی ناخدا۔ وہ تو فقط خارجی قوتوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اسکا اپنا کوئی راستہ متعین ہوتا ہے اور نہ منزل۔ انسان کو حالات کے ہاتھوں مجبور محض سمجھنا درست نہیں۔ اسے اپنی منزل کا علم ہوتا ہے اور وہ اپنے راستے سے واقف ہوتا ہے۔ اسکے سامنے ایک نصب العین ہوتا ہے۔ وہ فقط عادات اور اضطرابات[2] کا مجموعہ نہیں ہے۔ مذہبی اصطلاح میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ اسکے اندر روح ہوتی ہے۔ اسی بات کو نفسیات کی اصطلاح میں یوں کہیں گے کہ اسکی ایک "ذات" ہوتی ہے کیونکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ خود "ذات" ہوتا ہے۔ ذات کوئی ایسی چیز تو نہیں ہوتی جو پیدائش کے ساتھ ہی ساتھ بنی بنائی اسکو عطا کر

1- Character and self. 2 Impulses.

دی جا سکے ۔ یہ تو مسلسل نشو و نما پاتی ہے اور بالیدگی حاصل کرتی ہے چنانچہ اس باب یہی بتانا مقصود ہے کہ
یہ "ذات" کیونکر نشو و نما پاتی ہے اور ہمارا کردار کیونکر بنتا ہے ۔

سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "روح" اور "ذات" کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ منطقی طور
پر ایک نفسیات دان یہ نہیں مان سکتا کہ شخصیت وراثت (یعنی استقرار حمل کے وقت جو کچھ کسی فرد کو جواہر تخلیق کے
ذریعے ملتا ہے) اور ماحول (یعنی وہ تمام قوتیں جو استقرار حمل کے بعد برابر اس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں) کے
علاوہ بھی کسی اور چیز سے پیدا ہو سکتی ہے۔ بظاہر اصول منطق کی رو سے یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم صحیح معنوں میں
قطعاً آزاد نہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ پہلے ہی سے وراثت اور ماحول ہمارے لئے مقرر کر دیتے ہیں۔ تاہم ہم
میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انسانی شخصیت وراثت اور ماحول کے علاوہ بھی کوئی شے ہے جسے انسانی دماغ
مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ بعض اوقات ہمیں واقعی اس قدر آزادی ہوتی ہے کہ ہم جس
چیز کو چاہیں انتخاب کر لیں۔ انسان بہرحال انسان ہے، وہ محض کوئی چلتی پھرتی مشین نہیں جو چند بندھے ٹکے اصولوں
کی پیروی کرنے کی پابند ہو گو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں خواہ ہماری سمجھ میں آزادی کا صحیح مفہوم آئے یا نہ آئے۔ نفسیات
دان کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وراثت اور ماحول کے ان اسباب کا تجزیہ کریں
جن کے تحت "ذات" فعال ہوتی ہے۔ انسان کو محض عادات اور رسوم کا مجموعہ تو کسی صورت میں برقرار نہیں
دیا جا سکتا۔ ہر شخص کی خواہشات، کردار کے طریق اور رویوں کو ایک "شعوری ذات" کے گرد منظم کیا جا سکتا ہے۔
کوئی خواہش یا یاد داشت متعلقہ فرد کی ذات سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی یہ خواہش رغبہ کی ہو یا سلمہ
کی۔ بجانہ کی ہو یا ناہید کی کہ وہی پہلی لڑکی ہو جو چاند کی سیر کی خواہش کرے۔ چاند کی سیر کی خواہش ان میں سے کس کی ہے
کسی کی نہیں۔ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ خواہشات کسی فرد کے ساتھ منسوب ہوتی ہیں بذات خود وہ کوئی معنی
نہیں رکھتیں۔ چنانچہ یہ ہمارا عام مقولہ ہے "مجھے خوب یاد ہے کہ یہ الفاظ یوں ہے" "تم کیا چاہتے ہو؟" یہ بھی میں جانتا ہوں
اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ہم "کسی بات کا فیصلہ کرتے ہیں" تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں اور تم
الگ الگ فرد کی حیثیت سے کسی بات کو طے کر لیتے ہیں یعنی "یاد" "خواہش" اور "فیصلہ" کسی نہ کسی

شخص کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں فرد کی ذات سے جدا وہ خود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ "میرا ہاتھ دکھتا ہے" تو اسکا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ میری "ذات" ہے جو جسم کے ایک حصہ (یعنی ہاتھ) میں درد محسوس کرتی ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر بچہ کس طرح ایک "ذات" بن جاتا ہے اور فقط افعال اور خواہشات کا مجموعہ نہیں رہتا؟ غالباً پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب وہ کسی چیز کو دیکھتا ہے، اسے پکڑتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ پہلے اپنے پاؤں کی انگلی ہے" اور اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ تو خود میں ہوں" پھر رفتہ رفتہ "میں چاہتا ہوں" "میں پسند کرتا ہوں" "آپ میری طرف توجہ کیجئے" کہنا سیکھ جاتا ہے۔ یعنی ذات کی نشو و نما ہمارے باہمی تعلقات کے ذریعے ہوتی ہے جب تک خارجی دنیا سے تعلقات نہ پیدا ہوں "ذات" کا تصور نہیں ابھرتا۔

تصور ذات کا ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں۔ یہ زندگی کے ابتدائی دو تین سالوں سے ہی ابھرنا شروع ہو جاتا ہے ان دنوں بچے کو کچھ کچھ یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ کس قسم کا "فرد" ہے۔ دوسرے لوگوں کا اسکے ساتھ جس قسم کا برتاؤ ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو اسی قسم کا فرد سمجھ لیتا ہے۔ "کس قدر خوبصورت بچہ ہے" "پھر ایسے شریر" "دیکھو نہ وہ تم سے کتنا چھوٹا ہے۔" "ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ لڑکا ہے" "ذرا دیکھو تو سہی کتنی نازک اور پیاری بچی ہے" جس وقت بچہ اس قسم کی باتوں کا مطلب بھی نہیں سمجھتا ہے اسوقت یہ ضرور محسوس کر لیتا ہے کہ دوسروں کی اسکے متعلق کیا رائے ہے۔ وہ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ اپنے نام سے بھی وہ اسی طرح واقف ہوتا ہے "دیکھو رشید کس قدر تندرست بچہ ہے" "ثریا اپنے بھائی سے کہیں زیادہ ذہین ہے" "رضیہ کی شکل بالکل اپنی ماں پر گئی ہے" جب ہم بار بار کسی بچے کو ایک نام سے پکارتے ہیں یا دوسروں سے اسکا ذکر کرتے وقت اسے ایک خاص نام سے یاد کرتے ہیں تو گویا ایک طرح سے ہم بچے کو اسکے نام سے واقف کر دیتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی ان باتوں کو سنکر بچہ یہ محسوس کرنے لگے کہ "میں ایک بہت ہی پیارا بچہ ہوں اور ہر شخص کو میرا خیال رکھنا چاہیئے۔" "میں ایک اچھی لڑکی ہوں" "مجھے ہر کام خود کر کے دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیا ہوتا ہے" "میں ایک برا لڑکا ہوں، میں کچھ بھی کروں والدین مجھ سے خوش نہیں ہوتے" "سب سے اچھی چیزیں منجھی کو ملنی چاہیں" "بہن کو میرا ہی کہا ماننا چاہیئے"۔ اس قسم کے رویے لا محالہ بچے کے ذہن میں اسکی اپنی ایک خاص تصویر قائم کر دیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا بچہ ہے بچہ کا یہ نہایت پسندانہ تصور ذات کوئی کلیہ نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسرے عام بچوں کا سا بھی تصور کر سکتا ہے

جب تصورِ ذات بخنہ ہونا شروع ہوتا ہے تو وہ گویا ایک ایسی "ذات" کی شکل میں ڈھلنے لگتا ہے جو کامرانی کی خواہشمند ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسکی حفاظت کی جائے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسان ہی وہ تنہا جوان ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ "ناکام" ہے ہو سکتا ہے کہ بعض ادنیٰ جانور جب کچھ کرنا چاہتے ہوں تو کامیاب نہ ہوں یا وہ بعض دوسرے جانوروں کی موجودگی میں خوف زدہ یا مسکین نظر آنے لگتے ہوں مگر انسان ہی ایک ایسا جوان دکھائی دیتا ہے جو اپنی ذات کو کمتر محسوس کرتا ہے ذرا سی رکاوٹ یا معمولی سی تنقید کو اپنی ذات پر حملہ تصور کر لیتا ہے ممکن ہے میرا اپنی ذات کے متعلق یہ تصور ہو کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جسکی سبھی کو عزت کرنی چاہیئے۔ دوسروں کی ذرا سی عدم توجہی مجھے اپنی ہتک نظر آنے لگتی ہے۔ اسکے برعکس اگر میرا تصورِ ذات اس شخص جیسا ہو جسکی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے تو اس صورت میں عزت یا کامیابی خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو بنیادی احساس کمتری کو دور نہیں کر سکتی یہ ممکن ہے میرا تصورِ ذات "ایک اچھے طالب علم کا ہو اور مجھے جو نمبر ملیں اس سے میرے سب دوست خوش ہو جائیں مگر میں یہی خیال کرتا رہوں کہ میرے لئے "وہ ناکامی" میں ممکن ہے میں انہیں اپنی "ناکامی" کا مترادف سمجھ لوں ہو سکتا ہے میں اپنے آپ کو لیڈر تصور کر لوں جو کبھی کسی کا پیروکار نہیں ہوتا میرا تصورِ ذات میرے "نن سینز" اور میری خواہشات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسمیں وہ طریقِ زندگی بھی شامل ہے جو میں اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

تصورِ ذات وہ مرتبہ ہے جو بچہ آہستہ آہستہ اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ اس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ اپنے ماحول کے بارے میں اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ اپنی شخصیت میں کس قسم کی خوبیاں دیکھنا پسند کرے گا۔ کامیابی اور ناکامی سے اس کی کیا مراد ہوگی کونسی چیزیں ایسی ہونگی جنکی وہ خواہش کرے گا اور کن چیزوں سے اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ ہوگی کسی فرد کی شخصیت اس کے تصورِ ذات کے گرد مرتب و منظم ہوتی ہے۔ تصورِ ذات پیدائش کے معاشرتی ورثہ اور ذاتی تجربات کا بے حد اثر ہوتا ہے لیکن جب یہ خوب استوار ہو جاتا ہے تو متعلقہ شخص اپنے تمدن میں تبدیلیاں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ بڑے لیڈر بعض اوقات اپنے آپ کو ایسا فرد تصور کرنے لگتے ہیں جو خدا کی طرف سے تاریخ کا رخ بدلنے کے لئے بھیجا گیا ہو۔

شخصی اخلاق کا تصورِ ذات کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہوتا ہے اس لئے یہاں کردار کی دو ایک صفتوں کا ذکر

بیجا نہ ہوگا جو اجتماعی زندگی کی نشو و نما میں گراں قدر مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خود غرضی اور بےنفسی سب سے زیادہ اہم قرار دی جا سکتی ہیں:۔

خود غرضی کا صحیح مفہوم

اکثر کہا جاتا ہے کہ جماعتی اور قومی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ خود غرضی پر کیونکر قابو پایا جائے۔ اگر سب آدمی اپنے مفاد کا خیال کرنے کی بجائے مشترکہ مفاد کو پیش نظر رکھنا شروع کر دیں تو تمام مسائل خود بخود آسانی سے حل ہوتے چلے جائیں گے لیکن خود غرضی کے معنی کیا ہیں؟ کیا کسی انسان یا حیوان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مکمل طور پر بے غرض ہو۔ مجھے اپنی چیزیں اپنے پاس رکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آپ اپنی چیزیں دوسروں کو دے دیتے ہیں کیونکہ وہ آپ کی تعریف کرتے ہیں یا آپ کے ممنون ہوتے ہیں یا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اچھے ہیں۔ خدا آپ کو جزا اور مجھے سزا دے گا۔ جب حالات یہ ہوں تو آپ مجھ سے کم خود غرض کیونکر ہوئے؟ انضباطی لحاظ سے کیا ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان حالات میں خود غرض یا ”بے غرض“ کے الفاظ استعمال کریں۔ یا اس پر موقوف ہے کہ ہم خود غرضی یا بے غرضی سے مراد کیا لیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تمام انسان اپنی اپنی تسکین و آسودگی کی خاطر کام کرتے ہیں۔ میں کسی خاص موقعہ پر وہی کام کرتا ہوں جس کی مجھے شدید ترین خواہش ہوتی ہے۔ جب میرا غصہ ہونے کو جی چاہتا ہے تو میں غصہ ہو جاتا ہوں۔ فیاضی پر طبیعت مائل ہوتی ہے تو میں سخاوت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں خود غرض ہو جاتا ہوں تو اس کی بھی یہی وجہ ہوتی ہے کہ میں بےنفس ہونے کی بجائے خود غرض بننا چاہتا ہوں۔ جب میں سینما جانے کی بجائے کوئی مشکل سبق یاد کرنے بیٹھ جاتا ہوں تو اس کا سبب بھی یہ ہوتا ہے کہ مجھے کل کے امتحان کی زیادہ فکر ہوتی ہے یا اپنے آپ کو اچھا طالب علم ثابت کرنے کا خیال حاوی ہوتا ہے یہی خیال مجھے مجبور کر دیتا ہے کہ میں سینما نہ جاؤں اور امتحان کی تیاری میں مشغول ہو جاؤں۔ اگر میرے ساتھی مجھے مجبور کر دیں کہ میں ان کے ساتھ سینما چلا جاؤں تو مجھے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ پڑھوں۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ دوستوں کے اصرار پر پڑھنے کی بجائے سینما دیکھنے کی رغبت غالب آگئی ورنہ اگر پڑھنا زیادہ عزیز ہوتا تو میں کبھی ان کا ساتھ نہ دیتا یہی بات اور تمام قسم کے کاموں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ان تمام کاموں میں جو مجھے کسی موقعہ پر کرنا بھی ہوتے ہیں میں صرف وہ کام کرتا ہوں جس کو سر انجام دینے کی مجھے سب سے

زیادہ خواہش ہوتی ہے۔ میں ہوا میں اونچا نہیں اڑ سکتا۔ اور نہ ٹھوکر کھانے کے بعد گرنے سے بچ سکتا ہوں اسی طرح میں چھینکتا اسی وقت ہوں جب چھینکنے کی خواہش مجبور کر دیتی ہے۔ یا میں غصہ اس وقت ہوتا ہوں جب غصہ کے اظہار کی خواہش غصہ کو دبانے سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اس قسم کی مثالوں پر غور کرتے وقت شعوری اور غیر شعوری دونوں قسم کی خواہشوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے غیر شعوری خواہش بظاہر اپنی ذات کے علاوہ باہر سے آئی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور شخص متعلقہ کو وہ اپنی ذات کا جز معلوم نہیں ہوتی اور ہو سکتا ہے کہ وہ شعوری خواہش سے نسبتاً شدید ہو مثلاً ایک غیر شعوری خواہش مجھے دانتوں سے ناخن کاٹنے پر مجبور کر سکتی ہے خواہ میں ہر وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنی اس عادت کو دبانا ہے۔ مجھے اس خواہش کا تو پورا پورا احساس ہوتا ہے مگر اسکے پیچھے کونسی قوت چھپی ہوئی ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص خود غرض ہے اور فلاں بڑا بے نفس ہے تو اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ پہلا شخص جو اسکا جی چاہتا کرتا ہے اور دوسرا وہ کام کرتا ہے جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں وہی کام کرتے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس قسم کی کوئی بات کہتے ہیں تو درحقیقت اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو خود غرضی سے کام کر کے اور دوسرے کو "بے غرض کام" کر کے زیادہ تسکین ہوتی ہے۔ اسلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم "بے نفس" اسوقت بن سکتے ہیں جب ہم بے غرضی سے کام کرنا سیکھیں۔ لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خواہش کس طرح بڑھتی اور ترقی کرتی ہے:-

ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ چھوٹے بچے بالعموم خود غرض ہوتے ہیں یہ درست ہے کہ شروع شروع میں تمام بچے اپنی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بچے کو دوسری جاندار چیزوں کی موجودگی کا فوراً احساس نہیں ہو جاتا۔ اسمیں کچھ وقت لگتا ہے حتیٰ کہ اسے ماں کی مسکراہٹ کا بھی احساس خاصی مدت میں ہوتا ہے جب تک کہ بچے کا ذہن ایک خاص حد تک نشوونما نہ پالے ہم اس سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ دوسروں سے ہمدردی سے پیش آئے گا۔ تاہم بچہ جلد ہی ایسے طریقے پا لیتا ہے۔ جنسے دوسروں کو خوش کر سکے اور انکی ستائش حاصل کر سکے مثلاً" بچہ مسکراتا ہے تو ماں بھی مسکرا دیتی ہے کیونکہ بچے کو مسکراتا دیکھ کر وہ نہال ہو جاتی ہے اور دونوں ایک

ساتھ بیک خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔ اب گویا بچہ ایسے کام سیکھ رہا ہے۔ جن سے دوسرے بھی خوش ہوتے ہیں۔ اسکے کچھ ہی بعد جب وہ اپنا کوئی کھلونا یا کھانے پینے کی کوئی چیز کسی کو دیتا ہے تو جواب میں تمہارا شکریہ۔ شکریہ ایسے الفاظ اس کے کانوں میں پہنچتے ہیں ہو سکتا ہے شروع شروع میں بچہ دوسرے کو اپنی کوئی ایسی چیز دے جسکی اسے خود کوئی ضرورت نہ ہو مگر جلد ہی وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ دوسروں کو خوش کرنا ذاتی تسکین حاصل کرنے سے کہیں زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات بچہ اپنے کسی پالتو جانور کی دیکھبھال کے سبب نہایت خوبی سے بے نفسی کا سبق سیکھ جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان گویا ایک دلی انس پیدا ہوتا ہے اور بچہ اپنے پیارے کتے۔ طوطے یا بلی کو آرام پہنچانے کے لئے ہر طرح کی مشکل اور مصیبت بھی برداشت کر لیتا ہے۔

اسکے برخلاف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدائے عمر ہی سے بچہ خود غرض ہونے لگے۔ اور بغیر چھینا جھپٹی کے اسے کچھ حاصل نہ ہو سکے اگر وہ اپنے حصہ کا کھانا کسی کو دے دے تو اسے خود بھوکا رہنا پڑے۔ یا اس کا اسطرح کسی کی مدد کرنا پسندیدہ نہ سمجھا جائے اور "خود غرضی" کو چالاکی تصور کیا جائے تو بچہ لازماً یہی سیکھے گا کہ فقط "اپنا خیال" رکھے۔ کسی دوسرے کی فکر کیوں کی جائے! اوائل عمر سے ہی اگر اسے دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ اور مسابقہ کرنا پڑے اور محض اپنی ضرورتوں کو مقدم رکھنے کی تعلیم ملے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اگر وہ کسی جانور کو دق کرتا ہے اور دیکھنے والے اسکی اس حرکت پر ہنستے ہیں تو اسے اپنے طاقتور ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسے اس قسم کی حرکات میں لطف آنے لگتا ہے۔ اور بغیر اس قسم کی حرکات کے اسے آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جب بھی بچہ کسی کی مدد کرے یا ہمدردانہ رویہ اختیار کرے تو اسے کچھ "انعام" ملنا چاہیئے۔ خواہ انعام خوشنودی کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں! کیا بچہ اس وقت بھی بے نفس بننے کی سعی کریگا جب کہ اسے کوئی صلہ نہ ملے؟ اسکا جواب نہایت آسانی سے دیا جا سکتا ہے کہ بچہ بغیر کسی انعام یا صلہ کے بھی بے نفسی کی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اپنے اندر حقیقی اخلاقی کردار پیدا کر سکتا ہے۔ شروع میں تو بے نفسی کسی عوض و معاوضہ کے سبب پیدا ہوتی ہے لیکن بہت جلد بچے میں ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور اسکا

تصور ذات "بے نفسی" کی صفت کو اپنے اندر سمونا شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ "میں ایک سخی بچہ ہوں" یا اسکے ذہن میں اس قسم کا کوئی نصب العین تخلیق ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ دوسروں کی مدد کرنا جائز اور درست ہے۔ اب بچے کو آسودگی کسی کام کے انجام دینے کے بعد صلہ حاصل کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اسے تسکین اس خیال سے حاصل ہوتی ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہ عین درست اور صحیح ہے۔

والدین کی ذمہ داری

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بچے میں جائز اور ناجائز کا تصور اثبات حیثیت "القا و معاشرتی ورثہ" کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں والدین کا عمل نہ صرف طریقہ تضاد سے بڑی مدد کرتا ہے۔ اگر کوئی بے نفس باپ بچے کو بے نفسی کی "تلقین" کرتا ہے تو اسکی "باتوں" کا بچے پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی باپ بچے کو بے نفسی خود غرضی کی تلقین کرتا ہے اور خود گھر میں اسکا رویہ انتہائی خود غرضانہ ہے تو اسکے پند و نصائح سب بیکار جائینگے باپ بچے کی باتوں پر کیوں کر دھیان دے سکتا جب کہ عمل اسکے خلاف پاتا ہے! چنانچہ وہ باپ کی باتیں "سننے کی بجائے" اس کے عمل کو نگاہ میں رکھتا ہے!

مقابلہ حسد تعاون اور وابستگی خود غرضی اور بے نفسی کی ترقی کے سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جو والدین اور استاد مستقل طور پر بچوں کا آپس میں مقابلہ کرتے رہتے ہیں وہ یقیناً خود غرضی کے جذبہ کو ہوا دیتے ہیں بے نفسی کا احساس اسوقت پیدا ہوتا ہے جب افراد ایک دوسرے کی مدد کرنے میں خوشی اور مسرت محسوس کریں چنانچہ بچے کے لئے ایسا ماحول پیدا کرنا جس میں وہ باہمی تعاون سے لطف حاصل کرنا سیکھے صحیح معنوں میں اسے بے نفسی کی تعلیم دینا ہے:-

سوئیٹزرلینڈ کے مشہور و معروف ماہر نفسیات پیاگے اپنی ایک کتاب[1] میں لکھتے ہیں کہ بچوں کو تعلیم دیتے وقت ہم اکثر و بیشتر خود غرضی کو ابھارتے اور باہمی تعاون کے جذبے کو دباتے رہتے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم ہی ایسا ہے کہ ہمارے طالب علموں کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرنے سے اپنے آپ کو بچانا کچھ مشکل نہیں بلکہ امتحان میں ناکامی سے بچنے کے لئے آسان ترکیب یہی ہے کہ ناجائز ذرائع استعمال کئے جائیں۔ انکا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کا پورا احساس نہیں کہ بچے میں باہمی تعاون کی ضرورت کسقدر گہری اور لابدی ہے۔ ہم بسا اوقات ان کو الگ

1 The moral judgement of the chid: Piaget

الگ کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یوں ہم انہیں ننگ حسد پیدا کر کے ایک کو دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد صرف یہ ہو کہ ہمارے بچے اعلیٰ نمبر لے کر امتحانوں میں پاس ہو جائیں تو یہ طریقہ تعلیم بہت اچھا ہے مگر اس نظام تعلیم سے معقول سمجھدار اور اچھے شہری پیدا نہیں ہو سکتے۔ ہوتا یہ ہے کہ یا تو بچے استاد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا بے حد مقابلہ کرتے ہیں اور جب اپنی محنت کے باوجود ناکام رہ جاتے ہیں۔ تو ناجائز ذرائع اختیار کرنے کی ٹھان لیتے ہیں یا وہ سب مل کر منظم طریق پر یہ ذرائع اسلئے استعمال کرتے ہیں کہ اس قسم کی بے جان تعلیم کے خلاف جو انہیں دی جاتی ہے۔ جہاد کیا جائے۔ لیکن یہ تصور کر لینا بھی درست نہیں کہ حسد اور مقابلہ ہمیشہ خودغرضی کی طرف ہی راہنمائی کرتے ہیں۔ ان سے جماعتی تعاون اور اتحاد عمل بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ بے ایمانی میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق سے کام لیا جائے۔ ناجائز ذریعے اسلئے بھی تو استعمال کئے جا سکتے ہیں کہ ہم جماعتوں سے آگے بڑھا جا سکے اور ایسے کام کے لئے شاباش حاصل کی جائے جو کیا ہی نہ گیا ہو۔ تاہم ایسی کلام نہیں کہ ہم اپنے اسکولوں میں استاد اور شاگرد کے درمیان انفرادی تعلقات کو ترقی دیتے ہیں۔ جماعت میں بچوں کا آپس میں بولنا ممنوع ہے۔ اگر کسی سے سوال پوچھا جائے تو اسکے کسی ہم جماعت کو اجازت نہیں ہوتی کہ اسکی مدد کرے۔ باہمی تعاون کے اظہار کا شاذ ہی کوئی موقعہ دیا جاتا ہے۔ ہر طالب علم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنا کام خود کرے۔ انکو اکٹھے بیٹھ کر پڑھنا سکھایا ہی نہیں جاتا۔ انہیں اس قسم کا کام ہی نہیں دیا جاتا ہے جسے وہ باہم مل کر انجام دے سکیں۔ صرف جدید ترقی پسند سکولوں میں باہمی تعاون کی تعلیم کا کسی حد تک خیال رکھا جاتا ہے۔ ان حالات میں بچوں کو اس بات کا مجرم ٹھہرانا کہاں تک قرین انصاف ہے کہ انہیں خدمت کا جذبہ کیوں نہیں پایا جاتا ہے یا انہیں خودغرضی اسقدر شدید کیوں ہے آئندہ نسلیں یقیناً ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کو انتہائی احمقانہ تصور کرینگی:-

جس امریکی ماہر نفسیات کا ہم نے دوسرے اور چوتھے باب میں حوالہ دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بھارت میں بچے نکے جس جس سکول میں اسکا جانا ہوا ان میں سے کوئی اسکول ایسا نہ تھا جس میں بچوں کو اکٹھے سوچنے کام کرنے مشکلات حل کرنے منصوبے بنانے اور کھیل تماشے سے لطف اندوز ہونے کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہوں

وہ لکھتی ہیں کہ ہندوستانی بچوں کے پاس ایسے کھلونے نہیں ہوتے جو گروہی فکر و عمل کو پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں لیکن ہندوستان ہی تنہا ایسا ملک نہیں ہے جہاں یہ مشکل اس قدر واضح اور شدید ہو۔

عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ جماعت کے باہر کی سرگرمیوں میں ہی اتحاد عمل کی تربیت ہوتی ہے چنانچہ ایسے موقعوں پر ہمیں مختلف ٹیم کے کھیلوں کا خیال آتا ہے مثلاً ہم اسی کھلاڑی کی تعریف کرتے ہیں جو خود گول کرنے کی بجائے گیند اپنے اس ساتھی کو دے دیتا ہے جس کے لئے گول کرنا آسان ہوتا ہے۔ خود غرض کھلاڑی حقیقت میں کبھی اچھا کھلاڑی نہیں ہوتا۔ کالج بھی اپنی ٹیم کی کامیابی پر ناز کرتا ہے نہ کہ دو ایک کھلاڑیوں کی انفرادی کوشش پر۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ایک ڈرامے کا مرکز توجہ ایک ہی کردار ہو مگر اسکی کامیابی مشترکہ مساعی کا نتیجہ جس میں ٹکٹ فروخت کرنیوالے یا اسٹیج کا بندوبست کرنے والے بھی برابر کے شریک ہوں۔ جیسے یہ ضروری نہیں کہ کالج یونین کے عہدے دار ہی یونین کی بھلائی کا خیال کریں۔ دوسرے طالب علم بھی اس میں اگر بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے تو یونین صحیح معنوں میں ترقی کرسکتی ہے۔

بے غرض کردار کے تین محرکات

ابھی تک ہم نے صرف ان تین محرکات کا ذکر کیا ہے جو بے غرض کردار پیدا کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں (۱) دوسروں کی خوشنودی اور تحسین حاصل کرنا اور بے غرض مشہور ہونا ہم سب کی خواہش ہوتی ہے سب یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیں نہ صرف دولت مند بلکہ "فیاض" بھی سمجھیں۔ اس محرک کے ذریعہ صرف محدود قسم کی "بے نفسی" پیدا ہوسکتی ہے مثلاً یہ تو ہوسکتا ہے کہ گداگروں کی خوب مدد کی جائے۔ تحفے تحائف بھی دل کھول کر دیئے جائیں "خیرات" کی بارش بھی عام ہو۔ مگر اس بات کے تحت کام کرنیوالا آدمی کبھی کسی ایسے مقصد کا طالب کبھی نہیں ہوتا جو بظاہر لوگوں میں مقبول نہ ہو خواہ اسمیں بنی نوع انسان کی کتنی بھلائی مضمر کیوں نہ ہو وہ لوگوں کی اس وقت تک مدد نہیں کرتا جب تک کہ اسے اس کا یقین نہ ہو جائے کہ امداد حاصل کرنے والے محسن سے واقف ہو جائینگے۔

دوسرا محرک وہ ہے جسمیں کوئی شخص اعلیٰ اصول اور صحیح معنوں میں خدمت خلق کے احساس کی بنا پر کوئی کام کرتا

ہے۔ ایسے شخص کو دوسروں کی احسان مندی اور خوشنودی کی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ اسکا اپنا ضمیر اور عزت نفس کا جذبہ اسے لوگوں کی خدمت کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں نہ اسے لوگوں کی "واہ واہ" کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ انکی واہ واہ کا انتظار کرتا ہے۔ لوگوں کی نظر خواہ اس پر پڑے یا نہ پڑے وہ اپنی دھن میں رفاہ عامہ کے لئے کام کیا کرتا ہے۔ غالباً ایسا شخص مذہبی اصولوں کا سخت پابند ہوتا ہے اور یہ احساس رکھتا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پیروی کر رہا ہے اسے طمع بھی نہیں ہوتا کہ قیامت کے دن اسکا اجر ملے گا وہ اگر کوئی کام کرتا ہے تو اسلئے کہ وہ اسے صحیح اور درست تصور کرتا ہے سزا اور جزا نہ اسے اکساتے ہیں اور نہ پریشان کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ سماج کی سچی خدمت کر سکتے ہیں اور وہی مروجہ برائیوں کی بیخ کنی کر سکتے ہیں۔ اسکے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگ کسی ایک۔ اسی جماعت کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگادیں اور ہر وقت سر سے کفن باندھے پھریں۔ اور ملک کو ایسی خانہ جنگی پر آمادہ کر دیں جو فائدہ پہنچانے کی بجائے لوگوں کے لئے آرام و مصائب کے پہاڑ کھڑے کر دے۔

تیسرا محرک گہری انسانی ہمدردی سے موسوم کیا جاسکتا ہے ممکن ہے کوئی شخص اس قدر احساس ہو کہ اسے دوسروں کی بھلائی اور انکے احساسات کا ہر دم خیال رہے۔ اسے انکی خوشی سے خوشی اور انکے غم سے غم ہوتا ہو وہ کچھ مضطرب ہو کر کھویا کھویا سا نظر آتا ہے اور صرف فوری اور اہم ضرورتوں کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ انسان کی مستقل اور دائمی ضرورتوں اور خواہشوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے اسے یہ بھی ادراک ہو جاتا ہے کہ کس ضرورت کو کتنی اہمیت دینا چاہیے اور کونسی ضرورت فوری توجہ کی محتاج نہیں ہے۔ مندرجہ بالا محرکات میں سے ہر محرک بے نفسی کے دائرہ کو محدود اور متعین کر سکتا ہے بعض آدمی فقط اپنے دوست احباب کی خوشنودی حاصل کرنے میں ہی مگن رہتے ہیں انہیں کسی اور کی خوشنودی سے غرض نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "عزت نفس" ایک خاص قسم کی خدمت پر ابھارے اور محض اپنوں کی بھلائی پر آمادہ کرے اور دوسروں کی فلاح و بہبود سے بے تعلق کر دے۔ ایسے درد مند بے شمار ملیں گے جو اپنے ہمسائے یا عزیز و اقارب کے ساتھ تو بے حد ہمدردی سے پیش آئیں مگر اپنے نوکر یا کاریگر کیساتھ انہیں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ جنہیں بے حد ہمدرد انسان سمجھا جاتا ہے صرف انہیں لوگوں کے

ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں جنکی بدبختی نظر کے سامنے ہو اور ان لوگوں کے مصائب کا انہیں قطعاً خیال نہ آئے جو آنکھوں سے اوجھل ہوں۔ ایسے بھی بے شمار لوگ مل جائینگے جو جانوروں پر تو مہربان ہوں مگر انسانوں کے ساتھ انکا سلوک سنگ دلانہ ہو۔ الغرض ہم میں سے اکثر و بیشتر افراد کسی نہ کسی حد تک ان ذہنی تحرکات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اگر ہم یہ جاننے کی سعی کریں کہ عام و مروجہ زندگی میں خاص حالات کے تحت ہمارا طرز عمل کیا ہوتا ہے تو ہم اپنے آپکو یا اپنے احباب کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکیں۔

نمونہ کے چند حالات

ذیل میں نمونہ کے طور پر چند حالات دیئے جا رہے ہیں اور ان سے متعلقہ چند حالات ہیں۔ جو اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ دوسروں کی تحسین و توصیف کس حد تک آپ کو متاثر کرتی ہے اور آپ سے کیا کام لے سکتی ہے۔ یہ مندرجہ حالات حتمی یا آخری نہیں کہے جا سکتے ہر شخص خود جان سکتا ہے کہ وہ کونسے ایسے حالات ہیں جو اسکی ذات کے متعلق زیادہ وضاحت سے زیر بحث امر پر روشنی ڈالتے ہیں:-

(ا) آپ کو ریلیف فنڈ یا ریڈ کراس فنڈ میں کچھ چندہ دینا ہے۔ اسکی ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک بکس ہے جس میں آپ کو اپنے حصہ کی رقم ڈال دینا ہے اور دوسری آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اس فہرست پر جو رقم لکھ دینا چاہتے ہوں لکھیں۔ بعد میں یہی لسٹ لوگوں کو پڑھ کر سنائی جائے گی یا کسی دوسرے طریقے سے شائع کر دی جائے گی۔ کیا اعلان کی صورت میں آپ زیادہ رقم دیں گے یا نہیں؟

(ب) کیا آپ ان مذہبی فرائض کو بھی اسی احتیاط سے پورا کرتے ہیں جنکو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا اور جن کا تعلق فقط آپکی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

خدمت خلق اور عزت نفس کا جذبہ کس حد تک آپکو بے نفس بنا سکتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے حالات سے لگایئے۔

آپ ریل کے تیسرے درجے میں سفر کر رہے ہیں۔ ڈبہ میں دوسرے ڈبوں سے نسبتاً کم بھیڑ ہے۔ لوگ برابر چلے آ رہے ہیں۔ کیا آپ ان لوگوں کو اپنے ڈبے میں آنے سے روکیں گے یا نہیں بلا روک ٹوک آنے دیں گے۔

گہری انسانی ہمدردی کا اندازہ ان حالات سے لگائیے۔ آپ مٹھائی کھا رہے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ آپ ہی کی سمت آ رہا ہے۔ کیا آپ کچھ مٹھائی وہاں رکھ دیں گے کہ بچہ آسانی سے اٹھا لے
(ب) جب کسی دوسرے انسان کی خوش بختی کی خبر آپ سنتے ہیں تو کیا اس سے آپکو خوشی ہوتی ہے مختصر یہ کہ ایسے مختلف حالات ہو سکتے ہیں جنہیں کوئی شخص مختلف محرکات کے سبب کوئی کام کرتا ہے ایک ہی کام مختلف لوگ مختلف محرکات کے تحت بھی کر سکتے ہیں ایسے موقعوں پر کسی کام سے متعلقہ محرک کا اندازہ لگانا قدرے مشکل ہوتا ہے مثلاً آپ ایک سرکاری افسر ہیں۔ آپ کا ایک دوست آپ سے خاص مراعات چاہتا ہے۔ ممکن ہے آپ دوستی کا خیال کرتے ہوئے یعنی ہمدردی کے جذبے کے تحت اسے مراعات دے دیں یا اس کا کام اسلئے کر دیں کہ وہ احسان مانے یا آپ اس کام کے بدلے میں کسی معاوضہ کی امید رکھیں یہ بھی عین ممکن ہے کہ آپ اسے دو ٹوک جواب دے دیں کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ نہایت سختی سے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے فرائض سر انجام دیں۔ اسی طرح ممکن ہے آپ ایک راہگیر کو راستہ بتا دیں کیونکہ آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شریفانہ طرز عمل اسکا متقاضی ہے کہ آپ اسکی مدد کریں، یا بلا کسی خاص وجہ کے آپکو اس سے ہمدردی ہو یا آپ اسکی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ مندرجہ بالا بیانات سے ایک بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ اگر دوسرے ہماری تعریف کریں یا ہمیں انکی خوشنودی حاصل ہو جائے تو یہ بات ہمارے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں صرف انہیں پر اعتماد نہ کر لینا چاہیئے بلکہ ایسے محرکات بھی تلاش کرنے چاہئیں جو خاموش پوشیدہ طریق پر فعال ہوں حتےٰ کہ اگر وہ غیر مقبول ہوں تو بھی ان سے غافل نہیں ہونا چاہیئے:

کم ظرفی اور وسیع ظرفی — بے نفسی پر اور طریق پر بھی غور کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی کو خود غرض یا بے غرض کہنے کی بجائے ہم کیوں نہ کم ظرفی[1] اور وسیع ظرفی[2] کا ذکر کریں۔ کسی فرد کی "ذات" وہی ہوتی ہے جو وہ بننا چاہتا ہے مثلاً ممکن ہے ایک شخص صرف انہیں چیزوں کی خواہش کرے جو صرف اسی کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں دوسروں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں کہ نہیں

[1] Small self. [2] Large self.

اسے اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اسکے برعکس دوسرا آدمی یہ چاہتا ہے کہ ہر آدمی پڑھا لکھا ہو، اور کھاتا پیتا ہو۔
انکی "ذات" میں دوسرے بھی شامل ہیں۔ یہی وہ ذات ہے جسے "وسیع ظرف" کہا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں کی ذات
صرف اپنے خاندان کے افراد یا اپنے فرقے، صوبے یا ملک کے لوگوں یا محض اپنے ہم مذہب لوگوں کے لئے
محدود ہوتی ہے اور بعض دوسرے لوگوں کی ذات اسقدر وسیع ہوتی ہے کہ اسمیں تمام بنی نوع انسان سما جاتے ہیں
یہی نہیں بلکہ وہ تو آنے والی نسلوں کی بھلائی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ تمام انسان
خوش و خرم زندگی گزاریں۔ وہ یہ سب باتیں زبان ہی سے نہیں کہتے بلکہ بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے وہ اپنی
تمام کوششیں بھی صرف کرتے ہیں۔

"وفاداری" بھی "بے غرضی" کا ایک طریقہ اظہار ہے۔ کیا ہم صرف اپنے خاندان، احباب، کالج، ملک یا
مذہب کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ یا تمام دنیا کے ساتھ وفاداری کا دعوی رکھتے ہیں۔ وفاداری کا
مطلب اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ ذاتی مفاد و کم ظرفی کو ترک کر دیا جائے۔ اور وسیع القلبی اختیار کر لی جائے۔ "ایاز
سلطان کا وفادار ہے۔ "اور قاسم سارے ہم وطنوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہے" ان دونوں بیانوں کے دوسرے
لفظوں میں یہ معنی ہوتے کہ ایاز کو سلطان کا مفاد اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ عزیز ہے اور قاسم ہم وطنوں کی
خاطر اگر ضرورت پڑے تو اپنے سب مفاد قربان کرسکتا ہے۔

اکثر وفاداری کا جذبہ اسوقت نہایت آسانی سے بیدار ہوتا ہے جب ایک گروہ کا کسی دوسرے گروہ سے
مسلسل موازنہ کیا جاتا ہے۔ رقابت اسی طرح تو پیدا کی جاتی ہے۔ حسد و رقابت ہی کے طفیل مختلف اسکولوں
کے بچوں کو مقابلہ کے لئے خوب ابھارا جاسکتا ہے کبھی کبھار "خاندانی جذبہ" کا انحصار بھی اس احساس پر ہوتا ہے
کہ ہمارا خاندان دوسرے خاندان سے افضل ہے۔ بعض اوقات حب الوطنی بھی اس قسم کی ہوتی ہے۔
اسکی بنیادیں بھی دوسروں کے خلاف نفرت پر استوار کی جاتی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے جب چینیوں کو دنیا
کی باقی قوموں کے متعلق زیادہ واقفیت نہ تھی اور وہ انکو کمتر سمجھتے تھے انہیں اپنے وطن کے لئے بھی
محبت کم تھی۔ وہ صرف اپنے خاندانوں یا گروہوں کے لئے کام کرتے تھے انہیں صرف اپنے اپنے
صوبوں کا خیال رہتا تھا بحیثیت مجموعی انہیں اپنے ملک کا کوئی خاص خیال نہ تھا لیکن جب دوسری قوموں

ان پر حملے شروع کر دیئے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا تو چینیوں کو اپنی قوم کے ساتھ وفاداری کا احساس ہوا۔ ابھی حال ہی میں جب پاکستانی طلبا کی ایک جماعت سے یہ پوچھا گیا کہ اگر ملک پر حملہ ہو جائے اور انہیں ملک کا چپہ چپہ بچانا پڑے تو ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو جان تک لڑا دیں گے تو سبھی مستعد نظر آئے لیکن یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ انہیں سے شاید ہی کسی نے بنگال کے سیلاب زدگان کے لئے کچھ دیا ہو۔ اپنے گروہ کے لئے کوئی مفید اور مثبت کام کرنے سے کسی کے خلاف لڑنا اکثر آسان ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ ساری عمر ملک کی کوئی حقیقی خدمت کئے بغیر گذار دیتے ہیں وہ صرف بجی دولت جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں حتٰے کہ انکی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہ ادا کریں وہ سماجی بہبود کی کسی تحریک میں بھی حصہ نہیں لیتے اس کے باوجود جب جنگ ہوتی ہے تو وہ اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کی تربیت اسی طرح سے ہوئی ہے کہ ہمارے نزدیک وطن دوستی کا مطلب صرف دشمنوں سے لڑنا ہے اور اگر کوئی بیرونی ممالک والا ہم پر تنقید کرے تو اسکے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ اپنے گروہ کے اندر رہ کر اپنی ذاتی غرضوں کو قربان کرنا واقعی مشکل ہے۔

مذہبی معاملات میں بھی یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے۔ بچوں کی تربیت ہی اس نہج پر کی جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے مذہب کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے ہیں اور دلائل و براہن سے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسے زیادہ صحیح ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں مگر اسکی تعلیمات پر صحیح معنوں میں کبھی عمل نہیں کرتے۔

وفاداری کا صحیح مفہوم

اب سوال یہ ہے کہ کیا وفاداری کے یہی معنی ہیں؟ کیا اپنے گروہ سے وفاداری کا مطلب دوسروں سے مخاصمت ہے؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ ایک بچہ اپنے خاندان کا انتہائی وفادار ہوتے ہوئے بھی دوسرے لوگوں کی طرف نہایت دوستانہ رویہ اختیار کرسکتا ہے۔ اپنے اسکول کی حمایت کا جذبہ ضروری تو نہیں کہ دوسرے اسکولوں کے ساتھ رقابت ہی پر استوار ہو۔ اسکا انحصار اساتذہ اور طلبا کے باہمی مراسم یا طلبا کے مختلف گروہوں کے اشتراک عمل پر بھی تو ہوسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ممبر اقوام متحدہ کے لئے اتنی ہی تن دہی سے

کام کرتے ہیں۔ اور اس ادارے میں بھی اتنی ہی خدمت کر رہے ہیں جتنی کہ وہ اپنے ملک اور قوم کیلئے کرتے ہیں

ہم دوسروں کا کیونکر خیال رکھتے ہیں اسکا دو طریقوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے ایک تو یہ کہ ہم کمزوروں کا ساتھ دیں اور دوسرے یہ کہ ہم کسی کے ساتھ بیجا رعایت نہ کریں۔ بچوں کو یہ سکھایا جاسکتا ہے کہ وہ ہیکڑی جتانے والوں[1] یعنی ایسے لوگوں سے نفرت کریں جو اپنی طاقت کا بے جا استعمال کرتے ہیں اور کمزوروں کو ستاتے ہیں۔ وہ متحد ہو کر ہیکڑی جتانے والے کو نیچا بھی دکھا سکتے ہیں اسی طرح وہ یہ سیکھ سکتے ہیں کہ ایمانداری سے اور صاف ستھرا کھیل کھیلنا کسی اصول کو چوری چھپے توڑ کر یا کوئی ناجائز ذریعہ استعمال کر کے جیتنے سے کہیں زیادہ باعزت ہے۔

بعض معاشروں میں ان چیزوں پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ جیسے انگلستان میں یہ باتیں پہلے گھروں میں سکھائی جاتی ہیں پھر یہی تربیت اسکول میں جاری رہتی ہے اگر باپ خود غرضانہ طریق پر اپنی بالادستی کو وقت کو استعمال نہیں کرتا بلکہ خاندان کے ہر فرد حتیٰ کہ ملازموں تک کا لحاظ کرتا ہے تو بچے یہ جان لیتے ہیں کہ یہی جائز اور مناسب طریق ہے۔ کمزور کی ظلم کے خلاف مدد کرنا بھی وہ انہیں طریقوں سے سیکھتے ہیں بعض گھروں میں والدین اپنے بچے کی مدد اسی وقت کرتے ہیں جب وہ پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت ناجائز ذرائع استعمال نہ کر رہے ہوں اگر ان کا اپنا بچہ کوئی غیر مناسب فائدہ اٹھانیکی کوشش کرتا ہے تو وہ اسکی ہرگز مدد نہیں کرتے۔ اسی طرح بچے کو یہ جاننے میں آسانی ہوتی ہے کہ ایمانداری یا منصفانہ برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ اگر کوئی استاد طنز سے کام لیتا ہے یا بچوں کے مابین طرف داری اور تعصب سے کام لیتا ہے اور کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ اپنے طلبا کو خود غرضی کی تعلیم دے رہا ہے۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک باپ اپنے بچے کو ہیکڑی جتانے سے روکنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنی چھوٹی بہن کو مارا تو دیکھنا میں تمہاری وہ پٹائی کروں گا کہ یاد رکھو گے اس قسم کی دھمکی سے بچہ کیا سیکھے گا؟ کیا وہ اپنی بہن کا خیال رکھنا سیکھ سکے گا؟ کیا اس سے وہ یہ نہیں سیکھے گا کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو میں بھی دوسروں کو

1. Bullying

پیٹ سکوں گا تاہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ بچے کسطرح معاشرتی اثرات کے سبب گھروں، اسکولوں یا کھیل کے میدانوں میں خود غرض یا بے غرض یا دوسروں کا لحاظ کرنے کا سبق سیکھتے ہیں۔

دیانت داری کا مطلب

کریکٹر کی دوسری اہم صفت جو صحت مند اجتماعی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے دیانتداری ہے۔ اجتماعی تعاون باہمی اعتماد پر ہی استوار ہوتا ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ اعتماد نہیں ہوتا کہ دوسرے انکی جان و مال کو خیر برد نہیں گے اور انکے ساتھ دروغ بیانی سے کام نہیں لیں گے جینا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم مختلف معاشروں میں دیانتداری کے معیار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسکیمو کبھی چوری نہیں کرتے۔ کوئی شخص اپنا مال اور اثاثہ بغیر کسی حفاظت کے چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی مدت کے بعد کیوں واپس ہو اسے اسکی ہر چیز محفوظ ملے گی۔ اشتراکیت سے پہلے چین میں جو حکومت تھی اسمیں بڑی بڑی بدعنوانیاں ہوتی تھیں اسکے باوجود چینی تاجر ایک دوسرے کا اس قدر اعتبار کرتے تھے کہ انکے آپس کے معاہدے اکثر زبانی ہوتے تھے کسی تحریر کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اسکے برعکس بہت سے ایسے شہر ملیں گے جہاں ہر شخص ہر لمحہ چوری سے چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے اور دوسرے کی دروغ بیانی سے ڈرتا رہتا ہے۔ یہ دستور بھی عام ہے کہ خاص خاص حالات کے تحت اور چند مخصوص آدمیوں کے علاوہ سب کے ساتھ عام بے ایمانی کیجاتی ہے مثلاً اجنبیوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے مگر دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ دیانت داری برتنا پڑتی ہے اسی طرح ایک جواری بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ اپنی "عزت بچانے کے لئے" جوئے میں ہارا ہوا قرض چکانا انتہائی ضروری ہے خواہ یہ روپیہ کسی سے چوری کر کے فراہم کیا گیا ہو یا کسی کو فریب دے کر یا ٹھگ کر حاصل ہوا ہو۔ بعض لوگ براہ راست چوری کرنے کے قائل تو نہیں ہوتے مگر رشوت لینے میں انہیں اعتراض نہیں ہوتا۔ بعض لوگ رشوت وغیرہ تو نہیں لیتے مگر ادھار مانگی ہوئی کتابیں واپس نہیں کرتے اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے یا ایسی بات بلا تکلف دہراتے ہیں جو وہ خوب جانتے ہیں کہ درست نہیں۔ کسی بحث کو جیتنے کی خاطر جان بوجھ کر غلط بیانی کرنا یا کسی بات سے محض اسلئے انکار کرنا کہ ہم پر کوئی الزام نہ آجائے بھی عام ہے۔ پھر بعض لوگ ایسے بھی مل جائیں گے جو روپیہ چرالیں گے لیکن کھیل کے میدان میں کبھی بے ایمانی

نہیں کریں گے امتحان میں ناجائز طریقے استعمال کریں گے مگر عام زندگی میں جھوٹ کبھی نہ بولیں گے۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ دیانت داری کا معیار نہ صرف مختلف لوگوں میں مختلف ہے بلکہ گروہوں اور تمدنوں میں بھی اس ضمن میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

چند اہم رویے

اب سوال یہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے کردار اور رویوں میں یہ فرق کیونکر سمجھا جائے۔ اسکو سمجھنے کے لئے نیچے دیئے ہوئے تین۲ چار رویوں کو دیکھئے۔

بعض لوگوں کو بے ایمانی پر صرف "سزا کا خوف" ہوتا ہے یا لوگوں کی طعن و تشنیع کا ڈر ہوتا ہے وہ کچھ اسطور پر سوچتے ہیں کہ میں دھوکا نہیں دونگا۔ ہو سکتا ہے میں پکڑا جاؤں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا کیونکہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے بیسیوں اور جھوٹ بولنے پڑیں گے میں بے ایمانی نہیں کروں گا کیونکہ بے ایمان کو خدا سزا دیتا ہے اس ذہنیت کا آدمی درحقیقت کبھی دیانت دار بننا ہی نہیں چاہتا ایسے آدمی کو سخت سزا سے اگر قابو میں رکھنے کی کوشش کی جائے تو دو قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ (۱) سزا جتنی سخت ہو گی اسی قدر وہ اس سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ جب تک کوئی پکڑا نہ جائے اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ پکڑ دھکڑ سے بچ جانا ہوشیاری اور چالاکی کی علامت سمجھی جائے گی۔ (۲) جہاں سزا سخت ہوتی ہے وہاں عموماً یہ اندیشہ رہتا ہے کہ سزا دیتے وقت طرفداری سے کام لیا جاتا ہے۔ کمزور پکڑے جاتے ہیں اور اثر و رسوخ والے بچ جاتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سخت سزا کی بجائے اگر سزا یقینی ہو تو زیادہ اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اگر سزا فوری ہونے کی بجائے مستقبل پر انحصار رکھی جائے تو بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ ہزاروں ایسے آدمی ہیں جنہیں پورا یقین ہے کہ گناہوں کی سزا ملے گی پھر بھی وہ برائیوں سے باز نہیں آتے۔

دوسرا رویہ بہت عام ہے اسے بعید چال[1] کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ عام آدمی وہی کرتا ہے جو دوسروں کو کرتے دیکھتا ہے اگر دوسرے ایماندار ہیں تو ہم بھی ایماندار

1 Remote

بننے کی سعی کرتے ہیں۔ اگر دوسرے دھوکا دیتے ہیں یا بے ایمانی سے کام لیتے ہیں تو ہم بھی ایسا کیوں نہ کریں جب یہ رویہ عام ہو جائے تو دیانتداری کا معیار بہت گر جاتا ہے۔ جب میں بے ایمانی کرنا چاہتا ہوں تو میرے دل میں یہ خیال پہلے سے موجود ہوتا ہے کہ دوسرے بھی تو ایسا کرتے ہیں اگر میں کروں تو کون سا گناہ ہے۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ میں جھوٹ بولتا ہوں تو اسکا جواز پیش کرتا ہوں کہ دوسرے بھی تو جھوٹ بولتے ہیں۔ ان حالات میں ہم اپنا موازنہ ہمیشہ برے لوگوں سے کرتے ہیں۔ نیک لوگوں سے اپنا مقابلہ کرنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے تیسرا رویہ یہ ہے کہ قانون کی روح کی پیروی کرنے کی بجائے اسکے الفاظ کی پیروی کی جائے۔ کوئی اصول یا قانون اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ اسمیں اس سے متعلقہ تمام صورتیں آجائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک تاجر چوری نہ کرے لیکن لوگوں کو دھوکا دینے کے متعدد ایسے طریقے ہو سکتے ہیں جن سے پیسہ بھی کمایا جائے اور وہ خلاف قانون بھی نہ ہوں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے جب ایک شخص نے ایک وکیل سے کسی بات کیلئے مشورہ طلب کیا تو وکیل نے یہ جواب دیا کہ یہ خلاف قانون ہے۔ یہ جواب سنکر اسنے برجستہ کہا کہ جناب میں نے آپ کا مشورہ اسلئے نہیں لیا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ میری بات قانونی ہے یا غیر قانونی۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ میں جو اقدام کرنا چاہتا ہوں وہ قانون کے حدود میں نظر آئے۔ صحتمند اجتماعی تعلقات صرف قانون کے ذریعے پیدا نہیں کئے جا سکتے، خصوصاً جب کہ حالات تبدیل ہو رہے ہوں، نئے سماجی اسباب پیدا ہو رہے ہوں قانون خوشگوار اجتماعی تعلقات کبھی استوار نہیں کر سکتا ایسے زمانہ میں ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ دیانت کی روح حاصل کی جائے اور نئے اور بدلتے ہوئے حالات پر اسکو منطبق کیا جائے۔ کم عقل لوگ یقیناً ایسا نہیں کر سکتے انکی مثال تو اس سادہ لوح بچے کی سی ہوتی ہے جسے استاد کا رومال چرانے پر خوب ڈانٹا گیا ہو اور اسکے فوراً بعد وہ اپنے ایک ساتھی کا رومال چرا لے اور استاد اسے ڈانٹے کہ نامعقول اتنی جلدی بھول گیا! ابھی میں نے تجھ کو منع کیا تھا کہ رومال نہیں چراتے"۔ اور بچہ اسی سادہ لوحی سے جواب دے "جی بھولا تو نہیں، آپ نے تو اپنا رومال چرانے سے منع کیا تھا۔ دوسروں کے رومال چرانے سے تو نہیں روکا تھا۔ اسی طرح بعض کھلاڑی کھیل کے قاعدے اور قانون کی پیروی تو کرتے ہیں لیکن اسکے علاوہ ہر قسم کی بے ایمانی کرنے سے نہیں چوکتے۔۔۔

آخری رویے کی نوعیت سے واقف ہونے کے لئے ان لوگوں کو بطور مثال پیش نظر رکھنا چاہیئے جنہیں دافعی اسے اعلےٰ مرتبہ کا باطنی اخلاقی معیار ہوتا ہے۔ راست باز لوگ صحیح معنوں میں ہی ہوتے ہیں۔ انکی راست بازی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ اصول کا احترام کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ انہیں پوری ہمدردی ہوتی ہے۔ سزا کی دھمکی انکے لئے سراسر غیر ضروری ہوتی ہے۔ دیانت دار ہوتے ہیں ہی انہیں آسودگی ملتی ہے۔ انکی اپنی دیانت ہی انکے لئے سب سے بڑا صلہ اور محرک ہوتا ہے۔

مذہبی خیال کے لوگ

مذہبی خیال کے لوگوں میں ان چاروں رویوں میں سے کوئی ایک یا انکی ملی جلی صورت دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کے نزدیک خدا (نعوذ باللہ) صرف پولیس کا ایک سپاہی ہے جو ہر لمحہ ان پر نظر رکھتا ہے اور ان کے گناہوں کی فہرست تیار کرتا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اس خیال سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ مخصوص رسوم و عبادت ادا کر کے اخلاقی گناہوں کی سزا سے بچ جائیں گے۔ یا وہ یہ سوچ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لیں گے اور خدا انہیں بخش دے گا آخر ان سے زیادہ گنہگار اور برے لوگ بھی تو موجود ہیں خدا بخشنے والا ہے انکو بھی بخش ہی دے گا۔

جہاں تک نام نہاد مذہبی لوگ کا تعلق ہے یہ صرف رسوم و رواج کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے مذہبی اور اخلاقی معیار کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بسا اوقات لوگوں نے ثقافتی رسوم کو احکام خداوندی سمجھ کر اپنایا ہے اور انکی پیروی کی ہے حالانکہ وہ محض انکے اپنے تمدن سے معرض وجود میں آئی تھیں اور انسان نے خود تخلیق کی تھیں۔ الہامی قوتوں کا اسمیں کوئی دخل نہ تھا۔

بعض ایسے مذہبی گروہ بھی مل جاتے ہیں جو عبادت یا سخاوت کے اصولوں کی پیروی تو کرتے ہیں مگر ان اصولوں کی صحیح اہمیت اور روح کو سمجھنے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کرتے مثلاً وہ عبادت تو بڑے سلیقے اور وفاداری سے کرتے ہیں مگر دیگر مذہبی تعلیمات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتے اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے پڑوسیوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔

ایسے لوگ بھی نایاب نہیں ہیں جنکی راست بازی اور دوسروں کے لئے گہری ہمدردی کا سبب ان کا ایمان اور ایقان ہوتا ہے۔ اگر انکو سزا کا خوف ہوتا ہے تو اسلئے کہ سزا انکے نزدیک خدا سے جدائی کا دوسرا نام ہے۔ وہ حقیقتاً جس چیز سے ڈرتے ہیں وہ گناہ ہے۔ انکا یہ ایمان ہوتا ہے کہ بے ایمانی اور خود غرضی بنیادی قوانین فطرت کے خلاف ہے؛

رویے استوار کیونکر ہوتے ہیں

آخر اس قسم کے رویے استوار کیسے ہوتے ہیں خود غرضی۔ بے ایمانی۔ دیانت داری یا بے نفسی پیدائشی صفات تو نہیں بہر حال وہ اکتساب ہی کی جاتی ہیں ۔ اس سلسلے میں اس قبیل کے چند سوالات سامنے رکھیں کہ کیا بچے کا ماحول ایسا ہے جس میں اسے جھوٹ اور چوری کی بہ نسبت ایمانداری اور دیانت میں زیادہ آسودگی ملتی ہے؟ کیا بے ایمانی کے بغیر اسے اسکا پورا پورا حصہ مل جاتا ہے کیا اس کا گرد وپیش ایسا ہے کہ اگر اس نے کوئی بے ایمانی کی تو مطعون ہوگا اور اسے کسی نہ کسی قسم کی معمولی کمزوری اور یقینی سزا ملے گی؟ کیا اس کے والدین دوسروں کے ساتھ دیانتدارانہ طریق پر پیش آئے ہیں کیا وہ اس سے جھوٹے وعدے تو نہیں کرتے کیا وہ اسے ایسی سزا کی دھمکی تو نہیں دیتے جو وہ کبھی نہ دینا چاہتے ہوں۔ کیا وہ اسے نیک بچہ بننے کے لئے ہوا یا چڑیل وغیرہ سے ڈراتے تو نہیں رہتے یہ تو ممکن ہے کہ وہ والدین کی ان دھمکیوں سے خوفزدہ ہوکر زیادہ محتاط ہو جائے۔ مگر اسطرح دیانتدار تو نہیں بن سکتا۔ اسی طرح اگر والدین بچہ سے خاموش رہنے پر مٹھائی دینے کا وعدہ کریں اور پھر اسے مٹھائی نہ دیں تو بچہ یہ محسوس کرے گا کہ والدین پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اس قسم کے بہت جھوٹ وہ جھوٹ نہیں سمجھتا اور وہ اسے کوئی اہمیت دیتا ہے۔ البتہ اب وہ مختلف قسم کی غلط بیانیوں کے درمیان تمیز کرنا سیکھ جاتا ہے مگر یہ تو کبھی نہ سیکھ پائے گا کہ جھوٹ خواہ وہ کسی قسم کا ہو برا ہے۔

آپ کا رویہ آپ کے الفاظ سے کہیں زیادہ زوردار ہوتا ہے۔ ممکن ہے پڑوس میں کوئی خاندان ناجائز ذریعے سے دولت کما کر امیر کبیر ہو گیا ہو والدین اگرچہ بددیانتی کو برا کہتے ہیں مگر اس پڑوسی خاندان کی امارت پر رشک کرتے ہیں اور ان کیساتھ خاص احترام سے پیش آتے ہیں تو بچہ بھی نتیجہ

نکلے گا کہ غالباً اس قسم کی بددیانتی باعزت ہوتی ہے۔ اگر ایک طالب علم سے یہ کہا جائے کہ تم امتحان میں ناجائز ذریعے استعمال نہ کرو مگر جب وہ انہیں ذریعوں سے نمایاں کامیابی حاصل کر لے تو اسکی تعریف کر دی جائے تو پھر وہ دیانتداری سے کام لینا کیونکر سیکھے گا۔ اگر سیاسی لیڈروں کو انکی چالاکی اور ہوشیاری کے سبب زیادہ پسند کیا جائے اور انکی راست بازی کو کوئی اہمیت نہ دی جائے تو راست بازی کی تعریف اور تحسین بے کار اور فضول ہے۔ لیکن والدین کے دیانتدار ہونے کی صورت میں انکے الفاظ بہت موثر ثابت ہو سکتے ہیں اور عمومی اصول وضع کرنے کے لئے الفاظ کی ضرورت مسلم ہے کیونکہ الفاظ تصور ذات کی نشو و نما میں اہم حصہ لیتے ہیں:۔

بعض اوقات بچہ برائی کے[1] الٹ چکر [شیطانی] میں اسطرح پھنس جاتا ہے کہ روز بروز جکڑتا ہی چلا جاتا ہے مثلاً کسی دن وہ کوئی بہت ہی معمولی سی چیز چرا لیتا ہے اور وہ بھی بغیر کسی بدنیتی کے تو اسکی سرزنش کر دی جاتی ہے کہ تم بہت برے بچے ہو۔ اس سے ہو سکتا ہے اسکی خود اعتمادی تنزل ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو برا بچہ محسوس کرنے لگے۔ جوں جوں وہ اپنے آپ کو کمتر اور برا محسوس کرے اسی قدر اسے پیار اور دلاسے کی ضرورت ہے۔ اسکی تلافی کرنے کے لئے وہ اور چوری کرتا ہے تاکہ کوئی میٹھی چیز خرید کر جھوٹی یا سستی خوشی تو حاصل کر لے اس پر اسکو پھر ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے نتیجہ میں جھوٹی خوشی حاصل کرنے کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے اور اسکے دل میں یہ خیال جگہ پکڑنے لگتا ہے کہ وہ واقعی برا بچہ ہے۔

علاج اسکا یہ ہے کہ (۱) بچے کے برے کام کو بچے کی ذات سے الگ اور علیحدہ کر دیا جائے۔ بچے سے یہ کبھی نہ کہا جائے کہ تم کسقدر بے وقوف ہو برے ہو بلکہ اس سے ہمیشہ یہ کہا جائے کہ کہ تم بڑے اچھے بچے ہو بہت ہوشیار اور سمجھ دار ہو مگر اس معاملے میں تم نے ہوشیاری سے کام نہیں لیا بلکہ چوک گئے۔ تم تو اچھے ہو مگر تمہارا یہ کام اچھا نہیں ہے بجائے اسکے کہ ہم بچے کے کام کو اس سے منسلک کر دیں ہمیں چاہیئے کہ اسے بچے سے علیحدہ رکھنے کی سعی کریں۔ (۲) بچے سے کبھی ایسا سوال نہ کرو جس کا جھوٹ میں بھی جواب دیا جا سکتا ہو مثلاً اگر آپ نہایت سختی سے اس سے یہ سوال کریں کہ میز پر جو

1 — Vicious circle

روپیہ تھا کیا وہ تم نے نہیں اٹھایا؟ عین ممکن ہے کہ آپ کے اس انداز سے وہ اسقدر گھبرا جائے کہ نفی ہی میں جواب
دینے ہی میں اسے سلامتی نظر آئے۔ پھر اس ایک جھوٹ کو نباہنے کی خاطر اسے متواتر کئی جھوٹ بولنا پڑیں
گے۔ آخر کار چاہے اسے مان ہی لینا پڑے کہ اس نے پہلے جھوٹ کہا تھا مگر بے کار اس لئے کہ اقرار کرنے
سے پہلے وہ کئی جھوٹ تراش لے گا آپ اپنے آپکو جھوٹا تصور کرتے ہیں اور نت نیا جھوٹ بولنے میں کافی
مہارت حاصل کر چکا ہوگا سمجھ دار والدین ایسے موقعوں پر بچے سے پوچھ گچھ تو ضرور کرتے ہیں مگر وہ اس
سے ایسے سوال پوچھتے ہیں جنکے جواب میں سچ بولنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ وہ حتی الوسع یہ کوشش
کرتے ہیں کہ بچے کے لئے جھوٹ بولنا آسان نہ رہے اور وہ سچ سچ بتا دے۔

اسکولوں میں جو تربیت ملتی ہے وہ ایمانداری کی بھی ہو سکتی ہے اور بے ایمانی کی بھی۔ ہم پہلے کہہ آئے
ہیں کہ جو استاد یہ کبھی تسلیم نہیں کرتا کہ وہ غلطی پر ہے وہ بچوں کو بے ایمانی زیادہ سکھاتا ہے اور دیانتداری کم اسکے
برخلاف جو نظام تعلیم ایماندارانہ اتحاد وعمل کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور محنت اور کوشش کا نتیجہ کامیابی و کامرانی
ہوتا ہے۔ تو ایسا نظام دیانت اور نیکی کی عادت استوار کرنے میں مدد دیتا ہے صرف زبان سے یہ تلقین کرتے
رہنا کہ نیک بنو۔ ناجائز ذرائع استعمال نہ کرو بے معنی بات ہے بعض اوقات اسکا الٹا اثر ہوتا ہے کہ بچے کسی
بھی نصیحت پر کان نہیں دھرتے۔ وہ اس قسم کی سب باتوں کو فضول سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

تعمیری فضیلت کا رویہ

ابھی ایک اور رویے کا مطالعہ کرنا باقی ہے جسکی ترقی یافتہ گروہی
زندگی میں بڑی اہمیت ہے اسے "تعمیری فضیلت"[1] کا رویہ یا
تعمیری اور سودمند[2] کام سرانجام دینے کا رویہ کہا جا سکتا ہے محض زندہ رہنے کے لئے انسان کو
کھانے، مکان اور کپڑوں کی ضرورت ہے مگر کسی تہذیب کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے
یہی تین چیزیں کافی نہیں ہیں بلکہ اس سلسلے میں کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً گھریلو صنعت کو
فروغ دینا۔ ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنانا۔ نظام تعلیم کو درست کرنا قومی دفاع کی فکر کرنا اور صحت عامہ وغیرہ

1 Constructive accomplishment. 2 Doing something useful

کے منصوبے سوچنا وغیرہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب ذمہ داریوں سے عہدہ برآہ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑی محنت، ہمت اور استقلال اور ذہانت کی ضرورت ہے اسکے برعکس ہم انسانی کوششوں کا ایک بڑا حصہ رسم پرستی اور ایک خاص انداز میں زندگی گذارنے میں صرف کر دیتے ہیں جسکے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ درست اور مناسب ہے مثلاً دولت مند آدمی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تفریحی مجلسوں یا ایسی سرگرمیوں میں گذار دیتے ہیں جو انکے معاشرتی وقار کو برقرار رکھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ انکے منصب دار وزرا ایسے آدمیوں کی خاطر مدارات میں صرف ہو جاتے ہوں جو اثر و رسوخ والے ہوں یا جنکی ہم نشینی کو وہ ذاتی طور پر پسند کرتے ہوں۔ ہو سکتا ہے ایسے لوگ سیاست کو محض چند گروہوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تصور کرتے ہوں اور اسکا مقصد اچھی حکومت قائم کرکے عوام کی بہبود کبھی نہ ہو۔ کسی منصب کو حاصل کرنا اس منصب کے فرائض انجام دینے سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہو صرف اسی کے لئے دیوانہ وار تگ و دو کی جاتی ہو۔ ہو سکتا ہے سرکاری دفتروں یا کالجوں میں کسی کام کے خاص طریق سے کرنے پر بے حد زور دیا جاتا ہو اور کسی معمولی کاغذ پر دستخط کروانے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہو۔ اساتذہ شاگردوں کو نئے نئے حالات سے نبٹنے کی تربیت دینے کی بجائے اپنا سارا وقت صرف اسی بات پر کر دیتے ہوں کہ چند مخصوص سوالوں کا جواب کیسے لکھنا چاہیئے کسی زبان کی املا اور روزمرہ پر خاص توجہ دی جاتی ہو یہ بات خاص دھیان میں رکھنے کی تلقین کی جاتی ہو کہ اعلےٰ طبقے کے لوگ کسی لفظ یا محاورے کو کیوں کر استعمال کرتے ہیں اور اس پر کبھی غور نہ کیا جاتا ہو کہ عمدہ اور افضل خیالات[1] کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ مشہور جاپانی اہل قلم نے ایک بار کسی مجلس[2] میں کہا تھا کہ اگر کوئی امریکی بچہ انگریزی کا یہ جملہ[3] لکھتا ہے تو استاد بگڑ جاتا ہے اور غلط قواعد لکھنے پر بچے کو ڈانٹ دیتا ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (۱) یا تو بچہ لکھنے سے گریز کرنے لگتا ہے یا (۲) اپنی تمام تر توجہ قواعد کے اصول یاد کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور جن "خیالات" کا اسے اظہار کرنا ہوتا ہے ان سے غفلت برتنے لگتا ہے۔ ایسے

---

1 Hayakawa

۲) ڈاکٹر آر سی سیلر اس مجلس میں موجود تھے۔

3 This year the apples aint so good around here

موقعوں پر غلط گرائمر لکھنے پر بچے کو ڈانٹنے کی بجائے اسے یہ کہنا چاہیئے کہ میں نے تم ایسا کیوں کہتے ہو کہ امسال یہاں سیب اچھے نہیں ہوئے ۔ نہیں یہ کیونکر معلوم ہوا نوجوان اپنے تجربے اور خیال سے کام لے کر ان سوالوں کا جواب لکھنے کی کوشش کرے گا اور اسے معلوم ہو گا کہ کسی خیال کے اظہار کے لئے تحریر کیسی ہونی چاہیئے بس اسی بات کا اسے احساس کرانا ہے ہمارے نزدیک بچے کو صحیح انگریزی لکھنا اسی طرح سکھایا جاسکتا ہے کہ اسکے پاس کہنے کو کچھ ہو" فقط قواعد کے اصول یاد کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا ۔

کچھ سال پہلے لاہور میں بعض طالب علموں نے یہ شکایت کی کہ امسال یونیورسٹی کے بعض سوالات وہی تھے جو گذشتہ سال پوچھے گئے تھے ۔ موضوع[1] اہم تھے لیکن طالب علموں کو خیال تھا کہ ممتحن تین چار سال کے پرچوں میں سے سوالات چنے گا ۔ انہیں اعتراض یہ تھا کہ ممتحن نے مناسب طریق کار اختیار نہیں کیا ۔ انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں انگریزی کا ایک ناول اسلئے رکھا جاتا ہے کہ طلبا کو "انگریزی پڑھنا" آجائے لیکن بعض اساتذہ یہ کرتے ہیں کہ ناول کا ملخص دے دیتے ہیں ممکن ہے اسطرح امتحان میں کامیابی حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہو لیکن اس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے ۔ متعدد امتحانی سوالات میں بھی کسی چیز کی تعریف پوچھی جاتی ہے یا کتب سے اقتباسات[2] مانگے جاتے ہیں یہ دیکھنے کی قطعاً کوشش نہیں کی جاتی کہ طلبا اپنے علم یا معلومات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر کالجوں کے بی اے پاس طلبا پڑھ لکھ کر یہ محسوس کریں کہ وہ کوئی مفید کام نہیں کر سکتے ۔

ممکن ہے امن کے زمانے میں کسی فوج کی اصلی توجہ صرف طریق کار پر ہو مثلاً یہ کہ پریڈ بالکل صحیح ہو جوتے خوب چمکیلے ہوں فوجی آداب کی بجا آوری پوری تفصیل سے ہو وغیرہ لیکن جنگ کے زمانے میں جب دشمن کو شکست دینا اشد ضروری ہوتا ہے تو توجہ طریق کار کی بجائے حصول مقصد پر زیادہ ہوتی ہے ان حالات میں جو افسر غنیم کو شکست دے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی بجائے طریق کار کی ہی فکر کرتا رہے اچھا افسر قرار نہیں دیا جاسکتا ۱۸۹۸ء کی ہسپانوی امریکی جنگ میں بعض امریکی افسروں کو بھی شکایت تھی کہ سب کچھ خراب ہو گیا ہے حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ امن کے زمانہ نے انکی عادتیں اسقدر بگاڑ

1. Topics. 2. Quotations

دی تھیں کہ جنگ میں جب انکے معمول میں فرق آگیا تو انہیں سب کچھ بگڑتا نظر آیا۔

پاکستان میں اعلےٰ کارکردگی

چوتھے باب میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ غالباً مغربی ثقافت میں عمل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے حصول تکمیل ہی تو زندگی کا آخری مقصد نہیں ہے۔ لیکن یہ ماننے بغیر بھی چارہ نہیں کہ کسی چیز کی ہیئت پر ہی تمام تر توجہ مرکوز کردینا اجتماعی کوششوں کو بڑی حد تک ضائع کرتا ہے۔ اور عوام کے لئے بہتر معیار زندگی کے حصول کو مزید مشکل کر دیتا ہے پاکستان ایسے نئے ملک میں ابھی بڑا تعمیری کام کرنا ہے۔ اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی طرح یہاں کے بچوں کو اعلیٰ کارکردگی کے قابل بنایا جائے تاکہ قوم مضبوط ہو اور ترقی کرے ہمیں زیادہ دلچسپی اس بات میں لینی چاہیئے کہ بچے کچھ کام کریں ہمیشہ انکے طریق کار کو درست کرنے کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ ممکن ہے انکا کوئی کھیل ہمیں بے کار اور بے معنی نظر آئے مگر ہو سکتا ہے کہ ان کے لئے بہت اہم ہو۔ ہمیں اس بات میں بھی کچھ زیادہ دخل نہیں دینا چاہیئے کہ وہ کیا شغل منتخب کرتے ہیں۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انکی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے تاکہ وہ قابل قدر اعمال میں حصہ لیں، والدین کی مدد کریں اور منصوبہ بندی وغیرہ میں انکا ہاتھ بٹائیں۔ اسلئے ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنا نہایت ضروری ہے جسمیں بچے کو کچھ کرنے کی تربیت دی جائے۔ کسی چیز کی تعریف یا کوئی مغلقہ فارمولہ محض زبانی یاد کرنے کی چیزیں تو نہیں ہیں انکے ذریعے تو مشکلات کو دور کرنے کا فن آنا چاہیئے تعلیم و تربیت کے بعض ذمہ دار استاد طالب علموں کو امتحان کے کمرے میں بھی نصابی یا امدادی کتابوں سے مدد لے لینے کی اجازت دے دیتے ہیں انکا خیال ہے کہ طالبعلموں کو کتابوں یا خلاصوں کو محض زبانی یاد کرنا نہیں سکھایا جانا چاہیئے بلکہ انہیں استعمال کرنا سکھانا چاہیئے عالم آدمی ہر چیز کو ازبر یاد کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ یہ جاننے کی سعی کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ چیز کیسے اور کیونکر جلد از جلد تلاش کر سکتا ہے۔ اسی طرح عملی تجربے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے آدمی کا طریق کار دہرایا جائے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ خود تجربہ کرکے کوئی چیز کیسے معلوم کی جاتی ہے یہ کسی قوم کا نظام تعلیم

ہی کر سکتا ہے کہ بچوں کو از خود کچھ حاصل کرنے کی تربیت دے سکے اگر تعلیمی نظام یہ فریضہ پورا کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے تو یہ گلہ فضول ہے کہ لوگ سست ہیں اور انکی مادی ترقی کی رفتار تیز نہیں ہے

ساتواں باب

مرد اور عورتیں

مردوں اور عورتوں کے متعلق آپکی رائے

ہم میں سے ہر شخص عورت اور مرد کی فطرت یا انکے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ جو میری رائے ہو وہ کسی دوسرے شخص کی نہ ہو اور جو رائے ایک معاشرے کی ہو وہ کسی دوسرے معاشرے کی رائے نہ ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ضمن میں نفسیاتی معلومات کیا کہتی ہیں۔ اس باب کو پڑھنے سے پہلے ذرا مندرجہ ذیل بیانات کی روشنی میں اپنا ایک مختصر امتحان لیتے چلیئے

پہلے نو بیان عورتوں اور مردوں کے درمیان اختلافات اور آخری سات بیان اُن کے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارے میں ہیں آپ "اتفاق ہے"۔ "اختلاف ہے"۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا" ان تینوں فقروں میں سے جو مناسب سمجھیں ان سوالات کے سامنے لکھ دیں۔

سوالات

(۱) اوسطاً مرد عورتوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔

(۲) جانیاتی ورثے میں مردوں کو عورتوں کے مقابلہ میں میکانکی استعداد زیادہ ملتی ہے۔

(۳) مردوں اور عورتوں کے مزاج اور دلچسپیوں میں فرق سراسر تربیت کے باعث پیدا ہوتا ہے

(۴) مردوں میں فطرتاً عورتوں کی بہ نسبت شہوانی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔

(۵) مردوں میں فطری طور پر عورتوں کی نسبت زیادہ جارجیت ہوتی ہے اور عورتوں کا کردار نسبتاً انفعالی[1] ہوتا ہے۔

(۶) عورتیں فطرتاً بے وفا ہوتی ہیں۔

(۷) ہم جنسیت[2] کے امکانات مردوں اور عورتوں میں برابر پائے جاتے ہیں۔

(۸) مرد عورتوں میں خوب صورتی کے زیادہ خواہاں ہوتے ہیں لیکن عورتیں مردوں میں خوب صورتی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔

(۹) مرد فطرتاً ایک سے زیادہ بیویاں چاہتا ہے لیکن عورت صرف ایک مرد کی ہی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔

(۱۰) شخصیت میں پختگی اور سنجیدگی حاصل ہونے کے لئے شادی بہت ضروری ہے عورت یا مرد کا مجرد زندگی بسر کرنا (۱) غیر طبعی[3] ہے (۲) بدچلنی[4] یا حرمان نصیبی[5] ہے۔

(۱۱) اگر لڑکوں اور لڑکیوں کو مناسب جنسی تعلیم دی جائے تو جنسی مشکلات بہت کم پیدا ہونگی۔

(۱۲) اگر طلاق کی عام اجازت ہو تو شادی شدہ زندگی میں زیادہ انتشار پیدا ہونے کا امکان ہے لیکن مردوں اور عورتوں کو اگر یہ معلوم ہو کہ شادی عمر بھر کا ساتھ ہے تو وہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کریں گے۔

(۱۳) حسد عین فطری ہے۔

(۱۴) جوان مرد اور جوان عورت کی مثال آگ اور تیل کی ہے اگر دونوں کو کھلے بندوں ساتھ رہنے کا موقعہ دیا جائیگا تو آگ ضرور بھڑکے گی اس لئے جہاں انکو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ وہاں بدچلنی کی شرحیات کم ہونگی۔ اسلئے شادی بیاہ کا وہ نظام جسمیں میاں بیوی کا انتخاب والدین کرتے ہیں اس نظام کی بہ نسبت انسانی فطرت کیلئے زیادہ موزوں ہے جسمیں لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنا اپنا بر چننے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔

(۱۵) اگر جنس پر مذہبی اور معاشرتی پابندیاں نہ ہوتیں تو مرد اور عورت اپنے اپنے فطری تقاضوں کی

1 Passive. 2 Homo-Sexuality 3 Abnormal
4 Immoral. 5 Frustration

پیروی کرتے اور دُنیا میں محرومی اور ناخوشی نسبتاً کہیں کم ہوتی۔

کیا آپ نے ان سب بیانوں کے سامنے اپنے حسبِ منشا اتفاق ۔ اختلاف یا کچھ کہا نہیں جا سکتا کے الفاظ لکھ دیئے آپ کے کتنے فیصلے ذاتی تجربے اور مشاہدے پر منحصر ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو محض قیاسی یا سنے سنائے ہیں ؟

مرد اور عورت میں ذہانت

اب ہر بیان کے متعلق ماہرین نفسیات کی رائے دیکھنا چاہیے۔ ان کا ان بیانوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ بیان نمبر ۱ یہ ہے کہ کیا مرد فطرتاً عورت سے زیادہ ذہین ہوتا ہے۔ نفسیاتی شواہد کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ مرد فطرتاً عورتوں سے زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔ پیدائشی عمومی[1] ذہانت کسی چیز کو سیکھنے مختلف اشیاء کے درمیان باہمی تعلقات کو جاننے اور پرانے تجربے سے مستفادہ کرتے ہوئے نئے حالات کو سلجھانے کا نام ہے۔ اسکا انحصار کسی نہ کسی طرح دماغ کی نوعیت اور اسکے وصف پر ضرور ہوتا ہے لیکن آموزشی صلاحیت جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے مثلاً اپنی زبان کا کوئی نیا فقرہ کسی دوسری زبان کے فقرہ کے مقابلہ میں ہم بہت جلد سیکھ لیتے ہیں۔ ایک منجھا ہوا باورچی اناڑی باورچی کے مقابلہ میں کوئی نیا کھانا پکانا نہایت آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ مگر جہاں تک محض سیکھنے کا تعلق ہے تجربہ کار باورچی کو دوسرے کی نسبت بہت ہی کم سیکھنا پڑتا ہے۔ ذہانت کی ایسی آزمائشیں کی جا سکتی ہیں جنہیں عورتوں اور مردوں کو ذہانت کے اظہار کے برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ اگر معاشرہ عورتوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا پورا پورا موقعہ دیتا ہے اور کوئی انکے کانوں میں یہ نہیں پھونکتا رہتا کہ وہ مردوں سے نسبتاً کمتر ہیں تو یہ آزمائشیں صاف صاف ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مردوں سے ہرگز کمتر نہیں ہوتیں۔

مرد اور عورت میں میکانکی صلاحیت

دوسرے بیان کے متعلق یعنی حیاتیاتی [?] ورثہ میں مردوں کو عورتوں کی نسبت میکانکی صلاحیت زیادہ ملتی ہے۔ کوئی کلیہ تو نہیں وضع کیا جا سکتا تاہم نفسیات کے عالم من حیث الجماعت یہ بات

1 Inborn natural intelligence.

مانتے ہیں کہ مردوں میں عورتوں کی نسبت میکانکی استعداد زیادہ ہوتی ہے عمومی ذہانت میں اگرچہ مرد اور عورت برابر ہوتے ہیں مگر جہاں تک کسی مخصوص استعداد یا استعدادوں کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ استعداد سے ہماری کیا مراد ہے۔ استعداد کے معنی ہیں کسی کام کو آسانی سیکھنے کی قابلیت۔ اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر برابر کی سہولتیں اور موقعے دئے جائیں تو۔۔ لڑکے میکانکی میں لڑکیوں سے زیادہ مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ استعداد کو دلچسپی سے جدا کرنا یا الگ سمجھنا واقعی مشکل ہے کیونکہ ہم فطری طور پر انہیں باتوں کو جلدی سیکھتے ہیں جنمیں ہمیں دلچسپی ہوتی ہے اسلئے غالباً یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ لڑکے فطری طور پر اشیا میں دلچسپی لیتے ہیں اور لڑکیاں اشخاص میں اسلئے انکی دلچسپیاں اپنے اپنے دائرے میں بڑھتی ہیں اگر ہم لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے لئے الگ کھلونے منتخب کرنے کا اختیار دے دیں تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑکے جھگڑے۔ موٹریں اور بندوقیں انتخاب کرتے ہیں اور لڑکیاں گڑیاں۔ اسی طرح کسی زبان کو حاصل کرنے میں جس استعداد کی ضرورت ہوتی ہے عورتیں اسمیں مردوں سے فوقیت رکھتی ہیں ۱۸ ماہ کے بچوں کے متعلق ایک خاص مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس عمر کی بچیوں نے جو باتیں کیں اسکا ۲۸ فیصدی حصہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسکے برعکس لڑکوں کی باتوں کا صرف ۱۴ فیصدی حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کالجوں میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ اگر لڑکیاں بولنے میں زیادہ نہ شرمائیں تو وہ ہر زبان لڑکوں کی بہ نسبت بہتر طور پر بول اور سیکھ سکتی ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے مقابلے میں ریاضی میں زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ اسکے مقابلہ میں لڑکیوں کا حافظہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور انکی قوت فکر بھی نسبتاً زیادہ واضح اور صاف ہوتی ہے۔ بعض تجربوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خاص قسم کے منطقیانہ استدلال میں لڑکے لڑکیوں سے کہیں آگے ہوتے ہیں لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انکی قوت فیصلہ تیز ہوتی ہے اسکے علاوہ مغرب میں موسیقی اور شطرنج کے جتنے ماہر گذرے ہیں ان میں عورت کوئی نہیں ہے۔

اس قسم کے بیشتر تجربات مغرب میں کئے گئے ہیں لیکن قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ثقافتی اختلاف کچھ زیادہ نہ ہوں گے نظر بھی آتا ہے کہ ساری دنیا میں اوسطاً مرد اور عورت بعض

خاص قسم کی استعدادوں میں بڑی حد تک ایک دوسرے سے یقیناً مختلف ہوتے ہیں لیکن ہم اسے ثابت
نہیں کر سکتے ہو سکتا ہے کہ ان اختلافات کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہو جنسی فوقیت کو ہر
جگہ بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ کہیں بھی یکساں سلوک نہیں ہوتا انہیں
یکساں سہولتیں بھی کہیں میسر نہیں ہیں۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ انکے ذہنی اختلاف کا سبب ماحول ہو جس میں وہ پرورش
پاتے ہیں لیکن نفسیات کے ماہر اس معاملہ میں ماحول کے مختلف ہونے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ان
کا کہنا ہے کہ جہاں ماحول بالکل یکساں کر دیا جاتا ہے وہاں بھی اس قسم کے اختلافات مٹ نہیں جاتے۔
ماحول کا اختلاف بھی غالباً اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں مختلف قسم کا ماحول پسند کرتے ہیں والدین
کا لڑکوں کو موٹر کار اور لڑکیوں کو گڑیاں دینے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں ایک بڑی حد تک یہی کھلونے
پسند ہوتے ہیں۔ پس نتیجہ کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اوسط درجے کے لڑکے کو ورثہ میں اوسط درجے کی
لڑکی سے میکانکی دلچسپی اور استعداد نسبتاً زیادہ ملتی ہے۔ لفظ "اوسط" خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ متعدد
لڑکیوں میں اوسط درجے کے لڑکے سے کہیں زیادہ میکانکی استعداد ہو سکتی ہے چنانچہ یہ کہنا انتہائی حماقت
ہے کہ چونکہ اوسطاً لڑکے اور لڑکی کی میکانکی استعداد میں فرق ہوتا ہے اسلئے لڑکیوں کو انجنیئر نہیں بنانا چاہیئے
بھلا کبھی ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ چھوٹے قد کے لڑکے کو فٹ بال نہیں کھیلنا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی بے نظیر کھلاڑی
کیوں نہ ہو۔ عورتوں اور مردوں کے عمومی اختلافات کی بہ نسبت انفرادی اختلافات زیادہ اہم ہیں۔ اسلئے
استعدادی اختلافات کا ہمیں بغور مطالعہ کرنا چاہیئے ممکن ہے انہیں سے بیشتر اختلاف کا سبب یہ ہو کہ عورتوں
اور مردوں کو یکساں مواقع میسر نہیں آتے یا ہو سکتا ہے کہ چند ایک امتیازات پیدائشی ہوں۔ اب تیسرے
بیان پر غور کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے مزاج اور دلچسپیوں میں جو فرق نظر آتا ہے
اسکا سبب محض وہ تربیت ہے جو انہیں دی جاتی ہے یا کچھ دوسرے عوامل بھی اسکے ذمہ دار قرار دیئے جا
سکتے ہیں۔ ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دلچسپیوں کا استعداد سے گہرا تعلق ہے اور اسی لئے غالباً وہ ورثے
شدید طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ یہ بات تجربے میں آ چکی ہے کہ اگر ایک مرغ کے خون میں اسکی مادہ کے ہارمون
پہنچا دیئے جائیں تو وہ بھی مرغی کی طرح انڈوں پر بیٹھنے لگتا ہے۔ اور یہ ہم جانتے ہیں کہ مادہ ہارمون ورثہ

میں ہی پلتے ہیں۔ باہر سے تو جسم میں نہیں پہنچائے جاتے۔ اسی طرح وہ بچہ فطری طور پر ریاضی میں اس بچے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی لیتا ہے جسے متعلقہ استعداد کا وافر حصہ ورثہ میں ملتا ہے۔

مرد اور عورت کا مزاج

اب مرد اور عورتوں کے مزاج کو لیجئے دیکھا یہ گیا ہے کہ مختلف معاشروں میں مرد اور عورت کے مزاج میں جو اختلاف ہے ہر جگہ اسکی نوعیت ایک سی نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ مزاجی صفات رسوم اور رواج سے بہت متاثر ہوتے ہیں تاہم اختلاف کی نوعیت ایسی بھی نہیں کہ کوئی عمومی فیصلہ نہ کیا جا سکے۔ اکثر رجحانات مردوں اور عورتوں میں ہر جگہ یکساں ہیں مثلاً امریکہ جہاں مرد اور عورت کے مزاج کے متعلق امتیاز اور فرق کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرد جانبازی کے شوقین ہوتے ہیں لہٰذہ وہ عموماً ایسے کاموں کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں جہاں سخت کوشی درکار ہو اور جنہیں مشینوں اور ہتھیاروں وغیرہ سے سابقہ پڑے علاوہ بریں انہیں صنعت و حرفت تجارت اور دوسرے سائنسی کاموں سے بھی گہرا لگاؤ ہوتا ہے برخلاف اسکے عورتیں بالعموم امور خانہ داری اور فنون لطیفہ کی زیادہ دلدادہ دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ایسے کام پسند کرتی ہیں جو چپ چاپ گھر میں بیٹھ کر انجام دیئے جا سکیں انہیں ایسے مشاغل بھی بے حد مرغوب ہیں جنہیں دوسروں کی دانشت و پرداخت شامل ہو مثلاً انہیں بچوں کی دیکھ بھال کرنا بے کسوں اور حاجت مندوں کی امداد کرنا بیحد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مرد بالواسطہ یا بلاواسطہ جارحانہ اقدام پر مصر رہتا ہے اور خود اعتمادی کا زیادہ مظاہرہ کرتا ہے وہ نسبتاً زیادہ بے باک اور نڈر ہوتا ہے۔ انکا لب و لہجہ اور زبان بھی زیادہ درشت اور غیر محتاط ہوتے ہیں اور جذبات اور احساسات بھی نسبتاً کھردرے اور غیر لطیف ہوتے ہیں۔ عورتیں نسبتاً زیادہ رحم دل مہربان اور جذباتی ہوتی ہیں اور وہ مرد کی نسبت اخلاق کی زیادہ پابند ہوتی ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی اعتراف ہوتا ہے کہ وہ مرد کی نسبت جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں اور انہیں اپنے جذبات پر بھی قابو کم ہوتا ہے جو سنتے پاپکڑیں اور چھٹے بیان میں بھی عورتوں اور مردوں کے مزاج کا ہی ذکر ہے لیکن انکا ذکر کرنے سے پہلے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مرد اور عورتوں کے باہمی اختلاف کا انحصار ان ۲۳ جواہر تخلیق پر ہوتا ہے جو ۲۳ اجسام لونیہ میں سے کسی ایک جسم لونیہ کے متعلق ہوتے ہیں یعنی یا ۴۶ اجسام لونیہ تو اتفاقیہ کسی لڑکے

یا لڑکی کے حصے میں آجاتے ہیں۔ اسلئے یہ نہایت آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی مشترکہ صفات اگرچہ دفعہ اہم ہیں تو انکے اختلافات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ۲۳ ویں مادہ تولیہ کے جواہر تخلیق ہی انکے وظائف تولید کو متعین کرتے ہیں اور یہی بعض دوسری جسمانی صفات مثلاً قد و قامت آواز کا لوچ عضلات کی نشو و نما یا جسم پر بالوں کی فراوانی وغیرہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی مردوں کے جسم کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی توانائی کو بجلد خرچ کر دیتے ہیں اور عورتوں کے جسموں کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنی توانائی محفوظ رکھتے ہیں تاکہ وہ بعد میں کسی کی پرورش یا خود انکی اپنی ذات کے کام آسکے۔ مثال کے طور پر اگر ایک ننھے بچے اور ننھی بچی کی یکساں نگہداشت کی جائے تو دونوں میں سے بچے کے فوت ہوجانے کے امکان زیادہ ہوتے ہیں۔ مردوں میں عورتوں کی بہ نسبت رنگ کوری[1] زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح باوجود یکساں ذہانت کے انکی مخصوص استعدادوں میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ اسلئے عین ممکن ہے مردوں اور عورتوں کے مزاج کا فرق بھی مختلف غدود کے باعث ہو لہذا جواہر تخلیق اور مزاج کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ بھی عین فطری ہے کہ سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کی حیثیت جدا جدا ہو۔ اور انکے مابین جو اختلاف ہے وہ بھی ہمیشہ قائم رہے ::

مرد اور عورت میں جنسی خواہش

ان باتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب چوتھے پانچویں اور چھٹے بیان کا ایک مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلے دو بیانوں یعنی چوتھے اور پانچویں کے متعلق نفسیات کے ماہروں کا جواب اثبات میں ہے اور تیسرے یعنی چھٹے بیان کی وہ نفی کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مرد میں اوسطاً عورت کی بہ نسبت جنسی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو سوالنامے عورتوں کو دیئے گئے انمیں زیادہ تر عورتوں نے یہی لکھا کہ انکے شوہروں میں جنسی خواہش زیادہ ہے اسی طرح مردوں نے یہ بتایا کہ انکی بیویوں میں نسبتاً جنسی خواہش کم ہے لیکن اس قسم کے جوابات کو نقل کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس معاملہ میں بڑی حد تک اوورلیپنگ[2] ہوسکتی ہے یعنی بہت سی عورتیں ایسی ملتی ہیں جنمیں اوسط درجے کے مرد کے مقابلے میں جنسی خواہش زیادہ ہوتی ہے اور بہت سے مرد ایسے ہوتے

1 Colour-blindness, 2 Over-lapping.

جنھیں اوسط درجے کی عورت کے مقابلے میں جنسی خواہش کم ہوتی ہے ایک دفعہ کی تحقیق کے سلسلے میں ۷۹۲[1] امریکی خاوندوں سے پوچھا گیا کہ مہینے میں انہوں نے کتنی بار مباشرت کرنا چاہی تو ۲۰ سے ۲۹ سال والوں کا اوسط ۸ء۱۶ اور اسی عمر کی عورتوں کا اوسط ۷ء۳۷ نکلا۔ ۶۰ یا ۶۰ سے زائد عمر کے مردوں کا اوسط ۴ء۸ اور عورتوں کا ۵ء۰ اوسط نکلا۔ انفرادی اختلاف ہر جگہ خاصا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ انھیں جنسی خواہش کم ہوتی ہے اسلئے وہ یہی بتاتی ہیں کہ انھیں یہ خواہش کم ہے لیکن زیادہ عمر کے مرد اور عورتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں یہ سبب اسکو واضح نہیں کرتا۔ جنسی خواہش کے بارے میں جو بھی عام خیال ہوتے ہیں وہ بدلتے رہتے ہیں اور ان میں اکثر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً پچھلی صدی "عہد وکٹوریہ" میں یہ خیال عام تھا کہ شریف عورتوں میں جنسی خواہش بالکل نہیں ہوتی اور مباشرت صرف اسلئے کی جاتی ہے کہ مردوں کی بہیمانہ[2] خواہشات کو آسودگی ملے اور اولاد پیدا کی جائے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور عورتوں میں بھی جنسی خواہش ہوتی ہے اور وہ بھی اسکی تسکین چاہتی ہیں تو یہ کہا جانے لگا کہ جنسی خواہشات کے معاملہ میں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ یہ نظریہ بھی چنداں صحیح نہیں ہے کیونکہ جنسی افعال کے معاملہ میں لڑکیاں کم پہل کرتی ہیں مباشرت میں پہل عموماً مردوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ لڑکیوں میں جلن کی علت ہوتی ہے مگر لڑکوں سے کہیں کم ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ مرد میں عورت کی بہ نسبت زیادہ جارحیت ہوتی ہے چونکہ وہ اپنی توانائی کو تیزی سے خرچ کرنے پر آمادہ رہتا ہے اسلئے پیش قدمی بھی وہی کرتا ہے بیشتر حیوانوں میں بھی ہوتا ہے کہ نر مادہ کی نسبت زیادہ مستعدی سے خوراک کی تلاش کو نکلتا ہے اور اسپر قبضہ رکھنے کے لئے دوسرے سے لڑتا ہے۔ ابھی ابھی یہ لکھا جا چکا ہے کہ نرینہ جنسی ہارمون کے انجکشن سے بعض حیوانوں میں جارحانہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور مادینہ ہارمون سے مادری صفات پیدا کی جا سکتی ہیں۔

1 Psychological Factors in Marital Happiness: Terman

2 Beastial.

دراصل مرد کا تمام تر رویہ جارحانہ اقدام کرنے میں اسکی بے حد مدد کرتا ہے۔

عورتوں کی اثر پذیری

باوجود ان سب حقائق کے عورتوں کے کردار کو محض انفعالی کہنا بھی درست نہیں بلکہ اسے "پذیرا کن"[1] کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ بعض پرندوں میں مادہ اڑ کر بھاگ جاتی ہے اور اسطرح نر کو اپنا پیچھا کرنے کی ترغیب دیتی ہے یہی بات انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ عورتوں کے نخرے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں نخرے مرد کو لبھانے کیلئے نہ کئے جاتے ہیں امریکہ میں عورتوں اور مردوں کی گفتگو کے ذہنی مطالعہ سے پتہ چلا ہے کہ عورتیں مردوں کی بابت زیادہ گفتگو کرتی ہیں اور مرد عورتوں کے متعلق کم باتیں کرتے ہیں اس خیال کی صداقت پر تحقیق نے مزید روشنی ڈالی ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت "اشخاص" میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں ایک امریکی لڑکی سے جب یہ پوچھا گیا کہ اسے رقص کرنا کیوں پسند ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے رقص اسلئے پسند ہے کہ اس میں مرد پہل کرتا ہے وہ راہنمائی کرتا ہے میرے پاؤں اسکی تقلید میں اٹھتے ہیں پھر بھی ہم بے تال نہیں ہوتے۔ مگر اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ میری زندگی پر چھا جائے۔ رقص ایک کھیل ہے کھیل میں مجھے مرد کے پیچھے ہی چلنا بھلا لگتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے معاملات میں میں برابر کا حق چاہتی ہوں" کیا لڑکی کا یہ جواب عورت کی فطرت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو جو تربیت دی جاتی ہے اور ان سے جو توقعات رکھی جاتی ہیں وہ اول الذکر کو جارحانہ بنا دیتی ہیں اور موخر الذکر کو انفعالی یا نسائی روپ میں ڈھال دیتی ہیں۔ پانچویں باب میں ہم جینی بچی اور یونو کے ایک بچے کا ذکر کر چکے ہیں دونوں کی شخصیت پر ان سے وابستہ توقعات اور تربیت کا جو اثر ہوا وہ نہایت کامیاب تھا کیونکہ لڑکوں کو مردانہ صفات کا حامل بنانا اور لڑکیوں کو نسائیت کا جامہ پہنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ المختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی مرد عورتوں کی بہ نسبت زیادہ جارحانہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی وفا یا بے وفائی

عورتوں کی بے وفائی کے متعلق نفسیات کا کیا فیصلہ ہے کیا وہ دائمی فطرتاً بے وفا ہوتی ہیں؟ نفسیات کے عالم

1. Receptive

ہرگز یہ ماننے کو تیار نہیں کہ کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد فطرتاً بے وفا پیدا ہوتا ہے۔ وفا کیشی یا بے وفائی تو زندگی کے تجربات سے پیدا ہوتی ہے قرون وسطیٰ میں کبڑوں کو کمینہ اور بے ایمان سمجھا جاتا تھا۔ کوئی شخص ان پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ ہر شخص انہیں شک کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ لہٰذا ان میں سے اکثر واقعی کمینے اور بے ایمان ہو جاتے تھے۔ اور ان کے بشرے سے فطری بے ایمانی صاف جھلکتی تھی۔ اسی طرح اگر عورتوں کو بے وفا سمجھا جائے ان پر شک کیا جائے اور ان کی آزادی محدود کر دی جائے یا ان کی وفاداری کا ان کے شوہروں پر کوئی اثر نہ پڑے تو وہ اگر بے وفا ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

ضرب الامثال عموماً سچ نہیں ہوتیں متعصبانہ خیالات اور نظریات بھی عام ہوتے ہیں۔ اپنے بجائے دوسروں سے سوءِ ظن رکھنا بھی زیادہ آسان ہے بیشتر معاشروں میں رائے عامہ کو متاثر کرنا مردوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زیادہ آسانی کے ساتھ لوگوں سے مل جل سکتے ہیں اور اخلاقی تعلیمات وضع کرتے ہیں۔ انہیں کی باتیں زیادہ وزنی سمجھی جاتی ہیں نتیجتاً عورتوں کی بے وفائی مرد کی بے راہ روی سے زیادہ مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ جب ہم اپنی بعض خامیوں کے سبب اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگتے ہیں تو غیر ارادی طور پر نہایت آسانی سے ہم انہیں نقائص کا کسی اور کو مجرم گردانتے لگتے ہیں ایک شوہر جو خود بے وفا ہوتا ہے وہ آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ اس کی بیوی بھی بے وفائی کر رہی ہے۔ اور چونکہ عورتوں کی بے وفائی زیادہ سنگین سمجھی جاتی ہے اس لئے اس قسم کا اتہام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاں ایک بار عصبیت کی داغ بیل پڑ گئی وہ بڑھتی ہی جاتی ہے کثیر تاریخی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا پر متعدد ملکوں میں یہودیوں کے خلاف زبردست تعصب پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کوئی یہودی "خود غرضی" سے کام لیتا ہے تو عام لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے اگر یہودی خود غرض نہیں تو وہ یہودی ہی نہیں لیکن جب وہ سخاوت کرتا ہے تو لوگ اسے مثالی یہودی ماننے بلکہ انہیں اس کے یہودی ہونے میں شبہ ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی یہودی کا عام آدمی کی طرح "فیاض" ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے اس قسم کی عام اور مروجہ روایتوں کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ہمارا مشاہدہ نہایت

بنز ہونا چاہیئے اور ہمیں متعدد اعداد و شمار کی بھی مدد لینا چاہیئے صرف اس بنا پر کہ ہر شخص یہی کہتا ہے کسی امر کو درست مان لینے کے لئے کافی نہیں ہے چونکہ مردوں میں زیادہ جنسی خواہش ہوتی ہے۔ اسلئے ان سے بے وفائی کی توقع زیادہ ہونی چاہیئے خصوصاً جب کہ انہیں گھر سے باہر گھومنے پھرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی خاوند اپنی بیوی سے بے وفائی کرتا ہے تو کیا ہم اسے اسی طرح مجرم گردانتے ہیں جسطرح کہ اگر کوئی بیوی بے وفائی کرے تو ہم اسے مجرم ٹھیراتے ہیں۔ کیا ہم یہ تصور نہیں کر لیتے کہ مرد تو بے وفائی کیا ہی کرتے ہیں لہذا انکی "بے وفائی" کا تذکرہ ہی فضول ہے البتہ عورت کی لغزش اسکے لئے باعث رسوائی ہو جاتی ہے۔ آخر ہم یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں کہ عورتیں زیادہ بے وفا ہوتی ہیں یا مرد۔ بے وفائی سے کیا مراد ہے۔ کیا چکلوں میں آنا جانا "بے وفائی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اسی طرح اگر ایک مرد اور عورت زنا کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا دونوں کی بے وفائی ایک درجہ کی نہیں ہے۔ یا اگر کوئی مرد اپنی پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی کر لیتا ہے تو کیا وہ "بے وفائی" کا مجرم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عورت شوہر کی مرضی کے خلاف زیادہ آزادی چاہتی ہے تو کیا وہ "بے وفا" ہے اس قسم کے الزامات سے جو عام لوگوں کی زبان پر ہوں کہ عورتیں بے وفا ہوتی ہیں کسی ثقافتی گروہ کی نفسیات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مگر اس سے حقیقت حال کا صحیح اندازہ تو نہیں کیا جا سکتا۔

مرد اور عورت میں جنسیت

ساتواں بیان یہ تھا کہ کیا ہم جنسیت عورتوں میں بھی اسی قدر عام ہے جتنی مردوں میں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم جنسیت کے متعدد اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض چھوٹے اور قدیمی معاشرتی گروہوں میں یہ علت کہیں نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ اسلئے یہ کہنا تو کچھ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ انسان میں ہم جنسیت کا رجحان فطری ہے لیکن بیشتر معاشروں میں مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد فطری طور پر ہم جنسیت کی طرف مائل نظر آتی ہے اس کا سبب ماحول اور فضا تو نہیں ہے۔ زندگی کے تجربات ہر بلد اہم اور پر معنی ہوتے ہیں۔ انسانوں میں جنسی خواہش واقعی بہت شدید ہوتی ہے اسلئے جب اسکی

تسکین مخالف جنس کے افراد کے ذریعے پوری نہیں ہوتی تو اپنی ہی جنس کے افراد کی طرف رجوع کرنا ناممکنات سے نہیں ہے۔ متعدد افراد اسی حالت میں ہم جنسیت کی طرف راغب ہو جاتے ہیں جیلوں میں بھی ہم جنسیت عام ہے۔ اگر مرد عورتوں سے علیحدہ رہیں جیسے فوجوں میں یا کالجوں کے ہوسٹلوں میں تو ہم جنسیت کے پیدا ہونے کے امکانات زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر لڑکیوں کے گروہ ایک جگہ اکھٹے رہیں تو انہیں بھی یہ خواہش پیدا ہو سکتی ہے چونکہ مردوں میں جنسی خواہش زیادہ فعال ہوتی ہے اسلئے انہیں ہم جنسیت کی وبا آسانی سے پھیل سکتی ہے۔ اور جہاں مرد جلدی شادی نہیں کرتے ہیں وہاں بھی ہم جنسی مقاربت کا امکان ہے۔ اسکے علاوہ اگر کوئی معاشرہ مردوں کو تو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں جنسی خواہش کی تسکین کر لیں مگر عورتیں کے لئے اس قسم کی کوئی رعایت" نہیں ہوتی۔ وہاں عورتوں میں ہم جنسیت بہ نسبت مردوں کے زیادہ بڑھتی ہے۔ ایک بار حضرت عمرؓ کے سامنے یہی مسئلہ پیش ہوا اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر سپاہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سال میں ۴ ماہ اپنی بیوی کے ساتھ رہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ اس قانون کو جاری رکھنے کے کچھ اور اہم اسباب بھی ہوں محض عورتوں اور مردوں کی علیحدگی ہم جنسیت کا واحد سبب نہیں ہو سکتی۔ اوائل طفولیت میں گھر کے لوگوں کے ساتھ جو جذباتی تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ وہ بھی انزانداز ہوتے ہیں اور یہ کہ قرب وجوار میں ہم جنسیت کی علت میں گرفتار لوگ بھی جو بچے سے قریب نہ ہوتے ہیں اسے اس راستہ پر لگانے کا باعث ہو جاتے ہیں۔ بعض نفسیات کے ماہروں کا یہ بھی خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں کا حد سے زیادہ آزادانہ طریق پر ملنا جلنا بھی ہم جنسیت کو ہوا دے سکتا ہے۔ کیونکہ جب لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی جھجک نہ رہے اور دونوں شرم حیا سے بے پروا سامنے سامنے پھرتے نظر آئیں تو مخالف صنف کے فرد کے لئے جنسی کشش کم پڑ جاتی ہے جنسی کشش کا بڑا سبب تو مرد اور عورت کی جبری علیحدگی ہوتا ہے۔ شرم حیا اس کشش کو تقویت دیتے ہیں۔ مگر جب لڑکیاں بھی لڑکوں کیطرح ڈنٹر پیلتی پھریں تو ان میں ایک دوسرے کے لئے پہلی سی کشش باقی نہیں رہتی اور ہم جنسیت آسان ہو جاتی ہے۔

معاشرتی رسوم کا بھی ہم جنسیت کی ترویج میں نمایاں حصہ ہے۔ مثلاً جب یونانی تہذیب اپنے پورے

عروج پر تھی تو اعلیٰ طبقے کے مردوں میں ہم جنسیت ناپسندیدہ اور مذموم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح امریکہ اور سائبیریا کے بعض انڈین قبیلوں میں ہم جنسیت عام ہے۔ آج کل انگلستان میں باقاعدہ ایک مہم جاری ہے کہ اسے غیر قانونی قرار نہ دیا جائے۔ اسکے برخلاف قدیم عبرانیوں نے اسے سخت قابل تعذیم اور احتساب قرار دیا ہے۔ مغرب میں سے مردوں میں بہ نسبت عورتوں کے زیادہ برا سمجھا جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ ہم جنسیت کسی ایک یا دونوں جنسوں کے افراد میں رائج ہو سکتی ہے اور یہ کہ اسکا دارومدار ایک بڑی حد تک بعض ثقافتی قوتوں پر منحصر ہے۔

مرد اور عورت اور خوبصورتی

اب آٹھویں بیان پر غور کرنا ہے کیا مرد عورتوں کی خوبصورتی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور عورتیں مردوں میں خوب صورتی کی چنداں پرواہ نہیں کرتیں یہ غالباً بعض معاشروں میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن خوبصورتی کا معیار مختلف زمانوں اور معاشروں میں مختلف رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دبلی پتلی نازک اندام عورت کو خوبصورت سمجھا جاتا تھا پھر ایک دور ایسا آیا جبمیں مضبوط اور قد آور عورتیں پسند کی جانے لگیں۔ ایک زمانے میں تنومند اور بھرپور سینہ والی عورتیں کو ہی خوبصورت تصور کیا جاتا تھا یہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ عورت ایسے مرد کو پسند کرتی ہے جو مضبوط ہو اور اسکی اور اسکے بچوں کی حفاظت کر سکے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ عورت کی نزاکت مرد کو صرف اسلئے بھاتی ہو کہ وہ اسکے اپنے غرور توانائی کو آسودگی بخشتی ہے اکثر اکبت سے پہلے چین میں عورت کمزور و نحیف جسم والے عالم آدمی کو طاقت ور اور قوی ہیکل سپاہی پر کہیں زیادہ ترجیح دیا کرتی تھی کیونکہ معاشرہ میں عالم آدمی کا مرتبہ اجڈ سپاہی سے بہت بلند تھا۔ کچھ مدت ہوئی متعدد پاکستانی طلبا اور طالبات سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ اپنے لئے کن خوبیوں کا رفیق حیات پسند کریں گے۔ لڑکوں نے لڑکیوں کی نسبت "خوبصورتی" کا زیادہ ذکر کیا اگرچہ انہوں نے خوبصورتی کے علاوہ بعض دوسری صفات کا ذکر بھی کیا مثلاً انہیں سے بیشتر طلبا نے یہ کہا کہ بیوی صرف خوبصورت نہیں ہونی چاہیئے وہ خوش مزاج اور ہمدرد بھی ہونی چاہیئے۔ مرد سپنوں میں سینما کی حسین جمیل ایکٹریس تو بلاشبہ دیکھتے ہیں مگر متاہل زندگی میں حسن کے علاوہ دوسری خوبیوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی کشش کا بڑا باعث حسن ہی ہو

لیکن ہمہ تن گرویدہ بنانے کے لئے محض حسن کافی نہیں اسکے لئے چند دوسری چیزوں کا ہونا بھی اشد ضروری ہے۔

مرد اور عورت اور تعداد زوج

یوں بیان میں یہ پوچھا گیا ہے کہ کیا مرد فطرتاً ایک سے زیادہ بیویاں چاہتا ہے اور عورت محض ایک مرد کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ دنیا میں مختلف قسم کی خاندانی زندگی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اکثر مقامات پر مقبول ترین رواج یہ ہے کہ ایک خاوند کی ایک ہی بیوی ہو تاہم ایک مرد کا کئی عورتوں سے شادی کرنا ایک عورت کا کئی مردوں سے بیاہ رچانے کے مقابلے میں زیادہ عام ہے۔ بعض معاشروں میں تو یہ گویا مسلم ہے کہ عورت صرف ایک مرد سے تعلقات قائم کرے گی۔ مگر بعض دوسرے معاشروں میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ کئی مردوں سے تعلقات استوار کر سکتی ہے۔ بعض اوقات ایسی عورتوں کو جو صرف ایک مرد سے جنسی تعلقات رکھتی ہیں نیک عورتیں کہا جاتا ہے اور جو متعدد مردوں سے رسم و راہ رکھتی ہوں انہیں "بد چلنوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر نیک و بد کا یہ معیار مردوں کے بارے میں استعمال نہیں کیا جاتا پھر بھی دیکھا گیا ہے کہ جہاں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج ہوتا ہے وہاں عموماً دولت مندوں کے ہاں ایک سے زائد بیویاں ہوتی ہیں غریبوں کے ہاں ایسا نہیں ہوتا لیکن اس بات سے ہم یہ نتیجہ تو نہیں اخذ کر سکتے کہ فطرتاً صرف امیر آدمی ایک سے زائد بیویاں چاہتا ہے اور غریب اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اور مرد کی رفاقت کا انحصار زیادہ تر اقتصادیوں پر ہوتا ہے جن میں عورت کو مرد کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا ہے۔

اس بات کا ثبوت بہم پہنچانا کہ مرد واقعی عورت کی بہ نسبت زیادہ ہرجائی ہے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ایسے آدمی نایاب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جن پر انکی اپنی ثقافت کا کوئی اثر نہ ہو۔ جب ہم بن مانس کا مطالعہ کرتے ہیں جو انسان سے بالکل ملتا جلتا جانور ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ انسان کئی باتوں میں اس سے مشابہ ہے لیکن چند باتوں میں انسان اور بن مانس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بہت سے ماہرین نفسیات کا یہ خیال ہے کہ ایک سے زیادہ رفیق حیات کی خواہش اس بات کی علامت ہے کہ ایسا شخص نا پختہ شخصیت کا مالک ہے۔ انکا خیال ہے کہ جہاں معاشرہ اجازت دیتا ہے وہاں کسی نوجوان کا مختلف لڑکیوں کیطرف کھنچنا عین فطرتی ہے۔ آزادانہ میل ملاپ اور جنسی تعلقات بڑھانے میں لڑکی کو چونکہ یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ حاملہ نہ ہو جائے اسلئے وہ نہایت سوچ سمجھ کے قدم بڑھاتی ہے اور کسی کو اپنے لئے منتخب کرتے وقت کافی احتیاط سے کام لیتی ہے اور اسکی قدرے کمزور جنسی خواہش بھی اس مشکل وقت میں اسکے لئے معاون اور مفید ثابت ہوتی ہے۔ باقاعدہ انتخاب کے بعد مرد یا عورت دونوں میں سے کوئی اگر کسی اور کا دم بھرنے لگتا ہے تو نفسیات کی اصطلاح میں یہ کہیں گے کہ وہ رجعت کا مرتکب ہوتا ہے۔ بالفرض اگر ہم یہ فیصلہ کر بھی لیں کہ دونوں میں زیادہ ہرجائی کون ہے۔ مرد یا عورت تو یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس بات کا امکان ہمیشہ رہے گا کہ چند مرد ایسے بھی ہوں جو ایک ہی رفیقہ حیات کے خواہ وہ اوسط درجہ کی عورت نہ ہو زیادہ قائل ہوں اور متعدد عورتیں ایسی ہوں جو ایک اوسط درجہ کے مرد کے مقابلہ میں کئی جیون ساتھیوں کی خواہشمند ہوں۔ اگر ہم فطرت انسانی کے ساتھ پوری پوری ہم آہنگی چاہتے ہیں تو مختلف نوعیت کے کنبے بنانے کی اجازت دینا چاہیے لیکن خدشہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے بعض بہت شدید نوعیت کے معاشرتی مسائل پیدا ہو جائینگے۔

مندرجہ بالا نو بیانوں میں مرد اور عورت کے درمیان جو ممکن فرق ہو سکتا ہے۔ اور جس پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہر جگہ بین بین اختلاف کا مطالعہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان سب سے نمایاں فرق انکی جنسی ساخت ہے۔ اسی جنسی ساخت کی رعایت سے انہیں افزائش نسل کے جدا جدا فرائض تفویض کیے گئے ہیں۔ اگرچہ سب مردوں کے اجسام میں تخلیقی جوہر نہیں ہوتے اور نہ سب عورتیں بچہ جن سکتی ہیں اور انہیں کچھ بانجھ بھی ہوتی ہیں لیکن مذکورہ فرق کے علاوہ مرد اور عورت میں کچھ ثانوی[1] جنسی اختلافات بھی ہوتے ہیں مگر ان اختلافات میں کچھ مشترک بھی ہوتے ہیں۔ عورت کے جسم پر یقیناً کم بال ہوتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں اسکے جسم پر بھی بے انتہا بال ہو سکتے ہیں لیکن کم سے کم بالوں

1 — Secondary Sexual Characteristics

والے مردوں سے بہرصورت کم ہوتے ہیں۔ جبکہ بے شمار عورتیں اسقدر قدآور اور مضبوط ہوتی ہیں کہ کمزور ترین اور
انتہائی پستہ قد مردوں سے انکا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا اسی طرح متعدد عورتیں ہر لحاظ سے اوسط مرد سے بلند ہوتی
ہیں۔ تاہم مرد اور عورت کے جسمانی امتیازات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا وہ نمایاں اور واضح ہیں۔ بعینہ انکے
مزاج اور ذہنی رویوں میں بھی کسی قدر کم مگر نہایت مستحکم فرق ملتا ہے۔ اسلئے یہ باور کرنے میں کوئی ہرج
نہیں کہ مثلاً ستنتالیسویں جسم لونیہ کے جواہر تخلیق جب مردوں میں اچھی طرح ترقی نہ کرسکیں اور عورت میں زیادہ نشوونما
پاجائیں تو وہ انکے جسموں کی بنیادی ساخت پر اثرانداز ہوتے ہیں اور متعدد دوسری صفات کو بھی متاثر کرتے
ہیں۔ لہذا اگر مرد اور عورت کے باہمی اوسط فرق کا سبب ورثہ قرار دے دیا جائے تو متعدد دوسرے
اختلافات کے وجوہ ماحول میں تلاش کرنا ہونگے۔ ایک صدی یا اس سے کچھ عرصہ پہلے جب امریکہ میں عورتوں
کو بھی اعلےٰ تعلیم کے مواقع دئے گئے تو اکثر لوگوں نے یہی کہا کہ عورتوں میں ذہنی لیاقت جذباتی استحکام
اور جسمانی قوت اتنی نہیں ہوتی کہ اعلےٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔ لیکن جب لڑکے اور لڑکیوں کو یکساں سہولتیں اور موقعے دئے
گئے تو اس قسم کے خدشے بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے۔ چنانچہ اگر عورتوں کو برابر کی سہولتیں ملتی رہیں تو
غالباً جنسی فوقیت کے چند مزید خدشے خود بخود دور ہو جائیں گے۔

جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ عورت مرد ورثہ میں ۴۶/۴۷ کی نسبت سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں
(یعنی انمیں صرف ایک جوہر تخلیق کا فرق ہے) اور ہر جنس اپنی امتیازی خصوصیات رکھتی ہے تو پھر مرد کا یہ کہنا کہ وہ
عورت سے اعلےٰ ہے عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن مرد کے اس خیال خام کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے مرد
جسمانی طور پر عورت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اسلئے سوسائٹی جسقدر غیر مہذب ہوگی جسمانی طاقت
کی اسی قدر زیادہ ضرورت ہوگی خواہ اس طاقت کا مظاہرہ گھر میں اعلےٰ اقتدار حاصل کرنے کے لئے کیا
جائے یا گھر سے باہر گروہی مقابلے میں فتح یاب ہونے کیلئے بات ایک ہی ہے جب زندگی کا
اصول یہ تھا کہ "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" تو عورت بے چاری تو کجا مردوں کو بھی جسمانی طاقت کا لوہا ماننا پڑتا ہے
مردوں کے پیشے جنمیں جسمانی قوت کا نسبتاً زیادہ دخل ہوتا ہے باعزت سمجھے جانے لگے اور عورتوں کی
دلچسپیوں کو جنمیں اس قوت کی مقابلتہً کم ضرورت ہوتی تھی کم تر تصور ہونے لگیں صنعتی ترقی کے بڑھنے سے

جسمانی طاقت کی اب اتنی اہمیت نہیں رہی۔ کیونکہ مشینوں نے اسکی جگہ لے لی ہے۔ اور تہذیب و تمدن کے پھیلنے سے انفرادی حقوق کا اب ہر جگہ احترام ہونے لگا ہے لیکن پرانے خیالات و عقائد چونکہ مٹتے مٹتے بھی وقت لیتے ہیں لہذا ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے خیالات کہ مرد افضل ہے یا عورت مرد کی ملکیت ہوتی ہے باوجود اپنے کھوکھلے پن کے ابھی کچھ عرصہ اور زندہ رہیں انکے اب تک زندہ رہنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ پچھلے ۰۰ سالوں میں انسان نے میکانکی اور صنعتی علوم میں نمایاں ترقی کی ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان علوم میں مرد عورتوں کی بہ نسبت آگے ہیں لیکن باوجودیکہ انسان نے مادی طور پر ترقی کر لی ہے اسکو اپنے معاشرتی مسائل اور تعلقات کو درست کرنے میں کوئی خاص نمایاں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو چونکہ انسخاص میں فطرتاً زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اسلئے انہیں زیادہ سے زیادہ موقع دئے جائیں تاکہ وہ مستقبل کے معاشرہ کو درست کرنے میں پیش پیش ہوں حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی معاشرہ اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ عورتوں کو اپنی قابلیتوں کو کام میں لانے کا موقعہ نہ دیا جائے اور وہ سماجی بھلائی کے کاموں میں پورا پورا حصہ نہ لیں۔ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ رفتہ رفتہ ہم" مردوں اور عورتوں کے متعلق "برتری" اور "کم تری" کے سے الفاظ استعمال کرنا ترک کر دیں گے۔ اور ہر شخص کو خواہ وہ عورت ہو یا مرد ترقی کرنیکی سب سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور فرد کی حیثیت سے اسکی عزت کریں گے مرد اپنے آپ کو جو افضل سمجھتا ہے اسکی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ چونکہ مردوں کو بچے نہیں جننا ہوتے اور نہ آغاز طفولیت میں انکی پرورش و نگہداشت کرنا ہوتی ہے اسلئے ان کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ یہی وقت کسی اور شغل میں صرف کر کے نام پیدا کر لیتے ہیں یا اپنے پیشے میں شہرت اور ترقی حاصل کر لیتے ہیں مثلاً اگر ایک بہن بھائی جو یکساں لائق ہوں ایک ہی پیشہ کو اختیار کر لیں اور دونوں بعد میں الگ الگ ازدواجی زندگی گذارنے لگیں تو عین ممکن ہے کہ بہن کوئی ترقی نہ کر سکے اور بھائی آگے بڑھتا چلا جائے۔ بہن کو بچوں کی دیکھ بھال کے بعد اتنا وقت ہی نہ ملے کہ وہ اپنے پیشے کے متعلق کچھ لکھ پڑھ سکے عورت کے نزدیک بچوں کی پرورش بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنا اسکا کوئی دوسرا کام لہٰذا بعض اوقات وہ اپنے دوسرے مشاغل کو بچوں کے آرام و سکھ کی خاطر بالکل چھوڑ دیتی ہے پھر عورت کیلئے

غالباً اچھا بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں کو بیرون خانہ مشاغل پر ترجیح دے۔ ان حالات میں اگر کوئی مرد ہم رتبہ عورت سے زندگی کی تگ و دو میں بازی لے جائے تو یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس کی کامیابی کا راز "مردانہ لیاقت" میں مضمر ہے۔

شادی اور نیک و بد چلن

دسویں باب میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ کیا عمدہ شخصیت استوار کرنے کے لئے شادی کرنا لازمی ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ غیر شادی شدہ شخص خلاف فطرت حرکات کا مرتکب، بد چلن یا حسرت و یاس کا مریض ہو؟ نفسیات کے عالم اس قسم کی عمومی باتوں کو چنداں وقعت نہیں دیتے۔ انکا خیال ہے کہ ان باتوں میں جو حقیقت پوشیدہ ہے اسکو خوب پرکھنا چاہیئے۔

ممکن ہے کہ بالغ مرد عورت کے لئے شادی کرنا عین فطری ہو مگر سوال یہ ہے کہ شادی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ نفسیات کے ماہر یہ نہیں مانتے کہ شادی محض ایک معاشرتی تجربہ یا ادارہ ہے جسکا انحصار چند اقتصادی تقاضوں پر ہے اور جسمیں سماج کی طرف سے مرد عورت کو مباشرت کی عام اجازت ہوتی ہے۔ اور ان سے توقع کیجاتی ہے کہ وہ اولاد پیدا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی بیوی کے سب اخراجات پورے کرے۔ بیوی بھی گھر کا پورا پورا خیال کرے۔ دونوں کسی اور سے جنسی تعلقات نہ رکھتے ہوں۔ اور صاحب اولاد بھی ہوں مگر اسکے باوجود انکا گھر محض ایک جہنم زار ہو۔ جسکی آگ میں صرف وہی نہ جلتے ہوں بلکہ ننھے بچے بھی تپے جا رہے ہوں۔ اسکے برعکس اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں ایسے بے شمار غیر شادی شدہ افراد موجود ہیں جو نہ صرف بہت خوش و خرم ہیں بلکہ کئی ایک اہم معاشرتی ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے پوری کر رہے ہیں۔ کوئی واقف کار آدمی انہیں عام میاں بیوی کی بہ نسبت زیادہ غیر طبعی، بد اخلاق یا حرمان نصیب قرار نہیں دے سکتا۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انہوں نے شادی کر لی ہوتی تو نسبتاً زیادہ خوش ہوتے یا سماج کیلئے زیادہ مفید ثابت ہوتے؟ اسی طرح مایوس اور کبیدہ خاطر شادی شدہ لوگوں نے اگر شادی نہ کی ہوتی تو کیا انکی زندگیاں نسبتاً بہتر ہو جاتیں؟ نفسیات کا ماہر ان معاملوں میں ہمیشہ ایک ہی بندھا ٹکا جواب نہیں دیتا وہ ہر متعلقہ شخص کے حالات اور شخصیت کا مطالعہ ضروری سمجھتا ہے

شادی کوئی ایسی دوا نہیں جو شخصیت کے دکھوں کا علاج ہو۔ یہ تو ایک ذمہ داری ہے جسے اسی شخص کو قبول کرنا چاہیے جو نفسیاتی طور پر اسکے لئے تیار ہو "نفسیاتی طور پر" تیار ہونے کے صرف یہ معنی نہیں کہ آپ کے پاس بیوی بچوں کی کفالت و پرورش کے لئے پیسہ ہو اسکے کچھ اور معنی بھی ہیں۔ وہ شخص جسے کوئی جنسی بیماری ہے یا جسے کوئی ذہنی عارضہ ہے۔ اسکا شادی کر لینا شادی نہ کرنے سے کہیں زیادہ قابل اعتراض ہے اسکے علاوہ بعض مزاجی کیفیتیں اس وضع کی ہوتی ہیں جو شادی سے نہ صرف یہ کہ بعینہ قائم رہتی ہیں بلکہ ان کے سبب رفیق حیات کو حرمان زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ کسی عارضہ کا شکار ہو جاتی ہے حرمان نصیبی کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اسکی ہیئتیں بھی متعدد ہو سکتی ہیں۔ شاید ہی کوئی آدمی ایسا ہو جسے زندگی میں محرومیت کا کبھی احساس نہ ہوا ہو اور جس نے کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا ہو جو دوسروں کو ناپسند نہ ہو۔ حرمان نصیبی کو ہنسی خوشی برداشت کرنا کردار کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے ہمیشہ کوئی انوکھا پن پیدا ہو۔ مشکلات تو ان بالغ مردوں اور عورتوں کے سامنے بھی ہیں جنکی شادی نہ ہو سکی ہو یا جو شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی رفیق حیات کی بیماری یا کسی دوسری وجہ سے ہم بستری نہ کر سکتے ہوں یا جنکا جیون ساتھی حال ہی میں فوت ہو گیا ہو۔ ذرا ان میاں بیوی کی بدنصیبی کا اندازہ کیجئے جو جنسی عدم مطابقت کے سبب ایک دوسرے کی جنسی تشنگی بجھانے پر قادر نہ ہوں اسی طرح تو وہ لوگ بھی مشکل میں پھنسے ہیں جنکی شادیاں انکی مرضی کے مطابق نہیں ہوئی ہیں یا جنکی ہمیشہ اپنے رشتے داروں اور ہمسایوں سے ان بن رہتی ہے۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ حرمان نصیبی صرف شادی ہی سے متعلق ہو وہ لوگ بھی تو اپنی تمناؤں اور حسرتوں کے مزار ہیں جنکی اولاد نا خلف نکل گئی ہو یا جنکے والدین ظلم و ستم پر تل گئے ہوں یا جنکا سابقہ انتہائی ناقدر شناس اور سخت گیر افسروں سے ہو۔ نفسیات کا ماہر اس بات پر کبھی اصرار نہیں کرتا کہ کسی خاص بدنصیبی کا ہر قیمت پر ازالہ ہونا چاہیئے مثلاً وہ یہ کبھی نہیں کہے گا کہ جب کنوارے پنے اور تنہائی کا احساس شدید ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بدچلنی یا کسی نفسیاتی الجھن کی صورت میں رونما ہوتا ہے ایسا ہو بھی جائے تو شادی کو بطور درمان کے استعمال کرنے کا مشورہ تو کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ نفسیاتی امراض کے متعلق ایک ماہر کا یہ کہنا ہے کہ میرے آدھے مریض میرے پاس صرف اسلئے آتے ہیں کہ انکی شادیاں نہیں ہوئیں۔ اور آدھے اسلئے کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ اگر ہم

اس بات پر زور دیں گے کہ ہر شخص کی شادی ہونی چاہیئے تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ ہم کچھ ایسے لوگوں کو شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو کسی طرح اسکو کامیاب بنانے کیلئے تیار نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی رفیق حیات کی زندگی بھی تباہ کر ڈالیں۔ تاہم شادی بہترین انسانی رشتوں میں سے ایک ہے بیشتر لوگوں کے لئے اسکے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے زندگی صاف ستھری اور خوش آیند بنائی جاسکے۔ نفسیات کا عالم جنسی جبلت کو کوئی قابل نفرت شے تصور نہیں کرتا بلکہ اسکے نزدیک تو شخصیت کی نشوونما کے لئے اس سے بہتر اور کوئی معاشرتی قوت نہیں ہے سوال صرف یہ ہے کہ اس قوت کی مدد سے آسودہ حال گھرانے کیونکر تعمیر کیے جائیں آج سے تیس ۳۰ سال پہلے نفسیات کے اکثر ماہر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں والدین کی نااہلی کا عموماً گلہ کیا کرتے تھے۔ اور بعضوں کا تو یہاں تک خیال تھا کہ حقیقی والدین اور گھروں کی جگہ تربیت گاہیں جنمیں تربیت یافتہ انائیں اور کھلائیاں ہوں بچوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اب اس نظریے کو کوئی نہیں مانتا خود نفسیات کے ماہر اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کے لئے والدین اور گھر سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ بچوں کو ایک ایسی جگہ چاہیئے جو انکی اپنی ہو جہاں ہر شخص ان سے محبت کرے اور جہاں ان سے "فرد" کی حیثیت سے سلوک کیا جائے والدین کے لئے بچوں کا ہونا اور بچوں کیلئے والدین کی موجودگی اسی طرح ضروری ہے جسطرح میاں بیوی کو ایک دوسرے کی رفاقت اور ہمدردی درکار ہے۔

انسانی تاریخ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جب ایک چھوٹے گروہ یا نسبتاً بڑے گروہوں نے اپنے سے تعداد میں زیادہ لوگوں سے مقابلہ کرنا چاہا تو اسے اپنی گنتی بڑھانے کی فکر ہوئی۔ ایسے موقعوں پر اولاد بڑھانا ایک معاشرتی فریضہ ہو جاتا ہے مگر پاکستان کے محدود ذریعوں کو دیکھتے ہوئے مسئلہ یہ نہیں کہ آبادی میں مزید اضافہ کیا جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیدا ہو اس کے لئے زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے مواقعے مہیا کیے جائیں۔ مسئلہ شادی کا ہو یا کوئی اور انفرادی ضرورتوں کا خیال کیے بغیر کسی اصول کو نافذ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہر فرد کی حتی المقدور مدد کیجائے تاکہ وہ خاطر خواہ ترقی کر سکے۔

جنسی تعلیم و چلن

گیارہ دیں بیان کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ بچوں کو جنسی تعلیم دینے سے انکی سب جنسی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں کیونکہ جنسی تعلیم سے نامکمل واقفیت ہی تو ان کا واحد

سبب نہیں ہے تاہم مناسب جنسی تعلیم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہت کم والدین اپنے بچوں کے ساتھ جنس کے متعلق سیدھی سادی زبان میں صاف صاف بات چیت کر سکتے ہیں۔ بچہ اکثر یہ محسوس کرتا ہے کہ والدین یا تو اسکے سوالات کو ہنس کر اڑا دیتے ہیں یا انہیں فضول واہیات قرار دے کر بات ختم کر دی جاتی ہے اسطرح جنس بچوں کیلئے ایک شرمناک اور پراسرار موضوع بن جاتا ہے۔ اب اگر وہ اسکے متعلق کبھی گفتگو کرتے ہیں تو والدین سے چوری چھپے یا کوئی اسکے متعلق واقفیت حاصل کرتے ہیں تو وہ نوکروں سے یا اپنے سے بڑی عمر کے بچوں سے جنہیں خود بھی صحیح معلومات نہیں ہوتیں اور جو بچے کو مضر اور غلط عادتوں میں پھنسا کر لطف لیتے ہیں۔ کثیر تعداد میں بالغ افراد یہ محسوس کرتے ہیں کہ بچپن میں جنس سے متعلق غلط معلومات نے یا اس سے متعلق شرمندگی کے احساس نے انہیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اکثر اوقات جب لڑکی کو پہلی بار حیض کا خون آتا ہے تو اسے خوف سا محسوس ہوتا ہے اکثر لڑکوں کو یہ اندیشہ ہو جاتا ہے کہ احتلام اور خصوصاً جلق کے سبب انکی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ بچوں کو واقعی یہ خدشہ ہو جاتا ہے کہ انکا حافظہ خراب ہو رہا ہے وہ مخبوط الحواس سے ہو رہے ہیں اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ اسقدر اعصابی یا حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ ذہنی تسکین حاصل کرنے کی خاطر انہیں پھر نادانستہ طور پر مشت زنی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کیا موزوں اور مناسب جنسی تعلیم ان غلطیوں کا تدارک نہیں کر سکتی؟ یقیناً لڑکیاں اور لڑکے اس بات کے مستحق ہیں کہ ایسے اہم معاملات میں انہیں والدین سے صحیح معلومات حاصل ہوں اور وہ انکے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں۔ ایسے موقعوں پر اگر والدین بچوں سے جھوٹ بولتے ہیں تو بچے ان پر اعتبار کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اگر والدین کا اپنا رویہ جنس کے متعلق صحت مندانہ نہیں تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ "صاف گوئی" سے کام لیں گے عبث ہے اگر ماں یا باپ بچے کیساتھ جنس کے متعلق گفتگو کرتے وقت پریشانی محسوس کرتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اسکے ساتھ بات چیت نہ کرے کیونکہ اسکا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ پہلے سے زیادہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جنس واقعی کوئی عجیب و غریب چیز ہے بعض اوقات اسکولوں میں اگر کسی نصابی کتاب میں جنس کا ذکر آئے تو طلبا کو اسکے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچا دی جاتی ہیں مگر معلومات پہنچا دینے سے مطلب حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان سے کہیں زیادہ اہم وہ رویہ اور وہ احساس ہے جو بچہ گھر میں یا سکول میں جنس کے متعلق اختیار کرتا ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ وہ

والدین جنکی اپنی ازدواجی زندگی پُر مسرت ہوتی ہے انکے بچوں کی اپنی شادیاں بھی خوب کامیاب ہوتی ہیں متعدد تحقیقات کے نتائج اسکے جواز میں پیش کیے جاسکتے ہیں یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ بچے اکثر غیر شعوری طور پر انہیں رویوں کو اختیار کرتے ہیں جو انکے گھر میں مقبول ہوں صرف شوہر کی بیوی سے مؤانست اور التفات ہی انکے بچوں کی بہترین جنسی تعلیم کا ضامن ہوسکتے ہیں لیکن شوہر اگر جنس کو محض ہوا و ہوس کا ذریعہ سمجھتا ہے تو جنس سے متعلق بہترین معلومات بھی بچے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاسکتیں۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر والدین کی اپنی زندگی میں جنسی مطابقت پیدا ہو جائے تو بچوں کو رسمی اور مناسب جنسی تعلیم دینا بھی آسان ہو جائے۔

مسئلہ طلاق

بارہویں بیان میں مسئلہ طلاق زیر بحث ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حصول طلاق میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گیا تو ازدواجی زندگی کی الجھنوں میں مزید اضافہ نہیں ہو جائے گا اور رہا سہا سکون بھی تو ختم نہیں ہو جائے گا۔ جواب اثبات میں بھی ہو سکتا ہے اور نفی میں بھی اگر طلاق میں بے حد آسانیاں ہو جائیں تو ممکن ہے کہ ہر شخص یہ سوچنے لگے کہ میں نے شادی کر کے بڑی غلطی کی لیکن خیر اس سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ دراصل ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے کیونکہ شادی زندگی بھر کا ساتھ تصور کی جاتی ہے تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جنکے دل میں شادی کے بعد طلاق کا خیال ضرور آتا ہے کیونکہ طلاق امر محال نہیں ہوتی۔ لیکن اگر طلاق کا سرے سے وجود ہی نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی شادی کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں اور واقعی ان کا گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔ اسکے برعکس اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ وہ دوسری شادی کر سکتا ہے تو نیت خراب ہونے ہی اسکے لئے پہلی بیوی میں نقص نکالنا آسان ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں بیوی بھی یونہی بدگمان ہو جائے اور خاوند کی ہر بات میں کوئی پوشیدہ معنی تلاش کرنا شروع کر دے جسکا انجام یہ ہو کہ کسی دن کسی معمولی بات پر جھگڑا ہو جائے اور نوبت طلاق تک پہنچ جائے۔

طلاق کی آسانیاں میاں بیوی کی علیحدگی کو سہل بنانے کی بجائے انہیں ایک دوسرے کے قریب رکھنے کا موجب بھی تو ہو سکتی ہیں۔ بہت سے مرد بلا سوچے سمجھے عورتوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں اگر انکو اس بات کا علم ہو کہ عورت خلع حاصل کر سکتی ہے تو وہ اپنے رویہ میں محتاط رہیں گے اور اگر کبھی بیوی نیادتی بھی کر جائے تو وہ فوراً چراغ پا نہیں ہوں گے بلکہ سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کریں گے

مندرجہ بالا جملہ حقائق اپنی اپنی جگہ درست سہی مگر زیربحث سوال کا ابھی تک کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ہوا کہ کیا بہ حیثیت مجموعی ان معاشروں میں ازدواجی زندگی زیادہ "خوشگوار" ہے جہاں طلاق عام ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ہی ایسا ہے کہ اسکے متعلق قطعی جواب ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہیں جانتا کہ طلاق کی آسانیاں یا دشواریاں میاں بیوی کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہیں یا جہنم اس سلسلے میں مغرب میں جو تحقیقات کی گئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر لوگوں کا وہاں یہ خیال ہے کہ انکی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون اور اطمینان بخش ہے۔ اگر پاکستان میں بھی اس قسم کی کوئی تحقیق کی جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہاں بھی عام لوگوں کی یہی رائے ہوگی کہ انکی شادیاں کامیاب ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سب لوگوں کا مسرت کا تصور ایک ہی سا ہوتا ہے اور وہ سب ایک ہی نوع کی شادی کو کامیاب تصور کرتے ہیں مگر غالباً سب یہی کہیں گے کہ طلاق کا عام ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ نہ شادی کرتے وقت جلد بازی سے کام لینا چاہیئے اور نہ طلاق دیتے وقت احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہیئے۔ جہاں شادی کرنا نہایت آسان ہے۔ اور اسپر کوئی پابندی نہیں ہے حتیٰ کہ والدین کی رضامندی" تک ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسے امریکہ کے بعض حصوں میں تو وہاں "طلاق کے مقدمات" عام ہو جاتے ہیں اور صبح شام نکاحوں کی تنسیخ ہوا کرتی ہے۔

جذبہ حسد و رقابت

ہمیں یہاں اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا رقابت یا حسد پیدائشی ہوتا ہے لفظ "پیدائشی" توجہ کا محتاج ہے۔ اگر حسد کے پیدائشی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے جواہر تخلیق میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ حاسد ہو جائے تو یہ غلط ہے۔ لیکن اگر اسکے یہ معنی ہیں کہ زندگی کے بعض تجربات لازمی طور پر ایسے احساسات پیدا کر دیتے ہیں جو رقابت کہلاتے ہیں تو حسد پیدائشی ہے۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ کیا میاں بیوی میں سے اگر کوئی کسی تیسرے فرد کی طرف راغب ہو تو رقابت کا جذبہ کارفرما ہوگا۔ اکثر لوگوں کا جواب یہ ہوگا کہ یقیناً رقابت کی آگ ضرور بھڑکے گی۔ مگر ابھی چند روز ہوئے پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹر کی ڈاک میں ایک عورت نے اپنی سوت اور شوہر کے ساتھ انتہائی اچھے تعلقات کا تذکرہ کیا تھا شوہر نے اپنی پہلی بیوی کی رضامندی سے دوسری شادی کی تھی۔ ہمیں ایسے معاشرے بھی ملتے ہیں جہاں شوہر اپنی بیوی کو مہمان نوازی کے سلسلہ میں مہمان کو پیش کرنا

ہے جیسے اسکیمو کے ملک میں۔ اسی طرح ڈغاسکر میں ایک قبیلہ ایسا ہے کہ جہاں عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر گھر میں دوسری بیوی لائے تاکہ وہ اسکا کام کاج میں ہاتھ بٹائے۔ کہتے ہیں کہ قبیلہ لیسو[1] میں مرد اور عورتیں غیروں سے جنسی تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور شوہر کو اپنی بیوی کی ہر دل عزیزی پر ناز ہوتا ہے۔ ان تمام عورتوں میں رقابت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اسکے برعکس اگر شوہر بیوی کو تنہا اپنی ملکیت سمجھتا ہے یا اسکو اپنے برابر کا سمجھ کر محبت و احترام کرتا ہے تو رقابت شدید ہو گی۔ اسی طرح اگر بیوی کو شوہر سے بے حد محبت ہو یا اگر اسکا شوہر کسی اور عورت سے تعلقات قائم کر لے اور دوسرے لوگ خصوصاً عورتیں ایسی بیوی کا مذاق اڑائیں یا برعکس تو اس صورت میں بھی رقابت فوری اور نہایت شدید ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ رقابت جنسی تعلقات کے سبب ہی پیدا ہو۔ افریقہ میں لنگو[2] قبیلہ کی عورتیں اس وقت تک ایک دوسرے سے نہیں جلتیں جب تک کہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ انکا شوہر کسی ایک کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہا ہے۔ انکے نزدیک محض ایک دوسرے کی سوت ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اہمیت تو اس بات کو حاصل ہوتی ہے کہ شوہر کا ان کیساتھ سلوک کیسا ہے۔

شادی بیاہ کے مغربی اور پاکستانی نظریے

عورتوں اور مردوں کے باہمی اور معاشرتی مراسم کا مسئلہ یا شادی اور طلاق کے مسائل فی الحقیقت اس قدر پیچیدہ ہیں کہ نفسیات کا عالم انکے متعلق "ہاں" یا "نہیں" میں دو ٹوک جواب نہ دینے میں ہی مفر سمجھتا ہے۔ البتہ اپنے تئیں وہ ان تمام نظریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو مذکورہ مسائل کے متعلق لوگوں میں رائج ہوتے ہیں اور ایسے بیشمار حقائق جمع کرتا ہے جو متنازعہ فیہ مسائل کو سمجھنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ ضروری نہیں کہ جو بات ایک معاشرہ میں مستحسن ہو وہ دوسرے معاشرے میں بھی بہتر اور مناسب تصور کی جائے۔

غالباً پاکستانی تہذیب اور مغربی تہذیب میں اس معاملہ میں بہت شدید اختلاف ہے کہ عورتوں اور

1 — LESU

2 — LANGO

مردوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہونا چاہیئے کہ انہیں نامحرموں کو آپس میں ملنے جلنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ نہیں اور کیا شادی ہمیشہ والدین کی مرضی اور انتخاب ہی سے ہونی چاہیئے یا لڑکے اور لڑکی کو بھی اپنا شریک حیات تلاش کرنے کا حق اور آزادی دیئے جاسکتے ہیں کہ نہیں۔ بہت سے پاکستانیوں کو مغربی تہذیب میں بڑی اچھائیاں نظر آتی ہیں لیکن انکا خیال ہے کہ جنسی معاملات میں مغرب پستی اور بدچلنی کی طرف جارہا ہے۔ اسی طرح بہت سے مغربی لوگوں کو مشرقی تہذیب و تمدن میں بڑی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن یہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان جو پردے حائل کردیئے جاتے ہیں۔ انکو دیکھ کر انہیں بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیسا معاشرہ ہوا کہ عورت اور مرد سماجی طور پر کوئی مراسم ہی استوار نہیں کرسکتے۔ اصل میں دونوں قوموں کے افراد کا یہ احساس کرنا مشکل ہے کہ وہ صرف اپنی رسومات اور رواج کو ترجیح دیتے ہیں اور انہیں کو افضل اور اعلےٰ سمجھتے ہیں مثلاً پاکستانیوں کا یہ خیال ہے کہ مغربی لوگ پاکستانی رسوم اور رواج کی اصلی روح کو نہیں سمجھتے ادھر مغربی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی بعض مغربی فلموں میں جو کچھ دیکھتے یا جاسوسی یا سنسنی خیز ناولوں میں پڑھتے ہیں انکی اپنے تجربے کے مطابق تاویل کر لیتے ہیں او اسطرح مغربی تہذیب کا بہت ہی مسخ شدہ تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں۔ اپنی رسوم کو کوئی دوسری ثقافت [illegible] کیا معنی پہنائے جاسکتے ہیں اسکا صحیح صحیح اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے کیوں نا دونوں نقطہائے نگاہ کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے مشرقی اور مغربی دونوں نظریات کے مطابق جنسی کشش انسانی فطرت کا بنیادی خاصہ ہے جس پر اخلاقی قیود عائد کرنا ضروری ہے۔ تمام معاشرتی اداروں کی اہم ترین تشکیل یعنی کنبہ کی بنیاد یہی جنسی کشش ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بدچلنی اور ناخوشی کا موجب بھی ہوسکتی ہے۔ دونوں یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ انسان کی شدید ترین ضرورت ہے جس کا منبع اور مرجع اسکا اپنا باطن ہوتا ہے لیکن بیرونی ہیجان اسکے خارجی اظہار کو کافی حد تک متاثر کرتے ہیں اہل پاکستان کے مشرقی نقطہ نگاہ کا لب لباب یہ ہے کہ جنسی خواہش کی جائز تسکین میاں بیوی کا رشتہ قائم کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ ازدواجی رشتہ استوار کیے بغیر جنسی آسودگی حاصل کرنا نہایت معیوب ہے شادی ایک مذہبی اور معاشرتی فریضہ ہے کیونکہ اس سے جنسی خواہشات پوری ہوتی ہیں اور افزائش نسل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ غیر شادی شدہ شخص نہ صرف دوسروں کے لئے خطرہ ہے بلکہ خود اپنے لئے بھی وہ باعث خطر ہے شادی کے علاوہ ہر طرح کے جنسی اظہار اور تسکین کو سختی سے دبانا اور روکنا چاہیئے۔ اسلام نے عورتوں اور مردوں کو

مساویانہ حقوق دیتے ہیں اور زنا کے معاملے میں دونوں کو یکساں سزا کا مستحق گردانا ہے لیکن پاکستانی معاشرہ میں اس اسلامی اصول پر سختی سے پیروی نہیں ہوتی جنسی بے راہ روی پر مرد کو اتنا مطعون نہیں کیا جاتا جتنا عورت کو اور مرد اگر اخلاقی پابندیوں کو توڑتا ہے تو عورت کے مقابلہ میں اس پر کم لعن طعن کی جاتی ہے۔ چونکہ مردوں اور عورتوں کے درمیان جنسی کشش طبعی ہے اسلئے غیر مردوں اور غیر عورتوں کو ایک دوسرے علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے ملیں جلیں گے تو جنسی ترغیب اور اپنی مرضی کی شادی کے امکانات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔ نوجوان مرد اور عورت اپنے لئے رفیق حیات انتخاب کرتے وقت دانشمندی سے کام نہیں لیتے۔ جو رشتہ والدین منتخب کرتے ہیں وہ انکے اپنے انتخاب سے کہیں بہتر ہوتا ہے والدین کو بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ اسلئے وہی شادی باعث مسرت ہوتی ہے جسمیں انکی مرضی کو دخل ہو اگر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنا رشتہ خود تلاش کرنے لگیں تو انکا انتخاب ظاہری کشش اور دلربائی کے باعث ہوگا ضروری نہیں کہ وہ موزوں ترین بھی ہو۔ مگر ماں باپ کی مرضی کے مطابق جب کسی کو میاں بیوی کے رشتے میں جوڑ دیا جاتا ہے تو ان پر باہمی محبت واحترام استوار کرنیکی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

ایک اوسط پاکستانی کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔ جب وہ کسی جوان لڑکی کو دیکھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ اسکے متعلق یہ سوچتا ہے کہ وہ کیسی بیوی رہے گی۔ اسطرح.... پاکستان میں لڑکیاں مردوں سے دوستی کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتیں۔ مرد کی حیثیت سے انکی زندگی میں ایک ہی آدمی داخل ہوتا ہے اور وہ انکا شوہر ہوتا ہے وہی انکی ساری کائنات ہوتا ہے اور وہی انکی دھن دولت۔ یقیناً سب پاکستانی یا سب اہل مذہب ان حالات میں ہم خیال نہیں ہیں مثلاً بعض پاکستانی یہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت مساوی ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ عورتیں چونکہ مردوں سے نسبتاً کمزور ہیں اسلئے انہیں نہ صرف مردوں کی پناہ کی ضرورت ہے بلکہ انکو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ مردوں سے توقع رکھیں کہ وہ انکی حفاظت کریں۔ اسی طرح ہمارے بعض کرم فرماؤں کا خیال ہے کہ پاکستانی لڑکے اور لڑکیوں کو جو تربیت گھر پر ملتی ہے وہ صنف مخالف کو سمجھنے کے لئے یا زن وشوہر کی باہمی اور مشترکہ زندگی کو جاننے کے لئے بہت کافی ہوتی ہے! انکے خیال کے مطابق یہ تربیت بہت عمدہ اور سخت ہوتی ہے کیونکہ وہ مثالی قسم کے حالات کے تحت دی جاتی ہے جو ہر قسم کی جنسی

تحریکات سے سبرا ہوتے ہیں۔ کچھ ہمارے مہربان ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تربیت بہت ہی ناکافی ہے کیونکہ پاکستانی گھروں میں بچوں کے اپنی ماں یا بہنوں سے بہت ہی محدود تعلقات ہوتے ہیں۔ بھائی کو بہن کے احساسات اور دلی خیالات کا بہت ہی کم علم ہوتا ہے۔ اگرچہ بہن بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں مگر انکی دلچسپیاں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں لڑکیاں عموماً گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہیں لیکن لڑکے بیشتر وقت گھر کے باہر گذارتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی شادی کے بعد بھی اپنے میاں یا بیوی سے عموماً علیحدہ ہی رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اہل مغرب بھی جب اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان سب کی ایک رائے نہیں ہوتی۔ اور سب پاکستانیوں کیطرح وہ بھی اپنے طرز تمدن سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔

چونکہ پاکستانیوں کے لئے مغربی نقطہ نگاہ کا سمجھنا اور وہ بھی انہیں کے زاویے سے خاصا مشکل ہے اسلئے اسکو ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بات کو سمجھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں اس سے "اتفاق" بھی ہے۔ کسی سے اتفاق ہونے میں تو کوئی "قباحت" ہو سکتی ہے مگر اسے سمجھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔ اہل مغرب جنسی کشش کو ایک بہت بڑی تعمیری اور معاشرتی قوت سمجھتے ہیں جس سے مختلف طریقوں پر کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ اسے صرف جسمانی لذت یا اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور نہ وہ اسے خطرہ تسلیم کرتے ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نہایت اچھی دوستی ہو سکتی ہے جسکا انحصار دلی انضمام پر ہوتا ہے انہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اس دوستی اور احترام کے سبب جنسی جذبہ کو کسی قدر آسودگی بھی ملتی رہتی ہے۔ کیونکہ جنسی آسودگی کے لئے جنسی اختلاط ضروری نہیں۔ دوستی خواہ شادی شدہ مرد اور عورت کی ہو یا غیر شادی شدہ مرد و زن کی وہ زندگی کے لطف کو دوبالا ضرور کرتی ہے۔ انکے ہاں "کورٹ شپ"[1] کو محبت کی افزائش کا ایک اہم دور سمجھا جاتا ہے اور وہ اسے حقیقی اور دائمی محبت کا پہلا قدم تصور کرتے ہیں جو زندگی بھر کے لئے مرد اور عورت کو شادی کے مضبوط رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں صنفوں کے آزادانہ میل ملاپ سے بڑی دشواریاں پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اگر لڑکے اور لڑکی کو اپنا ساتھی خود تلاش کرنے کی عام اجازت ہو تو ہو سکتا ہے کہ کہیں اسکا نتیجہ نامرادی اور دل شکستگی کی صورت میں

1 Courtship.

نکلے لیکن ان ناکامیوں کے باوجود انکے ہاں شرح ازدواج کافی زیادہ ہے تاہم کچھ مرد اور نسبتاً زیادہ تعداد میں عورتیں من بھاتی شادی کے رواج کے سبب غیر شادی شدہ رہ جاتے ہیں مذکورہ بالا قباحتوں کے باوجود اہل مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ انکے دستور میں فائدے زیادہ ہیں اور نقصانات کم۔ انکے ہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو یہ احساس ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ طریق پر ملنے جلنے سے جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں وہ خاصی پریشان کرسکتی ہیں مگر کوئی یہ مشورہ نہیں دیتا کہ عورت اور مرد کو آزادی کے ساتھ ملنے کی جو اجازت ہے اسے ختم کردینا چاہیئے اور دونوں کو بالکل علیحدہ علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ اس قسم کا مشورہ نہ دینے کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مخالف جنسوں کی علیحدگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جنسی خواہش کو جسمانی لذت کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں اور انکے درمیان رفاقت اور دوستی کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کورٹ شپ کی بنیاد صرف جسمانی کشش ہو یا پھر کسی ایسے شخص پر فریفتہ اور مفتون ہونا بھی ممکن ہے جس سے حقیقتاً محبت نہ ہو فریفتگی درست یا محبوب کی کسی خاص ادا یا وصف پر مرمٹنے کا نام ہے پیار یہ وہی ہوتا ہے جسمیں اسکی ساری شخصیت یا ذات دل موہ لے۔ ان حالات میں شادی سے پہلے عموماً کئی قسم کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور متعلقہ مرد اور عورت کی باہمی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے۔ خالص جسمانی کشش ناپائیدار ہوتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ کسی نئی چیز کے لئے کوشاں رہتی ہے لیکن وہ کشش جو شادی کا بہترین ضمیمہ ہوتی ہے اسکی بنیاد مرد اور عورت کے شخصی اوصاف مشترکہ مفاد اور متحدہ مقاصد زندگی پر ہوتی ہے جسمانی کشش تو انکو قریب تر لانے کا ایک آلہ کار ہوتی ہے۔ اسمیں بھی کلام نہیں کہ بسا اوقات جسمانی کشش پہلے پیدا ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ گہری محبت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بعض اوقات دوستی اور مشترکہ دلچسپیاں جنسی کشش کو جنم دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں چنانچہ جب میاں بیوی واقعی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو جنسی کشش کا مضبوط اور پائیدار رہنا آسان ہوجاتا ہے۔

کیا یہ بات تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتی کہ مشرقی اور مغربی نقطۂ نگاہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ہر ایک دوسرے کو مخرب مثالی اخلاق سمجھتا ہے اسکی کیا وجہ ہوسکتی کہ ہر نقطہ نگاہ کی مخصوص موجودہ شکل پر مذہبی اعتقادات اور تعلیمات کا کبھی گہرا اثر پڑا ہو مگر نقطہ نگاہ کا یہ فرق کسی اسلامی اور مسیحی عقیدہ کی بنا پر نہیں ہے

مذہبی لوگ خواہ کسی عقیدہ کے ہوں۔ وہ ان دونوں نظریات میں سے کسی ایک کو ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ مشرق میں مسلمان، عیسائی، یہودی، بدھ، ہندو وغیرہ سب کا یہ خیال ہے کہ اولاد کے لئے رشتہ تلاش کرنا والدین ہی کا فرض ہے اور مردوں اور عورتوں کو کسی قدر ایک دوسرے سے دور دور اور علیحدہ ہی رہنا چاہیئے۔ اسکے برعکس مغربی نظریہ کو مغرب کے تمام لوگوں نے قبول کر لیا ہے خواہ انکا کوئی مذہبی عقیدہ ہو یا نہ ہو۔ غالباً امریکہ اور انگلستان کے اعتدال پسند مسلمان پاکستانی رسوم کے مقابلے میں مغربی رسوم کے زیادہ پابند ہونگے۔

بنیادی طور پر یہ دونوں نظریے دو مختلف معاشرتی اور معاشی نظام کی پیداوار ہیں۔ مغرب میں صنعتی نظام اور چھوٹا کنبہ اسکے سبب قرار دیئے جا سکتے ہیں اور مشرق میں زراعتی نظام اور بڑا کنبہ اسکے ذمہ دار ہیں۔ ایک زرعی اور دہقانی معاشرہ میں جہاں جائیداد نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اور جسمیں اولاد عموماً باپ ہی کا پیشہ اختیار کرتی ہے پورے کنبہ کی صلاح و فلاح کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور یہ جائز اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ انفرادی انتخاب اسکا تابع ہو۔ اولاد باپ سے کھیت اور مویشی بھی میراث میں پاتی ہے اور زراعت اور گلہ بانی کے راز بھی اسی سے سیکھتی ہے ایسے ماحول میں اگر کوئی لڑکا کسی صاحب حیثیت خاندان کی لڑکی کے مقابلے میں محض کسی خوبصورت دوشیزہ کو منتخب کر لیتا ہے تو وہ گویا سارے کنبے کے مفاد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی بڑے خاندان کی لڑکی کسی معمولی حیثیت کے لڑکے سے شادی کر لے تو اسمیں خاندان بھر کی بے عزتی تصور کی جاتی ہے۔ انکی عزت ان سب کی عزت ہے اسلئے لڑکی اور اسکی عزت دونوں کو گھر والے محفوظ رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لہٰذا ایسے ماحول میں یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو حتی الامکان ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے اور شادیاں والدین کریں۔ اسکے علاوہ ایسے ماحول میں نامحرم مرد اور عورت کی دوستی کو ہمیشہ جنسی تعلق ہی سمجھا جاتا ہے۔

اسکے برعکس صنعتی معاشرے میں خصوصاً ایک ایسے معاشرے میں جسمیں ترقی کی رفتار بہت تیز ہو خاندانی تعلقات کا کمزور ہونا فطری اور لازمی ہے، تمام افراد حتےکہ لڑکیاں بھی اپنے لئے ملازمت تلاش کر سکتی ہیں اور والدین سے اقتصادی طور پر آزاد ہو سکتی ہیں، بچے آئے دن سکولوں میں ایسی ایسی نئی چیزیں دیکھتے اور سیکھتے ہیں جو انکے والدین ہرگز نہیں جانتے لہٰذا وہ کچھ سیکھنے کے لئے والدین کی طرف کم ہی رجوع کرتے ہیں۔ ان

حالات ہیں اگر والدین انکے رشتہ کے لئے اپنے انتخاب پر زور دیں تو وہ انکا ساتھ چھوڑ کر الگ رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اپنی کفالت خود کرتے ہیں۔ غالباً آج کل اپنی مرضی کی شادی کا رواج اور نظام اسی طرح پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔

خیال یہ ہے کہ پاکستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کے دستور بھی تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گے اگر اس بات کا "شدید خدشہ" ہے جس کے کہ پورے پورے امکان موجود ہیں کہ یہاں بھی عورت اور مرد کے باہمی ملنے جلنے کے انداز بدلیں گے تو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور جو قباحتیں مغرب میں پیدا ہو گئی ہیں ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا چاہیئے۔ تبدیلیاں "آناً فاناً" رونما نہیں ہو جاتیں۔ انہیں کچھ وقت لگتا ہے، روایاتِ فکر و خیال تو ان رسوم سے بھی زیادہ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہیں جو اقتصادی تقاضوں کے تحت وجود میں آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روایات اقتصادی تبدیلیوں کی رفتار کو نسبتاً سست کر دیں۔

جائز اور ناجائز کا جو موجودہ تصور ہمارے اور ہمارے والدین کے ذہنوں میں کار فرما ہے اسکے ابھی کچھ اور عرصہ تک فعال رہنے کا امکان ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی اعتقادات کا جو انڑ رسوم پر پڑتا ہے وہ ابھی خاصی مدت تک جاری رہے۔ اگر آج بلا روک ٹوک کورٹ شپ غیر اخلاقی اور بد مزاجی خیال کی جاتی ہے تو محض اس وجہ سے وہ اخلاقی حدود میں نہیں آسکتی اور خوش آئند نہیں بن سکتی ہے کہ شخص متعلقہ خود کفیل ہو جاتا ہے۔ اور والدین کا دست نگر نہیں رہتا۔ ہم جانتے ہیں کہ اشتراکیوں کے اس عقیدے میں بڑی صداقت ہے کہ کسی معاشرے کا معاشی نظام اسکے تمام معاشرتی اداروں کی ہیئت اور ساخت کو متعین کرتا ہے مگر یہی تو صداقت محض نہیں ہے۔ اور نہ انکے اس عقیدے سے انسانی معاشرے کی پوری پوری تشریح ہو سکتی ہے۔ انسان ذہین و فطین ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ اسکی معاشرتی ترقی صرف معاشی تقاضوں کے رحم و کرم پر نہیں ہوتی۔ اقتصادی نظام بذات خود کئی دوسرے معاشرتی اداروں اور روایات فکر و خیال سے بے حد متاثر ہوتا ہے ہمیں موجودہ معاشرتی نظام کے مزاج کا بخوبی اور احتیاط سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور پھر اپنی ساری ذہانت سے اسکی مناسب ترقی کیلئے کوشاں ہونا چاہیئے تاکہ انسان زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کر سکے محض چند خرابیوں کو ختم کر دینے کا مشورہ دینا فضول ہے مثلاً صرف ان فلموں کو روک دینا بیکار

ہے جو شہوانی جذبات کو انگیختہ کرتی ہیں بلکہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ آخر یہ فلمیں
لوگوں کو اسقدر کیوں بھاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ فلمیں وقتی طور پر صنف مخالف سے جنسی تعلق کا ایسا نعم البدل ہو
سکتی ہیں جو بالکل بے ضرر ہو۔ یا معلوم یہ کرنا چاہیئے کہ کہیں ایسی فلمیں مردوں اور عورتوں کو جدا رکھنے کے نظریے
کی حمایت تو نہیں کرتیں۔ یا وہ صرف ایسے شہوانی جذبات کو بھڑکاتی ہیں جنہیں تسکین میسر نہیں ہوتی۔ اگر ان فلموں
کو روک دیا جائے تو کیا معاشرہ میں جنسی خواہشات کا اظہار بہتر طور پر ہوگا یا حالت اور ابتر ہو جائے گی۔ اسلئے
دریافت طلب یہ بات ہے کہ جنسی ناآسودگی ان فلموں کی پیداوار ہے یا جنسی ناآسودگی اس قسم کی فلموں کے وجود میں
آنے اور پسندیدہ بننے کا باعث ہوتی ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی نیا معاشی یا معاشرتی نظام کیوں نہ اختیار کر لیا جائے۔ کیوں نہ ہم اشتراکیت
یا مغربی طرز کی جمہوریت اختیار کر لیں یا مغربی نظام شادی اپنا لیں۔ اس قسم کے سوالوں کا جواب یہ ہے کہ ہر
ملک کی ثقافت وہاں کی مقامی پیداوار ہوتی ہے۔ کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی ثقافت قبول نہیں کر سکتا
اسے اپنی روایات سے ہی اپنے لئے کوئی ثقافت پیدا کرنا ہوتی ہے چین میں جو اشتراکی نظام آیا ہے وہ
بظاہر اچانک معلوم ہوتا ہے اور گوناگوں تبدیلیوں کا مرقع بھی نظر آتا ہے مگر بغور مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ملک
کے طول و عرض میں پھیلنے سے پہلے اسکا مخصوص فلسفہ اور اسکے طریقہائے کار سالہاسال سے ملک کے مختلف
گوشوں میں نشوونما پا رہے تھے۔ ثقافتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں جدید ترقی یافتہ دور میں کوئی ثقافت اس وقت تک
زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ اپنے ماضی کی منفرد روایات چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو۔ انقلاب کے خواہش مند
لوگوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان قوتوں کا مطالعہ کرتے رہیں جو کسی خاص وقت میں سرگرم کار ہوتی ہیں۔
ذہین افراد معاشرتی تبدیلیوں کو ایک خاص سمت میں موڑ سکتے ہیں۔ مگر انہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لانا ان کے
لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں نہ تو اندھا دھند ماضی کی تقلید کرنا چاہیئے اور نہ کسی خوش آیند نصب العین کے مستقبل میں
اچانک حاصل ہو جانیکی توقع رکھنا چاہیئے۔

جنسی قیود کی ضرورت اور عدم ضرورت پر ایک نظر

پندرھویں بیان میں یہ سوال
کیا گیا تھا کہ کیا تمام جنسی قیود دور

پابندیوں کو ختم کر دینا چاہیئے تاکہ لوگ اپنی اپنی فطرت کی پیروی کر کے حقیقی خوشی حاصل کر سکیں۔ یقیناً معاشرے کو قتل اور چوری پر پابندیاں عائد کرنا ہی پڑتی ہیں تاکہ لوگ پرسکون زندگی بسر کر سکیں لیکن آخر مذہب اور اخلاق جنسی افعال پر کیوں لے دے کرتے ہیں۔۔ مردوں اور عورتوں کو انکی مرضی پر کیوں نہ چھوڑ دیا جائے کہ جسطرح چاہیں خوشی اور تسکین حاصل کریں۔ اگر ہم اجتماعی طور پر یہ تسلیم کر لیں کہ متذکرہ بالا پابندیاں نہیں ہونی چاہیں اور انہیں اٹھا لیا جائے تو کیا اس سے مفید نتائج حاصل ہو سکیں گے؟

کبھی کبھی موجودہ دور کا انسان خود کو زین میں کسے ہوئے گھوڑے کیطرح محسوس کرتا ہے جس کے منہ میں بڑی سخت لگام ڈال دی گئی ہو اور جو کوڑے کے ڈر سے ایک بہت وزنی تانگہ کھینچ رہا ہو یا منہ کے اوپر چڑھے ہوئے توبڑے سے ہی چارہ کھا رہا ہو۔ اسے آزادی کیوں نہ دے دی جائے کہ جہاں اور جس کھیت سے اسکا جی چاہے گھاس چر لے جس چشمے سے چاہے پانی پی لے اور جہاں اسکا جی چاہے لیٹ رہے۔ اسے رسوم اور روایات میں اسقدر کیوں جکڑ دیا جاتا ہے کہ اسکی خوشیاں اور مسرتیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ آخر ایک بچہ جنس کے متعلق جو سوالات اسکے دل میں اٹھتے ہیں کیوں نہیں پوچھ سکتا؟ اور بلا خوف کوئی جنسی تجربہ کیوں نہیں کر سکتا؟ وہ مشت زنی کیوں نہیں کر سکتا؟ اور اگر وہ ایسا کرتا ہے اور کوئی اسے دیکھ لیتا ہے تو اسکے دل میں شرمندگی کا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے۔ سبق لگانے کیلئے اسے تخلیہ کی ضرورت کیوں ہو؟ بالغ لڑکے اور لڑکیاں اگر ہم جنسیت کا شیوہ اختیار کرنا چاہیں اور انہیں اسی میں آسودگی ملتی ہو تو انہیں اس سے روکا کیوں جائے؟ انہیں آزادانہ مباشرت پر کیوں مطعون کیا جائے۔ انہیں شادی کرنے پر مجبور کیا جائے کیوں نہ جتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیں رہیں اور جب جی چاہے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ عورتیں اپنے لباس کی قطع و برید میں کیوں شرم و حیا کے کسی خاص نظریے کو ملحوظ رکھیں اور کیوں پردہ کریں وغیرہ یہ اور اسی نوع کے بیسیوں سوال غور طلب ہیں۔ اگر ہم ان تمام سوالوں کا جواب یہ دیں کہ اس قسم کی مکمل آزادی کے نتائج سوائے بدچلنی اور بے راہ روی کے اور کچھ نہیں ہو سکتے تو ایک اور سوال پیدا ہوگا کہ آخر "اخلاقیات" کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جانوروں میں تو کوئی نظام اخلاق نہیں ہوتا؟ پھر اگر انسان کی زندگی میں اخلاقیات کی ضرورت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اخلاقیات میں صرف جنسی نظام اخلاق کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے یہ

سب باتیں ایسی ہیں جن پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ہم بہت سی غیر ضروری اور مضر رسموں میں پھنس جاتے ہیں جن سے سوائے کلفت و غم کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ہمیں انکا جائزہ لے کر انہیں بدل دینا چاہیئے نہ یہ کہ لکیر کے فقیر بنے ہوتے۔ انکی پیروی کرتے رہیں اسلئے کہ وہ عام طور پہ درست مانی جاتی ہیں اخلاقیات تو باطنی ضبط و نظم کا نام ہے۔ اسے تو ہم ایک ایسی خواہش کہہ سکتے ہیں جسمیں ہم کسی ایک طریق کار کے مقابلے میں کوئی دوسرا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں اسلئے نہیں کہ ہم مجبور ہوتے ہیں یا ہمیں یہ توقع ہوتی ہے کہ اس سے ہمیں کوئی ذاتی فائدہ پہنچے گا۔ بلکہ اسلئے کہ اس طریقے پر چلنا صحیح طرز عمل سمجھتے ہیں۔ جانوروں میں اگر کوئی اخلاقی نظام نہیں ہے۔ در انسانوں میں ہے تو اسکا سبب یہی ہے کہ انسان حیوانوں سے مرتبہ میں بلند ہے اور تہذیب و تمدن کا مالک ہے۔ انسان نے بعض قیود غالباً عائد بھی اسلئے کی تھیں۔ کہ معاشرہ کا تحفظ ہو سکے معاشرتی تعاون کا فروغ ہو اور وہ بخوبی نشو و نما پا سکے اور ایک ایسی زندگی کو ختم ہونے سے بچا لیا جائے۔ جو شاید موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ ان اخلاقی پابندیوں کو توڑ دیں اور اخلاقیات کو یک قلم ترک کریں بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ اخلاقیات کو اس قدر موثر بنا دیں کہ لوگوں کی زندگی بہتر سے بہتر ہوتی جائے۔

بعض اوقات ہم اس آدمی کی بے حد تعریف کرتے ہیں جو معاشرتی رسوم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جنہیں عام طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن صرف اس صورت میں جب کہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ کسی اعلےٰ اخلاقی معیار کے تحت یہ کام سرانجام دے رہا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے پہلے پہل غلامی کے خلاف آواز اٹھائی انہیں برا بھلا کہا گیا حتےٰ کہ بعض لوگوں نے اپنی مذہبی کتابوں سے غلامی کا جواز بھی ڈھونڈ نکالا۔ غلامی کے خلاف آواز اٹھانے والوں نے پورے اخلاقی نظام کو ترک کرنے کے لئے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا انہوں نے تو صرف اسلئے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ کہ یہ حقیقت تسلیم کرائی جائے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کو اپنا زر خرید غلام بنائے اس لئے معاشرتی تعصبات کے طالب علم کی حیثیت سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ رسوم کو توڑا جائے یا اخلاقیات کی طرف سے غفلت برتی جائے بلکہ ہمارا نصب العین نئی رسوم اور اعلیٰ اخلاق کا تعمیر کرنا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات کے جوابات کا خلاصہ

ماہرین نفسیات کے پاس مندرجہ پندرہ بیانوں کا کیا جواب ہے یہ دیکھنے کے لئے ذیل کے خاکہ کا مطالعہ خالی از لطف نہ ہو گا۔

بیان نمبر	جواب
بیان ۱	نہیں
” ۲	غالباً ہاں
” ۳	نہیں
” ۴	ہاں
” ۵	ہاں خصوصاً اگر ہم "انفعالی" کی بجائے "آغوش کشادہ" کے الفاظ استعمال کریں۔
بیان ۶	نہیں
” ۷	ہاں مگر اسکا انحصار معاشرتی رسوم پر ہے۔
” ۸	غالباً ہاں
” ۹	نہیں یا بڑی حد تک مشکوک
” ۱۰	نہیں
” ۱۱	نہیں۔ بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔
” ۱۲	بہت مشکوک ہے۔ کئی دوسری باتیں بھی تو ممکن ہو سکتی ہیں۔
” ۱۳	نہیں مگر اسکا انحصار اس بات پر ہے کہ "پیدائشی" سے کیا مراد لیا جاتا ہے۔
” ۱۴	یہ ایک ایسا بیان ہے جسکے متعلق بہت زیادہ اختلاف

رائے پایا جاتا ہے۔ ویسے بھی اسکو واضح حقائق سے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔

بیان نمبر ۱۵ — جواب: نہیں

ہم یہ نہیں کہتے کہ مذکورہ سب جواب واقعی درست ہیں اور آپ انہیں من و عن قبول کر لیں آپ اپنے مشاہدے سے کام لیں اور تجربے اور مشاہدے سے سیکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔ اگر ہمارے پاس ان سب مسائل کی بابت مزید ٹھوس حقائق ہوتے تو انکو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا۔ چنانچہ معاشرتی نفسیات کے عالموں کا یہ بھی ایک فرض ہے کہ ایسے مسائل کے متعلق نئے نئے اعداد و شمار اور حقائق معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اسی باب کے صفحہ ۱۶۶ پر ہم نے کچھ خاص اعداد و شمار دیئے ہیں جو ۷۹۲ امریکی جوڑوں سے حاصل کئے تھے۔ یہ سب افراد متوسطہ اور اعلےٰ متوسط[1] امریکی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر میاں بیوی نے سینکڑوں سوالوں پر مشتمل ایک سوالنامہ کو آزادانہ طریق پر پر کیا تھا اور کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ ان میں سے بیشتر سوالوں کا تعلق انکی شخصیت اور انکی خصوصیات سے تھا جیسے کہ کیا آپ اکثر دن سپنے[2] دیکھتے ہیں اور بہت سے سوال انکی پسند کے پیشوں، مضامین اور لوگوں کے متعلق تھے۔ کچھ سوال ایسے تھے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس قسم کی شادی کو مثالی شادی سمجھتے ہیں۔ مثلاً کیا شوہر کو بیوی سے عمر میں چند سال بڑا ہونا چاہیئے، یا کیا دونوں کی تعلیم یکساں ہونی چاہیئے یا کم و بیش۔ متعدد سوال انکی موجودہ ازدواجی زندگی کے متعلق تھے (جیسے میاں بیوی میں کن باتوں کے بارے میں اختلاف پیدا ہوتا ہے اس اختلاف کو دور کیسے کیا جاتا ہے۔ انکی مشترکہ آمدنی کیا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے پر کس قسم کی تنقید کرتے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔ سوالوں کے کئی مجموعے ایسے تھے جو ازدواجی خوشحالی پر روشنی ڈالتے تھے۔ جیسے کیا آپ کو اپنی شادی پر افسوس ہوتا ہے یا آپ کو اگر شادی کا دوبارہ موقعہ ملے تو کیا آپ اسی شخص سے پھر شادی کریں گی یا یہ بتایئے کہ مجموعی حیثیت سے آپکی شادی کہاں تک کامیاب رہی ہے سوالنامے میں ایک حصہ ایسے سوالوں پر مشتمل تھا جنمیں یہ پوچھا گیا تھا کہ میاں بیوی کے اپنے اپنے والدین سے تعلقات کیسے ہیں اور گھر پر انکی تربیت کس انداز پر ہوئی وغیرہ۔ سب سے آخر میں کچھ ایسے سوال بھی تھے جو جنسی مطابقت کے متعلق تھے۔ ہم نے جو سوال اوپر درج کئے ہیں وہ ان سوالوں کا ایک مختصر سا خاکہ ہے تفصیلات کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

1 Upper middle class. 2 Day-dreams.

اوپر لکھے ہوئے تمام سوالوں کے جواب سامنے رکھ کر اس بات کا پورا پورا جائزہ لیا گیا ہے کہ مختلف جوابوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے اور وہ کون کونسے عوامل ہیں جو امریکہ کے ان معاشرتی طبقوں کی شادیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ متعدد ایسے عوامل ہوتے ہیں جنکا ازدواجی زندگی کی خوشی یا ناخوشی پر کوئی اثر نہیں ہوتا (مثلاً یہ کہ خاندان کی آمدنی کیا ہے) لیکن بعض ایسے عوامل بھی نظر آئے جنکا شادی کی کامیابی پر خاصا اثر پڑتا ہے۔ پورے اعداد و شمار کی تفصیلات کے لئے صفحوں کے صفحے درکار ہونگے۔ کامیاب شادی کے پس منظر میں مندرجہ ذیل چار باتیں واضح طور پر نظر آئیں۔ (۱) والدین کی پر مسرت ازدواجی زندگی (۲) خوشیوں سے بھرپور بچپن۔ (۳) ماں سے مخالفت کا فقدان (۴) گھر کا مضبوط مگر درشتی سے خالی ضبط و نظم۔ جنسی عوامل خلاف توقع زیادہ اہم ثابت نہیں ہوئے۔ اگرچہ جنسی میلان کا زبردست فرق میاں بیوی میں رنجش کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ اس معاملے میں بھی مزاج اور افتادِ طبع زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار امریکہ کے مرد اور عورتوں کے متعلق ہیں اگر ایسے ہی اعداد و شمار ہمارے پاس پاکستان کے متعلق بھی ہوتے تو بڑا دلچسپ ہوتا ہو سکتا تھا تو ہم پاکستانی اور امریکی شادی کے طریقوں کی نوعیت ٹھیک ٹھیک طور پر سمجھ سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس معاملہ میں نتائج اخذ کرنے میں کسی قسم کی عجلت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ مثلاً تحقیق کے بعد ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہ مرد جنکی دو بیویاں ہیں ان مردوں سے نسبتاً کم خوش ہیں جنکی ایک ہی بیوی ہے تو اگر اس سے ہم فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ دو بیویاں رکھنے والے مرد اوسطاً ایک شادی کرنے والوں سے نسبتاً کم خوش ہوتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ ہمارا نتیجہ صحیح نہ ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دوسری شادی ناخوشی کا سبب نہ ہو بلکہ اسکا نتیجہ ہو۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ شماریاتی مطالعے[1] کا مقصد بالواسطہ کچھ ایسے سوال پیدا کرنا ہوتا ہے جنکا جواب مزید تحقیقات ہی مہیا کر سکتی ہیں۔

دو شماریاتی مطالعے

صفحہ ۱۶۶ پر ہم نے ازدواجی خوشی کے متعلق ایک مطالعہ کا ذکر کیا ہے ذیل میں ہم ایک اور مخصوص[2] امریکی مطالعہ[3] کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس میں ۹۰۲ مردوں اور ۶۴۴ امریکی عورتوں نے حصہ لیا۔

1_ Statistical Studies. 2 Typical 3 Study.

۲۵ء ۵ فی صد مردوں اور ۲۷ء ۲ فیصد عورتوں کا بیان ہے کہ انکی شادی خوشی کے لحاظ سے نمایاں طور پر کامیاب ہے

۲۹ء ۴ " " " " ۲۸ء " " کہ انکی شادی اوسطاً یقیناً کامیاب ہے

۱۲ء ۱ " " " " ۱۰ء ۱ " " " کہ انکی شادی اوسط سے کچھ زیادہ کامیاب ہے۔

۱۸ء ۳ فیصد مردوں اور ۱۶ء ۳ فیصد عورتوں نے بیان دیا کہ انکی شادی اوسط حد تک کامیاب ہے۔

۶ء ۹ " " " ۷ء ۲ " " " " " " اوسط سے کچھ کم کامیاب ہے

۲ء ۴ " " " ۴ فیصد " " " " " اوسط سے یقیناً کم کامیاب ہے۔

۴ فیصد " " " ۱ء ۷ " " " " " کہ انکی شادی از حد ناکام ہے۔

کیا یہ بات کافی دلچسپ نہیں کہ دو تہائی لوگوں کے نزدیک جہاں تک مسرت کا تعلق ہے انکی شادیاں کامیاب ہیں اور صرف ⅙ لوگوں کی شادیاں اوسط سے کم خوش کہی جا سکتی ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کا مطالعہ یقیناً دلچسپ نتائج کا حامل ہوگا۔

ایک اور شماریاتی مطالعہ جس کا تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے بیروت یونیورسٹی کے ۱۰۳ طالب علموں کا ہے ان طلبا نے خود اپنے جنسی تجربوں اور سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے اور دوسرے طلبا کے متعلق بھی اپنا اندازہ بتایا ہے اسکے مقابلے میں امریکی طلبا کی ایک جماعت کے اعداد و شمار ہیں جو نسبتاً کم عمر تھے یہ تین باتیں قابل غور نظر آئیں۔

مشت زنی	مقاربت بہ جنس مخالف	مقاربت بہ ہم جنس
عرب ۹۱ء۱ فی صد	۶۹ فی صد	۳۸ فی صد
امریکی ۹۲ء۸ فیصد	۴۵ فی صد	۲۷ فی صد

لاہور کے طلبا و طالبات کا شادی کے متعلق رویہ

۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں ایف سی اور کینیرڈ کالج لاہور کے طالبعلموں اور طالبات کا شادی کے متعلق رویہ معلوم کرنے کے لیے جدا جدا تجربے کیے گئے تھے ۲۰ لڑکیوں اور ۷۰ لڑکوں سے یہ پوچھا

گیا کہ کیا بیوی کو بھی ملازمت کرنی چاہیئے۔ (۱) لڑکیوں اور لڑکے نے کہا کہ ہاں بیوی کو بھی ملازمت کرنی چاہیئے (۲) کیا خانگی امور تنہا بیوی پر چھوڑ دینے چاہیئے یا خاوند کو بھی انہیں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ سب طلبا اور خاص کر طالبات اس بات کے حامی تھے کہ خاوند کو بھی خانگی امور میں کافی حصہ لینا چاہیئے (۳) ایک بی اے پاس خاوند کی بیوی کا تعلیمی معیار کیا ہونا چاہیئے خود لڑکیوں نے بیوی کا جو تعلیمی معیار مقرر کیا وہ لڑکوں کے مقرر کردہ معیار سے کہیں بلند تھا۔ (۴) تم اپنے چھوٹے بہن بھائی کی شادی کے لئے کس قسم کا نظام انتخاب پسند کرو گے (والدین رشتہ تلاش کریں یا وہ خود) اسی طرح (۵) ایک سوال پردہ کے متعلق تھے۔ اس قسم کے کسی ایک تجربہ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن ایسے بے شمار مطالعے کیے جانے چاہئیں کسی دو گروہوں کا مقابلہ کرتے وقت یہ دھیان میں رکھنا چاہیئے کہ وہ جنسی لحاظ کے علاوہ باقی کن کن باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً کالج کی ان طالبات نے لڑکوں کی بہ نسبت اس بات پر زیادہ زور دیا کہ شادی کرنی چاہیئے۔ یہ سب طالبات لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں معلوم ہوتا ہے بعض جواب بہت سوچ سمجھ کر دیئے گئے ہیں اور بعض دفع الوقتی کے لئے تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ نہ ہونے کے مقابلہ میں کچھ اعداد و شمار کا ہونا بہتر ہے کیونکہ اس سے زیر غور مسئلہ کے متعلق چند ایسے سوال سامنے آ سکتے ہیں جو کافی تحقیق طلب ہوتے ہیں یا جو مزید تفتیش کی دعوت دیتے ہیں۔ ایسے اعداد و شمار نسبتاً زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں اگر وہ ایک ہی کالج کے طلبا سے اکٹھے نہ کیے جائیں بلکہ کوشش یہ ہو کہ جس قدر مختلف کالج کے طلبا اس میں حصہ لیں اتنا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں زیادہ قابل اعتماد نتائج حاصل ہو سکیں گے اگر ہر تین چار سال کے بعد نئے سرے سے اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو اور بھی مفید ہوگا کیونکہ اسطرح یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ لوگوں کے خیالات کس سمت بدل رہے ہیں اور اگر ہم ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اپنا مطالعہ اور تحقیق جاری رکھیں تو ممکن ہے ہم عورتوں اور مردوں کے باہمی مراسم اور ان سے متعلقہ گوناگوں مسائل کو رفتہ رفتہ نہایت اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

آٹھواں باب

رویوں کی پیمائش

ابتدائیہ

معاشرتی نفسیات کے ماہر ہمارے کردار کے متعلق بہت سے حقائق جمع کرتے ہیں، انکا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ان کا باقاعدہ تجزیہ کر کے معاشرتی کردار سے تعلق رکھنے والے عالم اصولوں کو مرتب کرتے ہیں۔ وہ دوسرے سائنسدانوں کی طرح نئے نئے تجربے بھی کر سکتے ہیں، متعلقہ مواد کی ناپ تول بھی کرتے ہیں اور اسکی جانچ پڑتال بھی۔

رویہ کے معنی

اس باب میں ہم چند ایسی مثالیں پیش کریں گے جنمیں مختلف رویوں کی علاحدہ علاحدہ کسی خاص قسم طریقے سے پیمائش کی گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ رویہ سے مراد کیا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس عورت یا مرد کا شادی کے متعلق یہ رویہ ہے یا وہ اشتراکیت اور پنڈت نہرو کے بارے میں یہ "رویہ" رکھتا ہے تو اس سے ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے مختصراً اسکا مطلب یہ ہے کہ اس عورت یا مرد میں ان سب کے متعلق ایک خاص انداز میں محسوس کرنے اور سرگرم کار ہونے کے، رجحانات پائے جاتے یعنی وہ جب بھی انکے متعلق کچھ سوچیں گے یا محسوس کرینگے اور کوئی عملی قدم اٹھائیں گے تو ایک خاص ڈھنگ سے

اور ایک خاص زاویہ سے اکثر ہماری آرا اور عقائد وہی ہوتے ہیں جو ہم سوچتے ہیں عموماً ہم انہیں اپنے رویوں ہی سے اخذ کرتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات اپنے رویہ کی نوعیت معلوم کرنے کی خاطر ہم اپنی رائے ہی کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ "رائے" کو "رویے" سے یکسر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی بات کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں ہم چند امتحان کے طریقے درج کرتے ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ پیمائش اور جانچ پڑتال کا یہ ڈھنگ کسقدر وزنی اور صحیح ہے۔

سٹیریو ٹائپ ٹسٹ[1]

تیسرے باب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مختلف جینوں کی طرف لوگوں کے "رویے" کتنے مختلف ہیں۔ کیا ہم ان رویوں کی پیمائش کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ایک ایسا ہی طریقہ امتحان درج کیا جاتا ہے جسکے ذریعے بعض اسی قسم کے رویوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

کسی ٹسٹ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے بہتر تو یہی ہے کہ سب سے پہلے آپ خود اسے اپنے اوپر آزمائیں۔ اور پھر دوسروں پر اسکا تجربہ کریں اور دیکھیں کہ دوسروں کے رویہ کی تفہیم میں آپ کو اس سے کیا مدد ملتی ہے اگر آپ کے پاس تختہ سیاہ ہے تو آپ بڑی آسانی سے متعدد لوگوں کو بیک وقت طریقہ امتحان پر عمل پیرا ہونے کے لئے کہہ سکتے ہیں متعلقہ ہدایات آپ زبانی سمجھا سکتے ہیں۔ مثلاً پہلے کالم میں مختلف قسم کے لوگوں کی ایک فہرست ہے دوسرے کالم میں چند اسمائے صفت[2]۔ دونوں کا بغور مطالعہ کریں۔ پھر پہلے کالم کے ہر نمبر کے آگے وہ صفتیں لکھتے جائیں (یا بہتر ہو گا انکے نمبر) جو آپکے خیال میں اس قسم کے آدمی پر صادق آتی ہوں۔ ہر قسم کے آدمی کے لئے چار یا پانچ صفات منتخب کریں۔

1 Stereotypes
2 Adjectives

{ رویوں کی پیمائش کرنے کے امتحانی انداز جنکا تفصیلی ذکر نیچے درج کیا جا رہا ہے۔ }

(۱) انگریز
(۲) روسی
(۳) امریکی
(۴) ہندو
(۵) سکھ
(۶) سیاستدان
(۷) پولیس کے افسر
(۸) کالج کے اساتذہ
(۹) پنجابی
(۱۰) عورتیں
(۱۱) مرد

۱۔ امن پسند۔ ۲۔ دیانتدار۔ ۳۔ باتونی

۴۔ بے ادب۔ ۵۔ بزدل۔ ۶۔ بددیانت

۷۔ بے وقوف۔ ۸۔ جذباتی۔ ۹۔ جھگڑالو۔ ۱۰۔ دروغ گو

۱۱۔ "۴۲۰"۔ ۱۲۔ بہادر۔ ۱۳۔ شیخی باز۔

۱۴۔ ذہین۔ ۱۵۔ رحم دل۔ ۱۶۔ زندہ دل

۱۷۔ سخی۔ ۱۸۔ صاف گو۔ ۱۹ صاف ستھرا

۲۰۔ ظالم۔ ۲۱۔ فرقہ پرست۔ ۲۲۔ رجعت پسند

۲۳۔ کاہل۔ ۲۴۔ کنجوس۔ ۲۵۔ غلیظ

۲۶۔ لالچی۔ ۲۷۔ متعصب۔ ۲۸۔ مذہبی

۲۹۔ محنتی۔ ۳۰۔ وفاشعار۔ ۳۱۔ تنگ ظرف

ان کنس صفات میں سے کوئی چار یا پانچ صفات چن کر انگریز روسی پنجابی وغیرہ کے سامنے لکھیئے۔

مثال کے طور پر انگریزوں کے سامنے آپ یہ صفات لکھتے ہیں۔

۱۹۔ ۱۱۔ ۲۹۔ ۳۱ (صاف ستھرا۔ ۴۲۰۔ ذہین۔ محنتی۔ تنگ ظرف۔

اور روسیوں کے سامنے آپ لکھتے ہیں۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۲۰۔ ۲۹ (بہادر۔ ذہین۔ ظالم۔ محنتی)

اگر اسطرح آپ نے اپنا امتحان لے لیا تو گویا ایک لحاظ سے ان لوگوں کے بارے میں آپ نے اپنے رویے کا اظہار کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بھی بیان کر دیا کہ روسی کس قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور انگریز کس قسم کے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی گروہ کے سبھی لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو سکتے ہیں بایں ہمہ ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ چنانچہ جب بھی ہم ایک خاص وضع کے کسی نئے آدمی سے ملتے ہیں تو ہم ایک بڑی حد تک اس سے ایک خاص قسم کے کردار کی توقع کرتے ہیں اور پھر اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکے ساتھ ایک خاص طرح سے پیش آتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں اسی قسم کا ایک ٹسٹ ٹی آئی کالج۔ ایف سی کالج اور کنیرڈ کالج لاہور کے ۲۲۵ طلبا کو دیا گیا تھا جس سے بہت سی دلچسپ باتیں

معلوم ہوئیں مثلاً وہ پانچ صفات جو انگریزوں، روسیوں اور سیاست دانوں کے لئے عموماً استعمال کی گئیں وہ یہ ہیں۔

انگریز ۔ محنتی ۔ ذہین ۔ صاف ستھرے ۔ دیانت دار ۔ چارسو بیس ۔

روسی ۔ محنتی ۔ ظالم ۔ چارسو بیس ۔ ذہین ۔ بہادر ۔

سیاست دان : ذہین ۔ چارسو بیس ۔ باتونی ۔ بددیانت ۔ جھوٹے ۔

قابل غور یہ امر ہے کہ "ذہین اور چارسو بیس" ہر دو صفات تینوں قسم کے لوگوں کے لئے استعمال گئی ہیں ۔ لیکن اسکے باوجود تینوں گروہوں کے مکمل خاکے سامنے رکھے جائیں تو وہ ایک دوسرے سے یقیناً مختلف ہوں گے۔ مختلف قسم کے لوگ ایک دوسرے کے متعلق جو احساس رکھتے ہیں اگر کسی طرح ہم اسے "ناپ" تول سکیں تو جماعتی¹ تعلقات کو سمجھنے میں کتنی آسانیاں پیدا ہو جائیں ۔

جوابات اور احتیاط اور خلوص

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگ ایسے امتحانی سوالات کے جوابات اتنے احتیاط و خلوص سے دیتے ہیں کہ ان سے قابل قدر نتائج اخذ کیے جا سکیں ۔ اگر نشان² دہی بے ربط اور بے بنیاد ہو تو مختلف گروہوں کے خاکوں میں کوئی باضابطہ اختلاف یا فرق نظر آئے گا ۔ اسکے علاوہ مختلف گروہوں سے ایک امتحان ہی کے متعلق جو نظر بے اور جواب ہونگے انمیں بھی بہت کم ہم آہنگی پائی جائے گی لیکن مذکورہ بالا تحقیق اور اس قسم کی دیگر تحقیقات جو بیرونی ممالک میں کی گئی ہیں ۔ انہیں کافی حد تک ربط اور ہم آہنگی نظر آتی ہے ۔ ہمارے یہاں ان تینوں کالجوں کے طلبا نے بھی اپنے رجحانات میں بہت حد تک یک جہتی کا اظہار کیا ہے ۔ جہاں کہیں اختلافات پائے جاتے ہیں تو اسکے بھی کچھ اسباب ہیں مثال کے طور پر ایف سی کالج کے طلبا نے جن کے اکثر اساتذہ امریکی ہیں انگریزوں کی نسبت امریکیوں کا زیادہ جاذب توجہ خاکہ پیش کیا ہے ۔ اسکے برعکس کینیرڈ کالج کی طالبات نے انگریزوں کو امریکیوں پر فوقیت دی ہے کیونکہ انکی اکثر مدرس انگریز خواتین ہیں ۔ اگر ایک گروہ کے چند افراد بے پروائی سے جوابات تحریر کریں تو بھی پورے گروہ کی مجموعی رائے اچھی خاصی بامعنی تصویر پیش کرے گی ۔ اس کا

1 Group-relation. 2 Marking

مطلب یہ نہیں کہ ایک گروہ کے سبھی لوگ ہمیشہ ہم خیال ہوتے ہیں مثال کے طور پر مشرقی پنجاب کے مہاجرین کے متعلق ۴۹ افراد نے یہ رائے دی کہ وہ امن پسند ہیں اور ۴۸ نے یہ رائے دی کہ وہ "جھگڑالو" ہیں۔ اسی طرح ۶۲ آدمیوں کے خیال میں انگریز "دیانت دار" تھے اور ۳۵ کے خیال میں بد دیانت۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک گروہ کے پیش کردہ مجموعی خاکے میں مخالف آرا بھی شامل ہو سکتی ہیں۔

جواب اور صنف

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایف سی کالج اور کینیرڈ کالج کے طلبا اور طالبات جدا جدا رائے رکھتے ہیں تو کیا اس رائے میں انکی صنف کا بھی کچھ دخل ہے کیا اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ایک کالج مردوں کا ہے اور دوسرا عورتوں کا۔ لیکن وجہ اختلاف اگر یہ ہوتی تو ٹی آئی کالج اور ایف سی کالج کے طلبا کے نظریات یکساں ہونے چاہیں۔ یا اگر ہم لاہور کالج فار ومن کی رائے پوچھیں تو انکی اور کینیرڈ کالج کی طالبات کی آرا ایک سی ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہمیں اس اختلاف کی کوئی دوسری وجہ تلاش کرنا پڑے گی۔ دو گروہوں کے اختلاف سے ہم فوراً کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے البتہ ایک دلچسپ مسئلہ ہمارے ہاتھ آجاتا ہے جس پر مزید معلومات و حقائق فراہم کر کے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس سلسلہ میں کافی مواد اکٹھا کر لیں تو ایسے بہت سے سوالات کا حل مل سکتا ہے جو ادیبوں کی ماپ[1] تول کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔

موافق اور غیر موافق خاکہ

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں خاکہ انگریزوں کے لئے "موافق"[2] ہے یا فلاں خاکہ امریکیوں کے لئے غیر موافق تو اس سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟ موافق خاکہ وہ خاکہ ہوتا ہے جس میں غیر موافق صفات کی نسبت موافق صفات زیادہ ہوں اور غیر موافق خاکہ وہ ہوتا ہے جس میں موافق صفات نسبتاً کم ہوں۔ ایک گروہ کے متعلق دی ہوئی دونوں قسم کی صفات کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خاکہ مجموعی طور پر موافق ہے یا غیر موافق۔

ہم نہ صرف مختلف گروہوں کے باہمی اختلافات کی پیمائش کر سکتے ہیں بلکہ کسی گروہ کے رویوں میں آنے والی تبدیلیوں کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً جن دنوں لاہور اور امرتسر میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے

1 Testing. 2 Favourable.

سے تھے کیا لاہور کے طلبا کا رویہ ہندوؤں اور سکھوں کے متعلق بدل گیا تھا اور کیا یہ تبدیلی دونوں طرف یکساں تھی اس موقعہ پر جو تھوڑے بہت حقائق اس ضمن میں فراہم کئے گئے تھے ان سے ایک خاص تبدیلی ضرور نمایاں تھی۔ اس قسم کی تحقیقات سے ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ سیاسی اقدام کا لوگوں کے رجحانات پر کیا اثر پڑتا ہے سیاسی اقدام سے ہماری مراد بین الملکتی معاہدات ہیں اسی طرح کے چند اور طریقوں کی مدد سے ہم اس بات کا پتہ بھی لگا سکتے ہیں کہ غیر قوم کے افراد اور انکی حکومت کے متعلق لوگوں کے کیا رویے ہیں اور انکیں کس حد تک اختلاف ہے مثلاً کسی ملک کے باشندوں کے متعلق ہمارا ایک رویہ ہو سکتا ہے اور وہاں کی حکومت کے متعلق دوسرا ہو سکتا ہے کہ چین کے باشندوں کی متعلق ہمارا جو رویہ ہے وہ وہاں کی حکومت کے متعلق نہ ہو۔ رویوں کا جائزہ سیاسیات کے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ جب یہ معلومات اور حقائق ہمارے سامنے آئیں تو ہم یہ محسوس کریں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہم تو ان باتوں کو مشاہدے اور معمولی سوجھ بوجھ کی بنا پر پہلے ہی سے جانتے تھے لیکن سائنٹیفک رویہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس احساس کی صداقت کا پتہ چلانے کے لئے عملی قدم اٹھائیں اور یونہی اپنے خیال کو درست نہ مان لیں۔ باقاعدہ تحقیق شدہ نتائج کو دیکھنے سے پہلے خود اس بات کا اندازہ لگائیں کہ نتائج کیا ہونگے۔ اگر ہو سکے تو اپنے دوستوں کے قیاسات بھی قلم بند کر لیں اسکے بعد سائنٹفک طور پر مرتب کئے ہوئے نتائج کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ آپ کے اندازے کس حد تک صحیح تھے یا آپ میں سے کس کا قیاس زیادہ درست تھا۔ اور کس نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ باقاعدہ مرتب شدہ نتائج کو دیکھ لینے کے بعد یہ کہہ دینا آسان ہے کہ ہمیں معلوم تھا کہ عام جوابات کیا ہونگے نتائج کو دیکھے بغیر انکا صحیح اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں ہوتا

اس طرح ہمارے لئے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ہر قسم کے رویہ کے ٹسٹ کی مدد سے اپنا جائزہ لے سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ پچاس آدمیوں کا ایک ہی قسم کا امتحان لیتے ہیں تو امتحان کے وقت آپ انکو ہدایت کریں کہ وہ دو طریقوں سے جواب دیں پہلے تو ہر آدمی اپنی اپنی ذاتی رائے لکھے پھر یہ لکھے کہ اسکے خیال میں گروہ کی اکثریت ان سوالوں کے کیا جواب دے گی۔ جب امتحان کے نتائج جمع کر لیں تو دیکھیں کہ ہر سوال کے متعلق کل کتنے جواب صحیح ہیں۔ جس شخص کے جواب سب سے زیادہ صحیح ہوں وہ خود کو امتحان دینے والے گروہ کے رویوں

کا بہترین مبصر سمجھ سکتا ہے۔

صحیح اندازوں کا اس طرح جائزہ لینا ایک دلچسپ مشغلہ ہی نہیں بلکہ اس سے ہمیں اس بات کا پتہ لگ جاتا ہے کہ ہم کس حد تک ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور کن حالات میں ہم ایک دوسرے کو غلط سمجھتے ہیں۔ معاشرتی نفسیات میں یہ حقائق بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسی امتحان کا ایک رخ

سٹریوٹائپ طریقہ امتحان کی مدد سے ہم لوگوں کے رویوں کا فرداً فرداً مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ طالب علموں کے جس گروہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان میں سے ایک طالب علم روسیوں کے متعلق چار خوبیوں کا ذکر کرتا ہے اور ایک برائی کا۔ ایک دوسرا طالب علم امریکیوں کے بارے میں اسکے بالکل برعکس رائے رکھتا ہے یعنی وہ انہیں صرف ایک خوبی دیکھتا ہے اور چار برائیاں۔ چنانچہ دونوں طلبا کے رویے واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ جب ہم چار مختلف قسم کے لوگوں یعنی امریکی۔ روسی۔ ہندو اور پنجابی کے متعلق بیان کردہ صفات[1] کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو امتحان دینے والے لوگوں کے مختلف گروہ بن جاتے ہیں مثلاً:-

(۱) وہ لوگ جو روسیوں امریکیوں اور ہندوؤں کے لئے زیادہ تر غیر موافق صفات استعمال کرتے ہیں اور پنجابیوں کے لئے موافق۔ انہیں غیر ملکی لوگوں کا مخالف[2] کہا جا سکتا ہے (۲) وہ لوگ جنکے جوابات پہلے گروہ کے مختلف یا متضاد ہوں انہیں غیر ملکی لوگوں کا حامی[3] کہا جا سکتا ہے۔ (۳) وہ لوگ جنہوں نے روسیوں اور امریکیوں کے خلاف اور ہندوؤں اور پنجابیوں کے لئے عام طور پر موافق صفات استعمال کئے ہوں انہیں "مغرب[4] دشمن" کہا جا سکتا ہے (۴) وہ جنکے جوابات نمبر ۳ کے بالکل برعکس ہوں انہیں مغرب "دوست[5]" کہہ سکتے ہیں۔ (۵) امریکیوں کے لئے موافق اور روسیوں کے لئے غیر موافق صفات کا سہارا لینے والوں کو امریکیوں کا حامی اور روسیوں کا مخالف" کے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے (۶) اسکے برعکس نشان لگانے والے روس کے حامی اور امریکیوں کے مخالف افراد

1 adjectives. 2 Anti-foreign. 3 Pro-foreign.
4 Anti-Western. 5 Pro-Western.

دیئے جا سکتے ہیں۔ (۷) اگر کوئی ایسا ہو جس نے انگریزوں، روسیوں اور پنجابیوں کے لئے زیادہ تر غیر موافق اور ہندوں کے لئے موافق صفات استعمال کئے ہوں تو وہ "ہندو دوست" ہوگا۔ (۸) وہ لوگ جو ہر گروہ کے لئے زیادہ تر موافق صفات استعمال کریں انہیں رجائی کہا جائے گا یا وہ دوستانہ رویہ رکھنے والے کہلائیں گے وہ لوگ جو سبھی کیلئے غیر موافق صفات استعمال کریں وہ کسی پر بھروسہ نہ کرنے والے اور قنوطی لوگ سمجھے جائینگے۔

اس قسم کی جماعت بندی[1] کو مزید حقائق کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ مگر جماعت بندی کو شروع کرنے کے لئے ایسی تقسیم خاص قسم کی مدد دے سکتی ہے۔ اور کسی گروہ کے انفرادی رویوں کو سمجھنے میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے امتحان کا لفظ کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس سے ہماری مراد سٹیریو ٹائپ بلینک[2] ہے ہم ہیں ہے اکثر لوگوں کو امتحان کے نام سے نفرت ہے کیونکہ انہیں ناکامی کا خوف اور خدشہ ہوتا ہے اسکولوں میں جانچ کو امتحان کہتے ہیں اور امتحانات سے طلبا گھبراتے ہیں لیکن رویوں کی پیمائش کے سلسلے میں جو امتحان لیا جاتا ہے وہ دوسرے امتحانات سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو محض پیمائش ہے جو ہمیں اپنے آپ کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے اور دوسروں کے ساتھ اپنا موازنہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ مختلف لوگوں میں مختلف رویوں کی تعمیر کس طرح ہوتی ہے جب ڈاکٹر کسی مریض کے خون کا دباؤ ناپتا ہے یا اسکا درجہ حرارت دیکھتا ہے تو وہ بھی ایک امتحان ہی لیتا ہے امتحان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا سلیقہ آجائے۔

رویوں کے پیمانے[3]۔ اسکیل یا پیمانہ ایک خاص قسم کے امتحان کو کہتے ہیں جسمیں کسی فرد کا مقام دو انتہائی متضاد لفظوں کے درمیان متعین کیا جاتا ہے تشخیص کے کسی خاص وصف کو معلوم کرنے کیلئے ایسا کوئی امتحان آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً ذیل میں ایک خط مستقیم یہ نہائی سست سے لیکر انتہائی ہوشیار تک پانچ درجے بنائے جائیں اور ان درجات کو مدنظر رکھتے ہوئے خط مستقیم پر آپ اپنا مقام متعین کریں اور وہاں نشان لگائیں اسی پیمانہ پر آپ متفرق شکلوں کے نشانات دے

[1] Classification. [2] Sterotype blank
[3] Attitude scales.

کر اپنے دستوں کی جماعت بندی بھی کر سکتے ہیں۔

انتہائی کاہل ۱				انتہائی مستعد
۱	۲	۳	۴	۵
انتہائی کاہل اور سست (جو بغیر مجبوری کے کوئی کام نہ کرے)	خاصا سست کاہل الوجود	متوسط (جو کبھی بہت چست اور کبھی بہت سست	خاصا مستعد اور ہوشیار	انتہائی مستعد اور ہونہار جو ہر وقت ہر کام کرنے کے لئے تیار رہے

اس سکیل سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپکا اپنے متعلق کیا خیال ہے اور آپ دوستوں کے بارے میں کیا رویہ رکھتے ہیں آپ انکو کس قسم کا آدمی سمجھتے ہیں اور ان سے کس کردار کی توقع رکھتے ہیں۔ اشتراکیت کی طرف لوگوں کا رویہ معلوم کرنے کیلئے یہ سکیل استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک خط مستقیم کے ایک سرے پر اشتراکیت کا انتہائی مخالف لکھیئے اور دوسرے پر انتہائی دوست درمیان میں ایسے درجے بنائیے جو میانہ روی ظاہر کریں پھر دیکھیئے کہ کون اشتراکیت پسند ہے اور کون نہیں۔

رویوں کا ایک اور پیمانہ

رویوں کا پیمانہ ایک اور طرح کا بھی ہوتا ہے انہیں کسی خاص رویے کی ایک انتہا سے لے کر دوسری انتہا تک کے سب درجے موجود ہوتے ہیں اور آپ کو اس ایک درجے یا بیان کو انتخاب کرنے کے لئے کہا جاتا ہے جو آپ کے رویے کی سب سے بہتر ترجمانی کرتا ہو۔ ذیل میں ایک ایسا ہی پیمانہ پیش کیا گیا ہے جس میں مذہب اور حکومت کے باہمی رشتہ کے متعلق ترتیب وار بہت سے نظریے دیئے گئے ہیں۔ آپ صرف اس نظریہ کو نشان لگائیں جو آپ کے رویہ کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ جو بیان آپکے رویے کی سب سے بہتر ترجمانی کرتا ہو اس پر نمبر ۱ لکھیئے اور جس بیان کے ساتھ آپکو نسبتاً کم اتفاق ہو اس پر نمبر ۲ لکھیئے

۱۔ میری رائے میں قرآن اور سنت کے تمام اصول، قوانین مثلاً وراثت طلاق۔ چوروں کی سزا اور نماز روزہ کی پابندی حکومت پاکستان کو سختی کے ساتھ عمل درآمد کرانا چاہیئے۔

۲ - میری رائے میں قرآن مجید اور سنت کے تمام قوانین پر جنکا تعلق حکومت اور معاشرہ سے ہے (جیسے وراثت۔طلاق، چوروں کی سزا) حکومت پاکستان کو سختی سے عمل درآمد کرانا چاہیئے۔لیکن نماز، روزہ ذاتی افعال میں حکومت کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔

۳ - میری رائے میں حکومت پاکستان کو قرآن اور سنت کے اصولوں کا پختہ انتظام کرنا چاہیئے لیکن ان اصولوں کی تشریح اور تفسیر موجودہ حالات کی روشنی میں ہونی چاہیئے۔اور اس تشریح کا اختیار دینی مجلس علما کو ہونا چاہیئے۔

۴ - میری رائے میں قوانین مجلس قانون ساز بنائے مگر ان قوانین کو خلاف قرآن و سنت ٹھہرانے کا حق (ا) مجلس علما کو ہونا چاہیئے (ب) یہ فیصلہ اجماع امت کے ذریعے ہونا چاہیئے (تمام امت کی متفقہ کثرت رائے سے ہونا چاہیئے)

۵ - میری رائے میں قوانین قانون ساز اسمبلی کو بنانے چاہئیں مگر ملک کی عدالت عالیہ اس بات کی مجاز ہو کہ جو قانون قرآن اور سنت کے خلاف ہو اسکو منسوخ کر دے۔

۶ - میری رائے میں پاکستان کو ایک اسلامی مملکت قرار دیا جائے جسکے سارے اعلیٰ عہدہ دار مسلمان ہوں اور ہر عوامی تقریب پر تلاوت قرآن کی جائے مگر قانون سازی اور اسکی تشریح انگلستان کے معمولی آئینی طریقوں پر ہونی چاہیئے (یعنی کثرت رائے سے جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہوں۔

۷ - میری رائے میں چونکہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسلئے اس امر کی ضرورت نہیں کہ اسلام کے تحفظ کے لئے قانونی طور پر کوئی انتظام کیا جائے۔

۸ - میری رائے میں پاکستان کو خالص لادینی ملک ہونا چاہیئے۔

۹ - میری رائے میں مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اسلئے حکومت کو مذہب پر سائنس کو ترجیح دینا چاہیئے۔

۱۰ - میری رائے میں چونکہ مذہب قومیت کا دشمن ہے اسلئے مذہب کی پرزور مخالفت کرنی چاہیئے۔

یہاں ہمارے سامنے کچھ ایسے بیانات ہیں جو ترتیب وار دو مختلف نظریوں کے حامل ہیں ایک انتہائی نظریہ تو یہ ہے۔کہ حکومت اس حد تک اسلامی ہو کہ نماز، روزہ اور دیگر ارکان کی پابندی قانونی طور پر نافذ ہو۔

اس سے اگلے بیانات میں آہستہ آہستہ اس نظریے کو نرم کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ آخری بیان پہلے بیان سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں انتہائی بیانات ایک دوسرے کی ضد ہیں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ حکومت اس حد تک غیر اسلامی ہونی چاہیئے کہ مذہب کی پیروی اور عبادت وغیرہ کو سرے سے خلافِ قانون قرار دے دیا جائے کیا ہر شخص اس پیمانہ پر دیئے ہوئے بیانات کے پیش نظر دیہ کے اعتبار سے اپنا مقام متعین کر سکتا ہے۔ اور کیا اس طرح ہمیں اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظریے کس ایک شخص کا زیادہ رجحان کس نظریہ کی جانب ہے آپ اس طریقے کو اپنے آپ پر آزما کر دیکھیں کہ آپ کس زمرے میں آتے ہیں۔ یہ سوال کہ مذہب کا حکومت اور سیاسیات میں کہاں تک دخل ہونا چاہیئے ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اگر دو آدمی کسی بیان سے اتفاق کریں تو اسکا مطلب نہیں ہے کہ دونوں کی ایک ہی رائے ہے اور اس بات کا امکان بہت کم ہو کر دونوں اپنی اپنی رائے کی صحت میں ایک ہی دلیل پیش کریں تاہم اگر اس طریقے سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کے رجحانات میں ایک حد تک یکجہتی پائی جاتی ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ مندرجہ بالا پیمانہ کارآمد اور مفید ہے۔ یہ پیمانہ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے سماجی بہبود کے طالب علموں اور ایف سی کالج میں سیاسیات پڑھنے والے طلبا کو بھی دیا گیا تھا اور مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوئے تھے۔

نمبر شمار بیانات	پنجاب یونیورسٹی کے سماجی بہبود کے طلبا	ایف سی کالج کے سیاسیات کے طلبا
۱	۱	۲
۲	۴	۸
۳	۲	۹
۴	۰	۳
۵	۴	۵
۶	۱	۱

نمبر شمار بیانات	پنجاب یونیورسٹی کے سماجی بہبود کے طلبا	ایف سی کالج کے ریاضیات کے طلبا
۷	۲	۱
۸	۳	۱
۹	۱	۵
۱۰	۵	۵

تین طالب علموں نے ایک سے زیادہ بیانات پر نشان لگائے۔ ایک نے نمبر ۱ اور نمبر ۵ دونوں پر نشان لگائے دوسرے نے نمبر ۵ اور نمبر ۷ پر اور تیسرے نے نمبر ۱-۴-۵-۶ پر انکی اس بات نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا کہ ان کا صحیح نظریہ کیا ہے بالمشافہ گفتگو[1] سے اس پر مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

دونوں گروہوں کے نظریات میں خاصا اختلاف دکھائی دیتا ہے لیکن کسی طالب علم نے نمبر ۱ پر نشان نہیں لگایا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر گروہ کا جھکاؤ اعتدالی بیان کی طرف ہے۔ اعتدالی نشان یا نمبر وہ وسطی نمبر یا نشان ہوتا ہے جسکے دائیں بائیں تعداد میں برابر برابر نشان یا نمبر ہوں مثلاً مندرجہ ذیل پانچ نمبروں کا ۳۶-۲۵-۷-۵-۲ اعتدالی نمبر ۷ ہے حالانکہ انکا اوسط نمبر ۱۵ ہے۔ یہ پانچ نمبر ملاحظہ ہوں ادھا گروہ پہلے چند بیانات کے حق میں معلوم ہوتا ہے اور دوسرا گروہ آخری چند بیانوں سے اتفاق رکھتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے طلبا بیان نمبر ۵ کو اعتدالی بیان کا درجہ دے رہے ہیں اور ایف سی کالج کے طلبا کے نزدیک بیان نمبر ۴ کا یہ درجہ ہے۔ اگر اس اسکیل پر نشان لگانے والے طالب علموں کی تعداد زیادہ ہوتی تو انکا موازنہ زیادہ بامعنی ہو جاتا چنانچہ اس پیمانہ کا استعمال کرنے والوں کی جس قدر زیادہ تعداد ہوگی نتائج اسی قدر زیادہ پر معنی ہونگے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کوئی امتحان پورے طور پر کامل نہیں ہوتا لیکن ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم ایک امتحان کے ذریعہ کسی گروہ کے رویوں کو پہلے کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگتے ہیں کہ نہیں اور یہی بات کسی ٹسٹ کے مفید یا غیر مفید ہونے کی دلیل ہے۔ ہر امتحان میں اس بات کی گنجائش ہے کہ اسے بہتر بنایا جا سکے۔

موافقت اور مخالفت کا اسکیل

پیمانہ یا اسکیل بنانے کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو نہایت آسان ہے۔ اس سے ہم نہ صرف ایک خاص قسم کے

1. Personal interview 2 Median

رویہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں بلکہ نہایت آسانی سے یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ متعدد قسم کی آرا اور رویوں کے بارے میں دو گروہوں کے افراد اگر اختلاف رکھتے ہیں تو انکی نوعیت کیا ہے۔ اسے موافقت اور مخالفت کا اسکیل کہہ سکتے ہیں اسکی ایک چھوٹی سی مثال درج ذیل ہے۔

اسکیل یا پیمانے کو پُر کرنے کی ہدایات یہ ہیں کہ اگر آپ اسکیل میں تحریر شدہ بیان سے بالکل متفق ہیں تو اس کے سامنے (۲) لکھ دیں۔

اگر آپ مجموعی طور پر اسکے خلاف ہیں تو یہ نشان (۱-) بنا دیں۔

اگر آپ اس کے سخت خلاف ہیں تو (۲-) لکھیے۔

اگر آپ بیان کو سمجھ نہیں پاتے تو (؟) نشان لگائیں۔

پیمانہ مندرجہ ذیل ہے۔

(ا) موجودہ دور میں پاکستان کے لئے بحیثیت مجموعی جمہوریت کی بجائے آمریت زیادہ موزوں ہے۔

(ب) حکومت پاکستان کی موجودہ غیر ملکی پالیسی مجموعی طور پر کامیاب اور تسلی بخش ہے۔

(ج) والدین اپنے بیٹوں کے لئے بیویوں کا انتخاب خود بیٹوں کی نسبت زیادہ عقلمندی سے کر سکتے ہیں۔

(د) پاکستان میں شراب نوشی قانوناً بند کر دینی چاہیئے۔

(ہ) مجھے امید ہے کہ میری زندگی والدین کے مقابلے میں زیادہ خوشگوار گزرے گی۔ اس قسم کے بہت سے سوالات ایک ہی صفحے پر لکھ کر پوچھے جا سکتے ہیں، اگر ان کی نقلیں نہ بھی ہوں تو بھی دوستوں کا ایک گروہ یہ امتحان آسانی سے دے سکتا ہے۔ وہ اسطرح کہ ہر شخص کو کاغذ کے پرزے دے دیئے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ ان پرزوں پر بیانات کے نمبر ترتیب وار لکھ لیں پھر ایک آدمی ان بیانات کو آہستہ آہستہ دوبارہ پڑھے، دوسرے لوگ اپنے جوابات نمبروں کے سامنے لکھتے جائیں۔

ایک ہی مضمون پر اس قسم کے بہت سے سوالات پوچھے جا سکتے ہیں حال ہی میں پاکستان انسٹیٹیوٹ[1] آف ہیومن ریلیشنز کے زیر تحت اور پروفیسر غلام جیلانی[2] کی نگرانی میں ایک تحقیق کی گئی ہے جس میں ڈھاکہ

1. Pakistan Institute of Human Relations, 2. Prof Ghulam Jilani Head of the Dept. of Philosophy & Psychology, Dacca university

یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول پر اثرانداز ہونے والے عناصر کی چھان بین کی گئی ہے۔ اسے کتابی صورت[1] میں بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے بیانات ہیں جن پر مندرجہ بالا لسٹ کی طرح نشانات لگائے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر۔ (۱) مجموعی طور پر ہماری یونیورسٹی کے موجودہ نظام تعلیم کو اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے۔

(۲) یونیورسٹی کا تعلیمی ماحول بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔

(۳) مجموعی طور پر شاگرد و استاد کے باہمی رویے کو نا جرانہ کہا جاسکتا ہے یا ور ایسے دیگر بیانات ایک اسکیل میں دیئے جاسکتے ہیں، بیانات مجموعی تاثر اور رویہ کی بابت بھی ہو سکتے ہیں۔ یا چند مخصوص نکات کے متعلق بھی تاکہ مجموعی تاثرات کی وجوہ معلوم کی جاسکیں۔ جب بیانات کسی ایک موضوع کے متعلق ہوں تو انہیں ایک اسکیل میں اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ اطمینان کا اظہار کرنے والے بیانات کے ساتھ اتفاق اور غیر اطمینان بخش بیانات کے ساتھ جس قدر اختلاف زیادہ ہوگا اسی قدر حالات کے "تسلی بخش" ہونے کا جواز ملے گا۔ اس کے برعکس اگر ایسے بیانات کی بھرمار ہوگی جو ناخوشگواری کا اظہار کرتے ہوں تو تسلی بخش ہونے کا حال کی ہیئت منفی ہوکر رہ جائے گی۔

اسکیل کے بیانات

ہوسکتا ہے کہ اسکیل میں تمام بیانات ایک ہی قسم کے ہوں یعنی سب کے سب طمانیت کے مظہر ہوں اور اتفاق اور اختلاف کے لئے ترتیب وار مثبت اور منفی کے نشان لگائے جائیں۔ اس طرح نتائج کو گننے میں بہت آسانی ہوگی لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ بعض لوگ بیانات سے اختلاف کرنے کی نسبت ان سے اتفاق کرنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جواب دینے والا زیادہ مطمئن نظر آتا ہے مثال کے طور پر ایک تحقیق کے سلسلے میں طلبا سے مندرجہ ذیل بیانات پر رائے زنی کرنے کے لئے کہا گیا:—

(۱) پاکستان میں فی الحال آزادانہ انتخاب کی شادیوں کی بہ نسبت طے شدہ شادیوں کے نتائج خوشگوار

1. An enquiry into the Factors influencing the academic atmosphere of Dacca University.

ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔

(ب) اپنی پسند کی شادیوں کے خوشگوار ہونے کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ ایسی شادیوں میں میاں بیوی کی باہمی رضامندی شامل ہوتی ہے۔ یہ دو بیانات دراصل متضاد ہیں تاہم بعض طلبا نے دونوں بیانات سے اتفاق کا اظہار کیا۔ اسلئے بہتر یہی ہے کہ ایسے کسی ایک بیان کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ اس آسانی سے متفق الرائے ہونے سے جو مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں ان کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دو متضاد بیانوں میں سے انتخاب کرنے کی دعوت دی جائے۔ مثلاً ذیل کے اسکیل میں اسی قسم کے بیانات دیئے ہیں۔ جس بیان سے آپ کو اتفاق ہو اس پر ایک نشان لگائیں اور جس سے آپ کو "مکمل اتفاق" ہو اس پر دو نشان لگائیں۔

(ا) کالج میں تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لئے داخلے پر پابندیاں لگانی چاہئیں۔

(ب) حتی الامکان زیادہ سے زیادہ طلبا کو کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دینا چاہیئے۔

اسی اسکیل کی چند اور صورتیں

اس اسکیل کی کئی اور صورتیں ہوسکتی ہیں جو نہایت آسانی سے استعمال کی جاسکتی ہیں مثلاً خالی جگہوں کو دیئے ہوئے الفاظ سے پر کرنے کے لئے کہا جاسکتا ہے جیسے مندرجہ ذیل الفاظ کی مدد سے نیچے لکھے ہوئے بیانات کو مکمل کیجئے "کبھی نہیں" "کبھی کبھار/ بسا اوقات" "عام طور پر/ ہمیشہ۔ تقریباً ہمیشہ"

(ا) ایک اوسط درجے کا طالب علم موقعہ مل جانے کی صورت میں ________ نقل کرنے کی سعی کرتا ہے۔

(ب) اشتراکی حکومتیں ایسے کام کرتی (نہیں کرتی) ہیں جنکا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے ہے۔

یا پھر یہ بیانات دیکھئے جن الفاظ میں سے آپ کو کوئی لفظ چننا ہے وہ یہ ہیں۔ کل۔ بیشتر۔ کوئی۔ چند ایک۔

(ا) ________ سیاسی لیڈر بغیر کسی ذاتی غرض کے ملک کی بہتری کے لئے کام کر رہے ہیں۔ (کام نہیں کر رہے ہیں)

(ب) ——— لوگ جو باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں وہ روزمرہ کی زندگی میں دیانت دار اور مخلص ہوتے ہیں۔

رویوں کے لئے ایسے اسکیل وضع کرتے وقت صرف وہ الفاظ استعمال کرنا چاہیے جو خوش گوار یا ناخوش گوار احساسات پیدا کر سکیں۔ مندرجہ ذیل دو بیان ذرا دیکھیے۔

(ا) میں اس اصول کا قائل ہوں کہ عادی چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاہیں۔

(ا) میں اسلامی اصول کا قائل ہوں کہ عادی چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاہیں۔

(ب) ایک بین قومی حکومت ہونی چاہیئے جو دنیا میں ہر قوم کی راہنمائی کر سکے۔

(ب) تمام قوموں کی باہمی فلاح و بہبود کے لئے ایک طاقت ور مرکزی بین قومی حکومت ہونی چاہیئے۔

دونوں بیانوں کو غور سے پڑھیے ا اور ا کے درمیان یا ب اور ب کے درمیان معنی کا کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن انداز بیان کے مختلف ہونے کے سبب ا اور ب کی حمایت کرنے والے زیادہ ہوں گے۔ بیانات سادہ اور عام فہم ہونے چاہیں ان میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیں جو بذات خود خوش گوار یا خوشگوار احساسات پیدا کر دیں اور اصل موضوع سے توجہ ہٹ جائے۔

اسکیل جس پر صرف کالج کی لڑکیوں نے نشان لگائے

اسکیل کی ایک اور قسم ملاحظہ ہو جس پر ایک کالج کی ۵۷ لڑکیوں کو نشان لگانے کو کہا گیا۔ ہدایات یہ تھیں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چلے کہ آپ کی ایک گہری سہیلی نے مندرجہ ذیل کاموں میں سے کوئی ایک کام کیا ہے تو اس سے آپ کی دوستی پر کیا اثر پڑے گا اگر آپ کا خیال ہے کہ اس سے دوستی قائم رکھنا ناممکن ہو گا تو دیئے ہوئے بیان کے آگے ۳ کا ہندسہ لکھیے۔ اگر اس کے ساتھ دوستی قائم رکھنا ذرا مشکل ہو جائے تو بیان کے آگے ۲ کا ہندسہ لکھیے گر اس سے آپ کی دوستی کی راہ میں کچھ سخت قسم کی رکاوٹیں پیدا ہونے کا احتمال ہو تو ۱ کا ہندسہ لکھیے۔ اگر اس سے آپ کی دوستی اور محبت میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو تو بیان کے آگے صفر لکھ دیجئے۔

بیان نمبر ۱ : — آپ کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس نے ایک ایسی لڑکی کی گھڑی چرالی ہے

جس سے آپکی معمولی واقفیت ہے۔ اس بیان کے سامنے ۷ لڑکیوں نے ۳ کا ہندسہ لکھا (یعنی انکے نزدیک "چور" کے ساتھ دوستی نبھانا ناممکن ہے) ۲۵ لڑکیوں نے ۲ کا ہندسہ لکھا۔ (یعنی ایسی سہیلی کیساتھ دوستی جاری رکھنا مشکل ہے) ۱۴ لڑکیوں نے ا کا ہندسہ لکھا (یعنی انکے نزدیک سہیلی کا یہ فعل دوستی کی راہ میں کانٹے کھڑی کر دے گا۔) ۷ لڑکیوں نے اس کے سامنے صفر کا ہندسہ لکھا۔ گویا انکے نزدیک سہیلی کا یہ فعل انکی دوستی کو متاثر نہیں کرسکتا۔ اس پیکل کو یوں پیش کہہ سکتے ہیں۔

۰ — ۱ — ۲ — ۳

۷ — ۱۴ — ۲۵ — ۶

اب ذیل میں اسی پیکل کے چند اور بیانات درج کیے جاتے ہیں انکے سامنے نتائج بھی باقاعدہ حساب کے طریق پر لکھے گئے ہیں۔ یعنی ہر بیان کے آگے لڑکیوں کی تعداد لکھی گئی ہے اور ہدایات کے مطابق ۳، ۲، ۱ یا صفر کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ اسطرح ایک نظر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سہیلی کے کسی فعل نے ان کی دوستی پر کیا اثر ڈالا ہے۔

بیان نمبر ۱:- وہ گھر سے بھاگ گئی ہے اور خاندان کی مرضی کے خلاف ایک آدمی سے شادی کر لی ہے۔

۰ ۱ ۲ ۳

۲۵ ۱۵ ۸ ۵

(یعنی ۵ پانچ لڑکیوں کے نزدیک ایسی سہیلی سے دوستی نہیں نبھ سکتی اور ۲۵ پچیس کا خیال ہے کہ اس سے دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا وغیرہ)

بیان نمبر ۲:- آپ نے اپنے جو راز اسے بتلائے تھے وہ اس نے دوسروں پر ظاہر کر دیئے تاکہ لوگ آپ کا مذاق اڑائیں۔

نتائج ۰ ۱ ۲ ۳

۶ ۸ ۲۰ ۱۸

بیان نمبر ۳:- اس کا مذہب پر بالکل اعتقاد نہیں رہا ہے۔

نتائج۔

۰	۱	۲	۳
۲۸	۱۷	۷	۱

بیان نمبر ۴:۔ امتحان سے پہلے اس نے تم کو اپنے کلاس کے نوٹ دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔

نتائج۔

۰	۱	۲	۳
۲۱	۱۸	۱۲	۲

بیان نمبر ۵:۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوکروں سے ناراض ہو جاتی ہے اور انہیں بری طرح ڈانٹتی ہے۔

نتائج۔

۰	۱	۲	۳
۲۸	۲۰	۴۷	۱

بیان نمبر ۶:۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ اس کے بھائی سے راہ و رسم بڑھائیں

نتائج۔

۰	۱	۲	۳
۲۹	۱۲	۴	۸۵

بیان نمبر ۷:۔ وہ اشتراکی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔

نتائج۔

۰	۱	۲	۳
۳۴	۱۳	۶	۰

بیان نمبر ۸:۔ وہ تم سے چیزیں لے کر واپس نہیں کرتی۔

نتائج

۰	۱	۲	۳
۲۰	۳۱	۵	۶

اس قسم کے امتحان اگر مختلف گروہوں کو دیئے جائیں یا سال بر سال ایک ہی گروہ کو دیئے جائیں تو ان سے معاشرتی رویوں میں پیدا ہونے والی دلچسپ تبدیلیوں کا پتہ چل سکتا ہے اگر علم تاریخ کا انحصار اس قسم کی معلومات اور حقائق پر ہو تو مختلف زمانوں میں معاشرے کی نوعیت کا زیادہ اچھی طرح پتہ چل سکتا ہے تاریخی مطالعے کی بنا اگر محض سیاسی اور معاشرتی واقعات ہی ہوں تو جائزہ ہمہ گیر نہیں ہو سکتا۔

کیا یہ امتحان قابل اعتماد ہوتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس قسم کے ٹسٹ پر کہاں تک بھروسہ کر سکتے ہیں سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ لوگ اپنے رویوں کے متعلق سچی باتیں ہیں بتاتے ہیں یا نہیں معلوماتی ٹسٹ میں تو ہم صحیح جوابات حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ہر شخص کا مقام بھی متعین کر سکتے ہیں لیکن رویوں کے جائزے میں کیا لوگ اپنے رویے کا غلط اندازہ نہیں لگا سکتے یہ کیا سٹریوٹائپ[1] ٹسٹ میں ایک شخص باوجود امریکیوں کے مخالف ہونے کے اپنے آپ کو انکا حمایتی ظاہر نہیں کر سکتا یا کیا وہ اپنے آپ کو اسلامی حکومت کا سب سے بڑا حمایتی ظاہر نہیں کر سکتا؟ ایسا ہونا ممکن تو ہے لیکن عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہمارا رویہ ہمارا اپنا رویہ ہوتا ہے اور ہم اس کا اظہار اسلئے کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رویے کے صحیح اور اچھا ہونے کا یقین ہوتا ہے یہاں تک کہ ہم اکثر ان لوگوں پر جھنجھلا جاتے ہیں جو ہم سے مختلف رویے رکھتے ہیں۔ اور اسکا بھی امکان ہے کہ اس ٹسٹ میں بھی ہمیں اپنے جوابات سے مختلف جواب دینے والوں سے جھنجلاہٹ پیدا ہو ہماری خواہش عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ لوگ ہمارے ہی رویے کو درست تسلیم کریں۔ اسلئے امکان یہی ہے کہ ہم اپنا رویہ چھپانے کی کوشش نہیں کرینگے۔ ٹسٹ دینے والوں میں کچھ مسخرے تو شاید ہمیشہ نکل آئیں گے لیکن ان مسخروں کو ڈھونڈ نکالنا کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ انکے حل کیے ہوئے پرچوں کو آسانی بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے۔

---

[1] اس ٹسٹ کا ذکر اسی باب کے صفحہ نمبر ۲۱۰ پر آچکا ہے۔ یہ ایک ٹسٹ ہوتا ہے جس میں مختلف لوگوں کے رویوں کے اختلاف کی پیمائش کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بعض معاملات میں مثلاً ایسے معاملات جنہیں شرم وحیا کا پہلو ہو بے باک جوابات کا حاصل ہونا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اسلئے اگر ایک گروہ کے نصف افراد کو پرچوں پر اپنے نام لکھنے کی ہدایت کی جائے اور باقی سے کہا جائے کہ وہ اپنے نام نہ لکھیں پھر ان دونوں گروہوں کے جوابات کا علیحدہ علیحدہ موازنہ کیا جائے تو بے باکی اور صاف گوئی کے متعلق متعدد حقائق معلوم ہو سکتے ہیں۔

جب کسی گروہ کے ہر فرد کو اسی گروہ کے اوسط درجہ کے افراد سے مقابلہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو کئی ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جن کی مزید تفتیش و تشریح کی ضرورت پڑتی ہے مثال کے طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں جو تحقیقات کی گئی تھیں اور جنکا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انمیں جب ایک سو بیس طالب علموں سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ سیاسی کاموں میں یونیورسٹی کے دوسرے طلبا کی نسبت بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں یا "تقریباً اتنا ہی وقت" یا ان سے کم وقت" تو انمیں سے ۲ نے کہا کہ وہ دوسروں کی نسبت "کہیں زیادہ وقت" صرف کرتے ہیں ۱۱ نے کہا کہ وہ دوسروں کی نسبت "کچھ زیادہ وقت" صرف کرتے ہیں ۳۲ نے کہا کہ وہ "تقریباً دوسروں کے برابر ہی" وقت صرف کرتے ہیں۔ ۳۱ نے کہا کہ وہ دوسروں کی نسبت "کچھ کم" وقت صرف کرتے ہیں۔ ۱۵ نے کہا کہ وہ دوسروں کی نسبت "بہت کم" وقت صرف کرتے ہیں۔ ۲ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر یہ طلبا مجموعی طور پر طالب علم طبقے کے نمائندہ تھے تو زیادہ وقت صرف کرنے والے اور کم وقت صرف کرنے والے طلبا کی تعداد تقریباً برابر ہونی چاہیئے تھی لیکن یہاں پر ۱۳ لڑکوں نے بتایا کہ وہ "زیادہ وقت" صرف کرتے ہیں اور ۸۲ کہتے ہیں کہ وہ "کم وقت" صرف کرتے ہیں۔ ایف سی کالج کے طلبا کے ایک گروہ نے بھی تقریباً ایسا ہی میلان ظاہر کیا۔ اگرچہ انکے یہاں یہ فرق بہت کم تھا انمیں سے ۲۲ نے کہا کہ وہ زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور صرف ۳۲ نے کہا کہ وہ کم وقت صرف کرتے ہیں۔ کیا ڈھاکہ کے طلبا یہ بتانے سے کتراتے تھے کہ وہ سیاسی سرگرمیوں پر کتنا وقت صرف کرتے ہیں۔ یا کیا فارم انہیں طالبعلموں نے پر کئے تھے جو سیاسیات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ یا کیا کسی وجہ سے انہوں نے وقت کے صرف کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا اور اسے بڑھا کر بیان کیا تھا۔

کیونکہ ایسا کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی۔ وہ کیا تھی؟ اس قسم کے نتائج بجائے سوال کا جواب مہیا کرنے کے ایک نیا سوال پیدا کر دیتے ہیں نئے سوالات کسی تحقیق کا بڑا اہم حصہ ہوتے ہیں اور انکی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

روبوں کی پیمائش کے متعلق ایک اور غور طلب اعتراض یہ ہے کہ کیا غور و فکر کے بعد جو نشان لگائے جاتے ہیں انکی بھی اتنی اہمیت ہوتی ہے جتنی کہ یونہی بے پروائی بے دلی کے ساتھ لگائے ہوئے نشانوں کی؟ اور خاص طور پر جب کہ نشان لگانے والا شخص بالکل غیر متعلق ہو۔ سیاہ ہو یا سفید اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ان باتوں کا عموماً نتائج کی مجموعی حیثیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا کیونکہ اگر بے پروائی اور بے دلی سے انہیں بیانوں پر نشان لگے ہوں جن پر دلچسپی رکھنے اور غور کرنے والوں نے نشان لگائیں ہیں تو پورے گروہ کی اوسط تقریباً وہی رہے گی البتہ ایک بات ذہن میں آسکتی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کم دلچسپی رکھنے والوں کے نظریے زیادہ دلچسپی رکھنے والوں کے نظریوں سے مختلف ہوں۔

اسکیل میں ضمنی سوال چنانچہ اس الجھن کو دور کرنے کے لئے مذکورہ بالا مذہبی حکومت والی اسکیل کے ساتھ ایک ضمنی سوال بھی دیا گیا تھا جس کی شکل یہ ہے کہ اپنے موافق حال بیان پر نشان لگاؤ۔

(ا) مسئلے کے ساتھ گہری دلچسپی ہے اور اس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ۵

(ب) " " کافی دلچسپی " " اس پر اچھی سوچ بچار کیا ہے۔ ۱۷

(ج) " " کچھ دلچسپی ہے " " پر کچھ سوچ بچار کیا ہے۔ ۱۲

(د) " " بہت کم دلچسپی " " بہت کم سوچ بچار کیا ہے۔ ۲

(ہ) " " کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور اس پر کبھی سوچ بچار نہیں کیا۔ ۲

ہر بیان کے سامنے اس پر نشان لگانے والے طلبا کی تعداد درج ہے۔ تجزیے کی آسانی کے لئے یہاں سیاسیات اور معاشرتی امور کے طلبا کے دونوں گروہوں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے در حقیقت مجموعی

طور پر سیاسیات کے طلبا نے دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ دلچسپی اور مطالعہ کا اظہار کیا چنانچہ اب ہم ان ۲۲ کا جنہوں نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ان ۱۶ سے موازنہ کر سکتے ہیں جنہوں نے کچھ دلچسپی بہت کم دلچسپی اور بے تعلقی کا اظہار کیا ہے اس طرح ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا وسطی نقطہ جنہوں نے مسئلے کے ساتھ گہری دلچسپی اور تعلق کا اظہار کیا بیانات نمبر ۳ اور چار* کے مابین ہے اور ان لوگوں کا جنہوں نے کم دلچسپی ظاہر کی ہے بیان نمبر ۵ میں ہے۔ جب نشان لگانے والے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو تو اس قسم کے اختلاف بہت بامعنی ہوتے ہیں۔

معلوماتی امتحان

لیکن کیا لوگ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ قطعاً دلچسپی نہ ہونے کی صورت میں بھی یہ ظاہر کریں کہ انہیں بہت دلچسپی ہے؟ ایسے لوگوں کو جنہوں نے زیر تحقیق معاملہ کا گہرا مطالعہ کیا ہو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کرنے کا ایک بہتر اور یقینی طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ مضمون سے ان کی واقفیت کا جائزہ لیا جائے۔ اور اسکے نتائج کا انکے بیان کردہ رویوں سے مقابلہ کیا جائے مثلاً اگر ہم یہ دیکھنے کے لئے کہ لوگ پاکستان کے نئے دستور کے حق میں ہیں یا مخالف ہیں کوئی پیمانہ استعمال کر رہے ہوں تو ہم اس کے ساتھ چند سوالوں کی ایک فہرست بھی دے سکتے ہیں جس سے یہ پتہ چل سکے کہ نئے دستور کے متعلق وہ کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں۔ فن اعداد و شمار کے مخصوص طریقوں سے تلازمات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ کام ایک آسان طریقہ سے بھی کر سکتے ہیں۔ فرض کریں کہ دس سوالات پر مشتمل معلوماتی ٹسٹ تیس آدمی استعمال کر رہے ہیں انکے نتائج مندرجہ ذیل طریق پر لکھیں جائیں تو ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

دستور کے متعلق رویہ	نشان لگانے والوں کی تعداد	معلوماتی ٹسٹ میں حاصل کردہ نمبر	اوسط
(۱) عام طور پر متفق	۱۲	۶،۶،۱،۱۰،۷،۹،۹،۶،۸،۵،۲،۹،۱۰،۵،۶،۴	۶۶۴
(۲) غیر متفق	۱۰	۴،۲،۲،۶،۴،۳،۲،۸،۴،۱	۳۶۵
(۳) عام طور پر متفق	۸	۷،۶،۶،۲،۵،۴،۹،۴	۵۶۴

Correlations !

* دیکھیے صفحہ نمبر ۱۱ اور ۱۲

نتائج صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ اوسط "درہ" لوگ جن کی دستور یہ کے متعلق سب سے زیادہ معلومات ہیں وہ اسکے حق میں ہیں۔ اور وہ لوگ جو تذبذب میں ہیں انکی معلومات سب سے کم ہیں اسی طرح ہم غیر ملکی حکومتوں کی جانب بھی لوگوں کے رویوں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور ان ملکوں یا بین قومی سیاسیات کے متعلق انکی معلومات کی پیمائش بھی کر سکتے ہیں، جس آدمی کی معلومات کم ہوں اور رویہ مستحکم ہو متعصب کہا جائے گا۔ اور جس آدمی کی معلومات اچھی ہوں اور رویہ بھی مستحکم اور مضبوط ہو اسے ہم پختہ یقین والا انسان کہیں گے۔ اور جسکی معلومات بھی کم ہوں اور رویہ بھی غیر یقینی وہ شاید ان معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا جس آدمی کی معلومات "کافی ہوں" اور رویہ غیر متعین اسے "غیر جانب دار" کہا جا سکتا ہے۔ لوگوں کو اس طرح تقسیم کرنا اور انہیں علیحدہ علیحدہ نام دینا شاید زیادہ درست نہ ہو لیکن اس سے انکے احساسات اور خیالات کے فرق کو جاننے میں آسانی رہتی ہے ہمارا مقصد صرف مختلف گروہوں کے باہمی فرق کو دیکھنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ وہ گروہ کس کس قسم کے افراد پر مشتمل ہیں۔

جب ہمارے لئے کسی ٹسٹ سے طریق امتحان نتائج کا اخذ کرنا مشکل ہو جائے تو ہم دو مختلف گروہوں کو وہی ٹسٹ دیتے ہیں یا پھر اسی گروہ کو وہی ٹسٹ کچھ عرصے کے بعد دے کر سابقہ نتائج کا مقابلہ کرتے ہیں، یا ہم ان سے ضمنی سوالات پوچھنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ٹسٹ مختصر ہو تو اسکا حل کرنا اور نتائج کا جمع کرنا آسان ہوتا ہے مفصل اور لمبے ٹسٹ سے ہمیں مواد تو بہت مل سکتا ہے لیکن اکثر لوگوں کے لئے ان پر نشانات لگانا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ٹسٹ کی تشکیل کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ جو لوگ اس کو حل کریں وہ انکے مطابق ہو ہر قسم کے ٹسٹ کے مخصوص فوائد ہیں ٹسٹ تم خود بھی بنا سکتے ہو ان پر اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے نشانات لگواؤ اور نتائج کا تجزیہ کرو۔ یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہونے کے علاوہ معاشرتی نفسیات کے متعلق تحقیقات کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ بھی ہے لیکن ابھی بہت سی دقتوں کا سامنا ہونے کا بھی امکان ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ تم یہ محسوس کرو کہ اس کام میں تم کو اپنے اندازہ سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی ہے اکثر لوگ ٹسٹ تیار کرتے ہیں ان پر جوابات بھی فراہم کر لیتے ہیں لیکن انہیں انکا اچھی طرح تجزیہ کرنے

کا وقت نہیں ملتا ہم چند ترکیبیں بتاتے ہیں جن کی مدد سے ٹسٹ بنانے اور نتائج فراہم کرنے میں آسانی ہو گی۔

ٹسٹ تیار کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کی ترکیبیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف ایسے سوالات نہ پوچھو جو ذاتی طور پر تم کو دلچسپ معلوم ہوں۔ ایسے سوالوں کے متعلق غور کرو جو لوگوں کے زاویہ ہائے نگاہ کے فرق کو واضح کر سکیں۔ ایسے سوال بناؤ جن کا کچھ لوگ ایک طرح سے جواب دیں اور کچھ اور لوگ کسی دوسری طرح سے یعنی ایسے سوال جنکے جوابات جدا جدا ہو سکتے ہوں۔ ان سوالات کو باقاعدہ ٹسٹ کی شکل دینے سے پہلے انہیں چند لوگوں پر آزماؤ ان سے صرف یہ نہ پوچھو کہ سوال ٹھیک ہیں یا نہیں بلکہ ان پر باقاعدہ ان سے نشانات لگواؤ اور پھر دیکھو کہ انکے دیئے ہوئے جوابات انکے رویوں کی کس حد تک نشان دہی کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھو کہ غلط فہمیاں کہاں کہاں پیدا ہوتی ہیں ان سے نئی تجاویز پیش کرنے کے لئے بھی کہو اور اس سلسلے میں انکی حوصلہ افزائی بھی کرو۔ تم نے غور کیا ہوگا کہ اسنادی کاوشوں کے اسکیل میں ضمنی بیان کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جواب دینے والے کو یہ اطمینان رہے کہ اسکے لئے یہ بندش نہیں ہے کہ وہ مجوزہ بیانات پر ہی نشان لگائے وہ اپنی طرف سے بھی تجویز پیش کر سکتا ہے اگر تم ٹسٹ تیار کر کے نشانات لگانے کے لئے لوگوں کو دے دو تو اکثر اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ بہت سے لوگ تم کو وہ ٹسٹ واپس ہی نہ کریں یا ٹسٹ کی خانہ پری باقاعدگی کے ساتھ نہ کریں اور یونہی واپس کر دیں۔ اسلئے اگر ایک ہی وقت پر اور ایک ہی جگہ پر پورے گروہ سے نشانات لگوا لیئے جائیں تو بہتر ہے۔ گروہ کے افراد جب ایک دوسرے کو عزم و سنجیدگی سے سوالات کا جواب دیتے دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب پورے اطمینان سے نشان لگائیں۔ جہاں تک ہو سکے سوالات کو دلچسپ بناؤ۔

جوابات کے تجزیے کو آسان بنانے کے لئے یہ یاد رکھو کہ پرچوں کی طباعت ایسی ہونی چاہیئے کہ جوابات اور نشان دہی کے لئے ایک ہی جانب کے حاشیہ میں جگہ چھوڑی جائے

تاکہ اگر سب پرچوں کو نیچے اوپر اس طرح رکھا جائے کہ سب کے ایک طرف کے حاشیے نظر آئیں (جیسے مندرجہ ذیل خاکے میں بتایا گیا ہے) تو بیک وقت تمام پرچوں کے جوابات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح نتائج جمع کرنے میں آسانی بھی رہے گی اور وقت کی بھی کافی بچت ہوگی۔ جوابات کی میزان لکھنے کے لئے علیحدہ کاغذ رکھ لیں جو تمام پرچوں کے نیچے ہو اور جوابات کی طرف باہر نکلا ہوا ہو۔ تفصیل کے لئے خاکہ درج ذیل ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات پر اس طرح نشان لگائیے۔

۲۔ اگر یہ آپ کے لئے سخت پریشانی کا باعث ہے۔
۱۔ " " " کچھ " " " " ۔
۰۔ " " " " پریشانی کا باعث نہیں ہے۔

جوابات کے میزان درج کرنے کا پرچہ۔

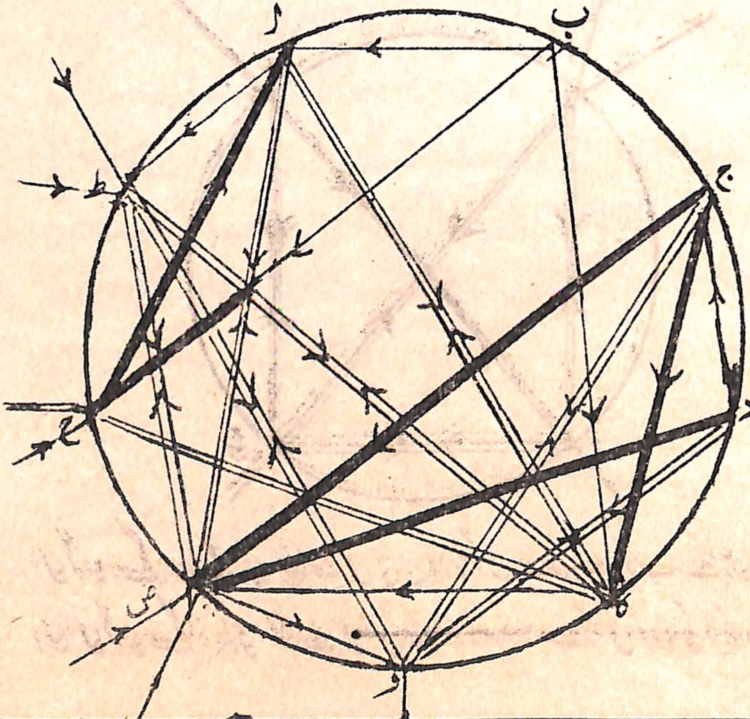
سوال	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10	۰	۱	۲
ا۔ مالی حالات	1	0	0	1	2	2	1	0	0	2	4	3	3
ب۔ آئندہ ملازمت	1	2	0	0	0	2	2	0	1	0	5	2	3
ج۔ صحت	2	2	1	1	1	0	2	1	2	0	2	4	4
د۔ دوستوں کی قلت	0	0	1	0	1	0	0	2	0	0	7	2	1
ح۔ گھریلو مشکلات	1	0	0	2	0	0	0	2	1	2	5	2	3
و۔ آپ کے علمی مشاغل	2	1	2	2	1	2	0	0	2	1	2	3	5
ض۔													

مندرجہ بالا نقشے ہیں دس حل شدہ پرچے جنکے اوپر بائیں کنارے پر انکا نمبر لکھا ہوا ہے اس ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں کہ سب کے جوابات جو ایک طرف کے حاشیے ہیں درج ہیں بیک وقت نظر آرہے ہیں۔ نیچے میزان لکھنے کے لئے کاغذ رکھا گیا ہے گویا کل ۱۱ کاغذ ہو گئے۔ دس تو سکیل کے سوالوں والے اور ایک جو میزان کے لئے رکھا ہوا ہے سب سے اوپر والا پرچہ پوری سکیل تفصیل پیش کر رہا ہے اسطرح ہم تمام پرچے خواہ انکی تعداد پچاس سے بھی زائد ہو ایک ہی وقت میں دیکھ سکتے ہیں۔ سکیل میں بیسوں سوال ہو سکتے ہیں یہاں صرف پہلے پانچ سوالوں کے جواب دکھائے گئے ہیں۔ اگر تم کسی گروہ کو مزید چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹنا چاہو اور انکے جوابوں کا موازنہ کرنا چاہو تو یہ کام بھی پرچوں کو ٹھیک سے ترتیب دے کر نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر تم ان کا آپس میں مقابلہ کرنا چاہو جو اپنی صحت کے متعلق بہت فکرمند رہتے ہیں اور جو انکی کوئی فکر نہیں کرتے یا تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ صحت کے متعلق ایک تشویش کا کسی دوسری تشویش سے کیا تعلق ہے وغیرہ تو اس طریقہ کی مدد سے بہت دلچسپ باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

ایک اہم سوال مگر یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان سوالوں کا معاشرتی نفسیات سے کیا تعلق ہے۔ کیا ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے ماحول سے مطابقت کیوں کر پیدا کرتا ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ ان سوالوں سے افراد کے کرداری وصف پر روشنی پڑتی ہے انکی مدد سے ہم آسانی سے یہ جان سکتے ہیں کہ وہ اپنے گردوپیش سے کیونکر ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں مگر مختلف اشخاص کا مقابلہ کر کے ہم معاشرتی تعلقات کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں مثلاً با ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ تشویش کے معاشرتی اسباب کیا ہیں مرد عورتوں سے کس طرح مختلف ہیں نوجوان لوگ بوڑھوں سے کس لحاظ سے مختلف ہیں یا طالب علم تاجروں سے کیوں مختلف ہیں۔ اسی طرح ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آج اور پانچ سال پہلے کے طالب علموں میں کیا فرق ہے یا پاکستانی طلبا اور انگریز طلبا کے درمیان کیا فرق ہے۔ اگر اس قسم کے متعدد حقائق ہم فراہم کر لیں تو معاشرتی نفسیات کے ماہروں کے لئے بعض مسائل کا سمجھنا آسان تر ہو جاتا ہے۔

معاشرتی گروہ بندی کا طریقہ

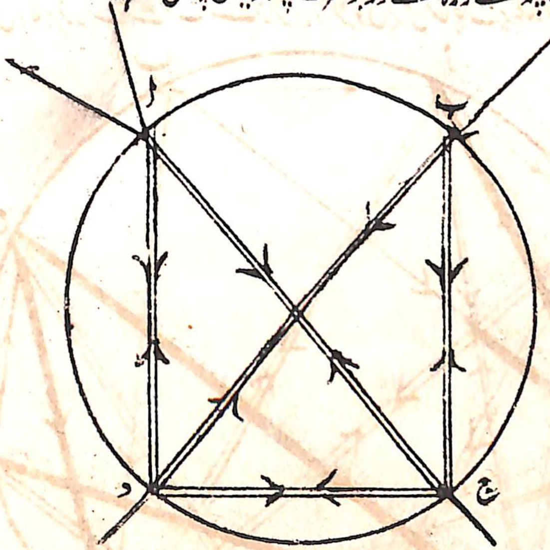
بہتر ہوگا کہ رویوں کی پیمائش کے مختلف طریقوں کے بعد مختصراً ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ معاشرتی گروہ بندی کا کیا طریقہ ہے۔ اس طریقے کو مقیاس المعاشرت سوشیومیٹری کہا جاتا ہے۔ اس طریقے میں اگرچہ بہت ہی عامیانہ قسم کے حقائق استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم اسکی بدولت کسی گروہ کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا اچھا خاصا پتہ چل سکتا ہے۔ اس طریقے کو مثال سے سمجھو۔ کالج کی لڑکیوں کی ایک جماعت (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) کے ہر رکن سے پوچھا گیا کہ اگر انہیں لاہور سے کراچی بذریعہ ریل جانا ہو تو اپنے ساتھ لیجانے کے لئے وہ کن تین لڑکیوں کو منتخب کرے گی۔ ان لڑکیوں کے جوابات کے تجزیے سے جو مختلف گروہ بنے انکو ایک چارٹ پر لکھا گیا انمیں چھ گروہ تو ایسے تھے جنہیں آسانی سے تمیز کیا جا سکتی تھی اور ۲ دو گروہ ایسے تھے جنہیں امتیاز کرنا ذرا مشکل تھا۔ یہ آٹھ گروہ ۵۷ ستاون میں سے ۴۵ پنتالیس لڑکیوں پر مشتمل تھے۔ باقی ۱۲ بارہ لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ گروہوں میں سے ہر ایک میں شامل تھیں وہ چارٹ پر ان حلقوں سے باہر نظر آتی تھیں جو ان گروہوں کو ظاہر کر رہے تھے سب سے بڑا گروہ ۹ نو لڑکیوں پر مشتمل تھا چارٹ پر بمندرجہ ذیل طریقے سے دکھایا گیا ہے



علامات :- باہمی انتخاب ⟵⟶ (ہ نے ط کو منتخب کیا اور ط نے ہ کو

یک طرفہ انتخاب ⟶ ا (ب نے ا کو منتخب کیا) -

اگر چارٹ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس گروہ کے اندر سات باہمی انتخابات ہیں۔ یعنی سات لڑکیوں نے ایک دوسرے کو منتخب کیا اور صرف ایک لڑکی ایسی ہے جس نے اپنے گروہ سے باہر کی ایک لڑکی کو منتخب کیا گروہ کے اندر تیرہ ۱۳ ایک طرفہ انتخابات ہیں۔ گروہ کی چار لڑکیوں کو گروہ سے باہر کی لڑکیوں نے منتخب کیا ہے ان میں د کو (یعنی ض اور ط) کو بالترتیب سات اور چھ لڑکیوں نے چنا ہے یہ دونوں سب سے زیادہ ہر دل عزیز ہیں اور انکی آپس میں رقابت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ایک دوسرے کو منتخب کیا ہے۔ ز اور ط کو ان لڑکیوں نے چنا ہے جن کا انہوں نے خود انتخاب کیا ہے سوائے ایک لڑکی کے باقی سب کا گروہ کے اندر کم از کم ایک باہمی انتخاب ضرور ہے۔ اس گروہ میں صرف ایک لڑکی ایسی ہے (ب) جس کو کسی لڑکی نے منتخب نہیں کیا اس گروہ کا مقابلہ ایک چھوٹے گروہ سے کرو جو صرف چار لڑکیوں پر مشتمل ہے۔



اس گروہ کے اندر پانچ باہمی انتخابات ہیں یعنی ان چار لڑکیوں نے جو بارہ انتخاب کئے ہیں انہیں سے دس اس گروہ کے اندر باہمی انتخابات ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس گروہ کی لڑکیوں میں گہری

مطابقت بہت گہری ہے۔ یعنی انکے باہمی مراسم گہرے اور خوش گوار ہیں۔ صرف ایک لڑکی کا باہمی
انتخاب گروہ سے باہر ہے۔ اور چار لڑکیوں کا انتخاب کم از کم ایک ایسی لڑکی نے کیا ہے جو گروہ سے باہر
لڑکیوں۔ کے ان آٹھ گروہوں میں سے کوئی ایک بھی دوسروں سے کلی طور پر جدا نہیں
ہے۔ اور وہ بارہ لڑکیاں جو کسی مخصوص گروہ کے متعلق نہیں ہیں مختلف گروہوں کو آپس میں مربوط
کرنے میں بہت مدد کرتی ہیں۔ چار لڑکیوں کا انتخاب جماعت کی سات سات لڑکیوں نے کیا ہے۔
کسی لڑکی کا انتخاب اس سے زیادہ لڑکیوں نے نہیں کیا کوئی ایک لڑکی یا لڑکیوں کا کوئی ایک گروہ
پوری جماعت پر حاوی نہیں ہے۔ ایک گروہ کے علاوہ باقی سب گروہوں میں ہوسٹل میں
رہنے والی اور گھروں میں رہنے والی سبھی طرح کی لڑکیاں موجود ہیں ہوسٹل یا گھر میں رہنے سے گروہ
بندی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے یہ پتہ لگانے کے لئے کہ گروہوں کے بننے میں کیا کیا اثرات
کام کرتے ہیں کافی مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے اگر اس تجربے کو کچھ عرصہ کے بعد دہرایا جائے
تو اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ان گروہوں کی تعمیر کس طرح ہوتی ہے اور انہیں تبدیلیاں کیسے آتی ہیں
کیا ایک گروہ کی سبھی لڑکیاں یک رائے ہوتی ہیں؟ نہیں زیر نظر مطالعہ نے یہی بتایا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا
بعض اوقات معاشرتی مقیاس کے تجربات میں لوگوں سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کے لوگوں
کے علاوہ ان کے نام بھی تحریر کریں جنہیں وہ بہت ناپسند کرتے ہوں۔ باہمی تعلقات کو سمجھنا اس
طرح اور بھی آسان ہو جاتا ہے لیکن اس تجربہ کو استعمال کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی
ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اپنی ہر دل عزیزی کی فکر کرنے لگیں اور یہ سوچنا شروع کر دیں کہ ان
کے دوستوں نے انہیں منتخب کیا یا نہیں۔ مقیاس المعاشرت ایک سنجیدہ ماہر نفسیات کیلئے
بڑا مفید آلہ ہے لیکن اس آلہ کو اگر کھلونا سمجھ لیا جائے تو یہ خطرناک حربہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کی تدوین اول تا آخر اس ترتیب سے کی گئی ہے کہ قاری معاشرتی نفسیات کی کتابوں
کے مطالعہ پر ہی اکتفا نہ کریں گے بلکہ معاشرتی نفسیات کے ماہر بننے کی بھی کوشش کریں گے ہم
میں سے ہر شخص رسم اور رواج کا جائزہ لے سکتا ہے طبقہ یا جماعت بندی کے طریقوں پر غور و فکر

کر سکتا ہے عورتوں اور مردوں کے باہمی تعلقات اور مراسم کے متعلق جہاں بین کر سکتا ہے اور ان عناصر کا مشاہدہ کر سکتا ہے جنکی بدولت شخصیت مختلف طریقوں سے نشو و نما پاتی ہے چنانچہ اس باب میں ہم نے یہی دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ کسطرح ایک ذہین طالب علم مادہ اور سائنٹفک طریقوں سے نہایت دلچسپ اور قیمتی مواد جمع کر سکتا ہے اور اسکی ناپ پرکھ بھی کر سکتا ہے۔

نواں باب

معاشرتی ترقی کے نفسیاتی مسائل

معاشرتی ترقی کے معنی

معاشرتی ترقی کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد صرف پیداوار کا بڑھنا، سامان عیش و عشرت کا زیادہ ہونا، بڑی بڑی مشینوں کا بننا یا تباہ کن بموں کا ایجاد ہونا ہے؟ کیا اس کا مطلب پرامن اور اطمینان بخش زندگی نہیں؟ کیا اجتماعی و انفرادی تعلقات میں خوشگواری اور ہم آہنگی معاشرتی ترقی نہیں؟ کیا ایک دوسرے کی بھلائی یا شخصیت کی بہتر و اعلیٰ نشو و نما معاشرتی ترقی کا دوسرا نام نہیں؟ اگر مادی ترقی کا مطلب جرائم اور بدکاری میں اضافہ افراد کی باہمی کشمکش اور خونریز جنگیں ہیں یا نفسیاتی الجھنوں کا ایک پھیلتا ہوا سیلاب ہے تو یہ ترقی نہیں سراسر تنزل ہے۔ لیکن ہماری مشکل یہ نہیں کہ مادی یا روحانی ترقی میں سے کس کو منتخب کیا جائے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے۔ تمدن کی ترقی نہ تو مسلسل ہی ہوتی ہے اور نہ ہموار ہی۔ اکثر ایسے دور بھی گزرے ہیں جنمیں جلد جلد تبدیلی آتی رہی اور ایسے بھی جنمیں نسبتاً تبدیلی کی رفتار سست رہی۔ ایسے وقت بھی گزرے ہیں جب آرٹ نے بے حد ترقی کی حکومتی اداروں میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور حیرت انگیز مذہبی بصیرت کے مظاہرے ہوئے۔ کبھی کسی تمدن کے ایک شعبہ نے ترقی کی اور کبھی کسی دوسرے نے تاہم ان سب تبدیلیوں کی کڑیاں ایک دوسرے

سے مربوط ہیں علیحدہ اور الگ نہیں۔ اور انسانی تاریخ کے ہزارہا سال میں انسان کے رہن سہن میں تین نمایاں اور واضح تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اول جب انسان حیوانوں کی سطح سے بلند ہو رہا تھا۔ جب اس نے ہتھیاروں کا استعمال سیکھا آگ سے واقف ہوا اور زبان نے بننا اور بڑھنا شروع کیا۔ دوسری تبدیلی چھ سات ہزار سال قبل کی بات ہے جب انسان نے کھیتی باڑی اور گلہ بانی شروع کی۔ اور خوراک تلاش کرنے کی بجائے زمین سے اناج اگانا سیکھا تیسری تبدیلی آج سے تقریباً دو سو سال پہلے رونما ہوئی جب انسان نے حرارت سے قوت حاصل کرنا سیکھا سائنسی طریقوں سے چیزوں کا جائزہ شروع کیا اور ایجادیں کیں ہم آجکل اسی دور سے گزر رہے ہیں جسے مشینی ترقی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ان دنوں ہر نئی تبدیلی کسی اور بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے۔ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ یہی ہے کہ ہم معاشرتی سائنس اور روحانی اقدار کی مدد سے اگر بنی نوع انسان کو خود اپنے ہاتھوں تباہی سے بچانا چاہیں تو کیا اقدام کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مادی ترقی و آسائش انسان کے لئے خوش آیند ہو نہ کہ اس کی ہلاکت کا سبب بنے۔

مادی ترقی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ بغیر اسکے نہ آجکل کوئی قوم طاقتور رہ سکتی ہے اور نہ اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے اسلئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ مادی ترقی کے اس دور میں جب کہ انسان چاند تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے روحانی قدروں کو کیونکر اپنایا جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک بوڑھا پروفیسر ایک ان پڑھ ملاح کی کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں پروفیسر نے ملاح سے پوچھا کہ بھائی کیا تم نے فلسفہ پڑھا ہے ملاح نے کہا نہیں کبھی نہیں پڑھا یہ سن کر پروفیسر نے کہا افسوس تم نے اپنی چوتھائی زندگی بے کار گنوائی۔ اسکے بعد پروفیسر نے پوچھا تو کیا تم نے کبھی تاریخ بھی پڑھی ہے۔ غریب ملاح نے کہا نہیں جناب میں کیا جانوں تاریخ کیا ہوتی ہے۔ افسوس پروفیسر نے کہا تم نے گویا اپنی آدھی زندگی ضائع کر دی۔ سائنس کے متعلق تو نہیں کچھ معلوم ہوگا۔ پروفیسر نے پھر سوال کیا جی نہیں صاحب ملاح نے جواب دیا۔ پروفیسر نے افسردگی سے اپنا سر ہلایا۔ وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ طوفان کے ایک تھپیڑے سے کشتی الٹ گئی۔ تمہیں تیرنا آتا ہے ملاح نے چلا کر پوچھا نہیں۔ پروفیسر

نے چیخ کر جواب دیا" تو پھر تم نے اپنی پوری زندگی تباہ کر دی ملاح نے اور زور سے چلا کر کہا غور کیا
آپ نے یہ حکایت اس حقیقت کی طرف نہایت واضح اشارہ ہے کہ زندگی کی اعلیٰ قدریں کس حد
تک مادی وسائل اور ترقی پر منحصر ہیں۔

مادی ترقی کا مطلب یہ نہیں کہ امراء کے لئے سامان عیش کی فراوانی ہو، اونچے اونچے محل اور
کوٹھیاں ہوں اور آئے دن نئی موٹر کاریں ملتی رہیں یا عمدہ قیمتی فرنیچر مکان کی زینت دوبالا کر رہا ہو۔ ہم بڑی
بڑی دعوتیں اڑائیں۔ اور ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر بیش بہا تحائف نذر کریں۔ اس قسم کی ترقی نہ تو
قوموں کی طاقت میں اضافہ کرتی ہے اور نہ افراد کی مسرت اور خوشحالی میں۔ معاشرتی ترقی کے تو یہ
معنی ہیں کہ ماضی کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اچھی خوراک میسر ہو۔ انکے علاج کے لئے
اور انہیں بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے طبی سہولتیں اور ہسپتال ہوں انکے ذہنوں کو جلا کرنے
کے لئے کتابیں اور رسالے ہوں تاکہ انہیں باعزت زندگی گزارنے میں مدد مل سکے۔ ایسی مشینیں
ہوں جو انہیں تھکا دینے والے اور غلیظ کاموں سے نجات دلا سکیں۔ مختصر یہ کہ عوام کے لئے بہتر
زندگی کا بندوبست ہی معاشرتی ترقی ہے۔ جب تعلیم یافتہ لوگ "سادہ زندگی" اختیار کرنا چاہتے ہیں تو
اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان مادی آسائشوں کو ترک کر کے قدیم طرز زندگی اپنانا چاہتے ہیں۔ مادی
ترقی کے تو معنی یہ ہیں کہ لوگ زیادہ مضبوط اور طاقتور بنیں۔ آزاد اور خود مختار ہوں، ایسی چیزوں کی ہوس
چھوڑ دیں جو محض برتری کی نشانیاں بن کر رہ گئی ہیں مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کے دور
حکومت میں کئی "آسائشیں" ایسی تھیں جو انکی "برتری" کی پہچان تھیں، انہیں حاصل کرنے کی خواہش محض اس وجہ
سے پیدا ہوتی تھی کہ وہ "اعلیٰ لوگوں" کو میسر آتی تھیں نہ اسلئے کہ وہ خود "اعلیٰ پایہ" کی آسائشیں ہوتی تھیں
یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ مادی ترقی نہ مشرق کی ملکیت ہے اور نہ مغرب کی۔ اسلئے اب جب
کہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے ہمیں ترقی کی وہ کوشش کرنا چاہیئے جس میں چند افراد کے لئے سامان
تعیش بہم پہنچانے کی بجائے پوری قوم کی فلاح اور بہبود مضمر ہو۔

پاکستان میں معاشرتی ترقی

اس قسم کی ترقی کے متعلق مسائل کی نوعیت بڑی حد تک نفسیاتی

ہوتی ہے۔ پاکستان میں محنت کش لوگوں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان محنتی لوگوں کی محنت کو ٹھیک طور سے کیسے استعمال کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں دیکھنا یہ ہے کہ ان مزدوروں کی ذہنی جسمانی اور صنعتی صلاحیتوں کو کس طرح بوجہ احسن کام میں لایا جائے اور استعمال کیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مادی اور روحانی ترقی کا باعث ہوں۔ اس سوال کو مادی نقطہ نگاہ سے دیکھنے اور پھر اسکے روحانی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پیداوار بڑھانے کا موزوں ترین طریقہ کونسا ہے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اکثر سوال میں جواب بھی پنہاں ہوتا ہے یہ سوال بھی دو طریقوں سے پوچھا جا سکتا ہے [1]، کام کرنے کے لئے سب سے موثر محرک کیا ہیں؟ پیداوار کا انحصار محنت پر ہوتا ہے یعنی محنت زیادہ کی جائے گی اتنی ہی پیداوار زیادہ ہوگی۔ مگر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کام کرنا ہر شخص کو فطری طور پر قدرے ناگوار ہی ہوتا ہے۔ وہ بے کار رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس لئے کام کرنے کے لئے اسے لالچ دینے کی ضرورت ہے پھر اسے مجبور کرنا پڑے گا ہم دیکھتے ہیں کہ جانور عام طور پر چابک کے ڈر سے کام کرتے ہیں پھر فوری انعام [2] کی خاطر کام کرنے والا انسان جانوروں سے چنداں مختلف تو نہیں ہوا! چونکہ ملک کو طاقتور بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے اس لئے ہمیں کوئی ایسا محرک ڈھونڈنا پڑے گا جو لوگوں کو کامیاب طریقہ سے محنت کرنے پر آمادہ کر سکے معاشرے کی ترقی کا انحصار انہیں محرکات کی قوت پر ہوتا ہے۔ اسلئے اگر ہم ترقی کی رفتار تیز کرنا چاہیں تو محرکات کو اسی قدر موثر بنانا ہوگا۔

ترقی کے موثر محرکات

اب سوال یہ ہے کہ سب سے زیادہ موثر تحریک کیا ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ جہاں تک انسان کا تعلق ہے دو محرکات ایسے ہیں جو اسے از حد متاثر کرتے یا کر سکتے ہیں۔ انہیں کے سبب وہ اپنے اکثر کام سرانجام دیتا ہے۔ خوف اور روپیہ۔

1. Incentive. 2- Immediate reward.

خوف بطور محرک

خوف کا سبب ذاتی تحفظ کے بنا پر ہے، غلام سزا سے بچنے کے لئے کام کرتا ہے۔ ایک کسان صبح سے شام تک کھیتوں میں اسلئے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے، زمیندار کو لگان اور حکومت کو مالیہ دے سکے۔ اسے اپنے بچوں کی فاقہ کشی اور زمین کے چھن جانے کا ڈر ہوتا ہے کارخانے کے مزدور اور دفتر کے کلرک اسلئے کام کرتے ہیں کہ کہیں انہیں ملازمت سے علیحدہ نہ کر دیا جائے یا انکی تنخواہیں نہ گھٹا دی جائیں۔ یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ جب مزدور نہر کھود رہے ہوں یا مکان بنا رہے ہوں ٹھیکہ دار یا اسکا کوئی نمائندہ انکی سرزنش کے لیے ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ہر شخص بھوک اور سزا سے ڈرتا ہے، اس لئے اگر یہ اصول بنا لیا جائے کہ جو کام نہیں کرتا اسے کھانے کو نہیں ملے گا تو ہمارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے ہمارے تعلیمی اداروں میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ جب امتحان قریب ہوتا ہے تو لڑکے فیل ہونے کے ڈر سے مجبوراً محنت کرنے لگتے ہیں، اگر فیل ہونے کا ڈر نہ ہو تو پھر شاذ و نادر کوئی طالب علم محنت کرے۔

اگر سب سے بہتر محرک ڈر ہی ہے جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں تو پیداوار بڑھانے اور ترقی کرنے کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر کوئی حکومت اپنے باشندوں کو عظمت اور بلندی کی راہ پر ڈنڈوں کے زور سے لیجانا چاہتی ہے تو ایسی عظمت ایک عذاب ہے جس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ لیکن ہمارے سوال کا یہی تو ایک جواب نہیں اور فی الحقیقت جو جواب ہم نے ابھی ابھی تحریر کیا ہے وہ تو بہت ہی لچر اور پوچ ہے۔ کیا خوف کا کارکردگی پر واقعی اثر پڑتا ہے؟ یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ غلاموں کا کام معیار سے بہت گرا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں بھی مزدوروں کو کم تنخواہ ملتی ہے انکے کام کا معیار گر جاتا ہے اور ساتھ ساتھ پیداوار بھی کم ہو جاتی ہے۔ جن ممالک میں مزدوروں کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے اور بھوکے مرنے کا ڈر نہیں ہوتا وہاں وہ زیادہ سے زیادہ کام کرتے ہیں، اور انکے کارخانوں کی پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صنعتی قوموں کے لئے ذہانت کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور خوف ذہانت کو مفلوج کر دیتا ہے موجودہ دنیا کی ترقی کا انحصار ایجادوں پر ہے اور کسی انسان کو ڈرا دھمکا کر ایجادیں نہیں کرائی جا سکتیں۔

فیل ہو جانے کا ڈر طلبا کو کتابیں رٹ لینے پر مجبور تو کر دے گا لیکن اس سے انہیں تخلیقی فکر نہیں پیدا ہوسکتی جو تعلیم کا اصل مقصد ہے۔

روپیہ بطور محرک

کام کرنے کا دوسرا محرک روپیہ ہوتا ہے۔ انسان حیوان تو نہیں کہ جسمانی ضروریات کی فوری تسکین کے پیچھے ہر وقت بھاگتا پھرے۔ ہر آدمی زر کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ روپیہ چاہتا ہے بے انتہا روپیہ۔ کیونکہ روپے سے ہر وہ چیز خریدی جاسکتی ہے جس کی اسے خواہش یا ضرورت ہو سرمایہ دار اور اشترا کی دونوں زیادہ محنت کے عوض میں زیادہ اجرت دینے کے قائل ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں منافع کو بطور محرک استعمال کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس نظام کو ماننے والوں کا خیال ہے کہ لوگ کاروبار میں اسی وقت دل لگا کر کام کرتے ہیں جب انہیں منافع کی خوب امید ہو اسکے برخلاف اشترا کی نظام میں منافع کو بطور محرک کے کم استعمال کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر محنت کرنے والوں کا "رتبہ" اور "عزت" زیادہ بڑھا دیا جائے تو وہ زیادہ اچھی طرح کام کرتے ہیں لیکن صلہ یا انعام خواہ کسی شکل میں ہو اشترا کی اور سرمایہ دار دونوں اسکے ذریعے مزدوروں کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور انکی خوشیوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نفسیاتی تجربوں سے پتہ چلتا ہے کہ معاوضہ کی امید سزا کے خوف کی بہ نسبت زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انسانی فطرت کے زیادہ مناسب ہے۔ ممکن ہے ایک غلام کوئی بہانہ تراش کر کے سزا سے بچ جائے یا کارکردگی کی نمائش کی آڑ میں سزا سے بچ جائے لیکن اس قسم کا دکھاوا اس آدمی کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا جسے اسکے کام کے مطابق اجرت ملتی ہو۔ پیداوار بڑھانے پر اگر ہم کسی کسان کی مالگذاری محض اسلئے بڑھاتے چلے جائیں کہ وہ بھوک کے خوف سے بدستور محنت سے کام کرتا رہے گا اور پیداوار بڑھاتا رہے گا تو یقین ہے وہ کبھی اچھا کسان نہیں بن سکے گا۔ اسکے برعکس اگر اسی کسان کو پیداوار کے بڑھ جانے پر انعام یا صلہ کی امید ہو تو وہ اپنی ساری کوششیں پیداوار بڑھانے پر صرف کرنے لگے گا۔ صلہ کی امید میں انسان انتھک کوشش کرتا ہے اور اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال میں لاتا ہے اسطرح مزدور کم سے کم کام کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ

بہتر سے بہتر کام پورا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ تیسرے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ مقابلہ انسان کے لئے ایک زبردست محرک کا کام دیتا ہے۔ ناکامی کا خوف ایک دوسرے سے سبقت ـــ ـنے کی خواہش پیدا نہیں کر سکتا صلہ کی امید مقابلے کو فطری اور آسان بنا دیتی ہے۔ اور حصول کی ڈور تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

سائنٹیفک انتظام[1]

پاکستان کی صنعتی ترقی کے ساتھ مہارات کا سائنٹیفک طریق پر بندوبست کرنا ابھی لازمی ہے۔ ہم خود بخود چیزوں کو قاعدے اور سلیقے سے رکھنے لگیں گے۔ "سائنٹیفک انتظام" کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں صلہ کو موثر سے موثر طریق پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ اس میں نفسیاتی تجربہ اور تجزیہ بھی پیش نظر رہتا ہے۔ اس تحریک کا سہرا یعنی صلہ کو بہتر سے بہتر طریق پر استعمال کرنے کی تحریک اور ہم ٹیلر نامی ایک امریکی کے سر ہے اس کا خیال ہے کہ انسانوں کی قوتِ کارکردگی بہت بڑھ سکتی ہے بشرطیکہ ان سے صحیح طور پر کام لیا جائے۔ اور انہیں مزید صلہ کی امید دلائی جائے۔ اس نے اپنے تجربہ کا پہلا مظاہرہ لوہے کی سلاخوں کو مال گاڑی پر لادنے کے سلسلے میں کیا۔ ان دنوں اوسط درجے کا مزدور ۱۲ ٹن لوہا ہر روز مال گاڑی پر لادا کرتا تھا لیکن اسکی اجرت مقابلۃً بہت تھوڑی تھی۔ چنانچہ اس نے مزدوروں کے کام کا بغور جائزہ لیا اور اپنا تجربہ شروع کیا۔ سب سے پہلے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ ایک مزدور ایک دفعہ میں کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے اسے کتنی بار اور کتنے وقفے کیلئے سستانا چاہیئے اپنے بوجھ کو کسطرح کندھوں تک لے جانا چاہیئے اور بوجھ اٹھا کر کسطرح چلنا چاہیئے۔ جس کمپنی کے مزدوروں کا ٹیلر مطالعہ کر رہا تھا اس کمپنی کے مالکوں کا خیال تھا کہ ٹیلر کو اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوگی لیکن پھر بھی انہوں نے شمٹ نامی ایک تنومند مزدور ٹیلر کو آزمائش کے لئے دے دیا۔ ٹیلر نے شمٹ کو بتایا کہ اگر وہ بلا کسی بحث و حجت کے اسکے بتائے ہوئے اصولوں پر چلے تو اسکی آمدنی میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا کیونکہ وہ زیادہ مال لاد سکے گا۔ جلد ہی شمٹ ۴۷½ ٹن یعنی پہلے کی بہ نسبت چار گنا زیادہ لوہا اٹھانے لگا۔ اور اسے تھکاوٹ بھی

1. Scientific management.

پہلے کی نسبت کچھ زیادہ نہ ہوئی تھی۔ ۳ سال تک وہ اسی طرح کام کرتا رہا اور اسکی آمدنی میں ۶۰ فیصدی کا اضافہ ہو گیا ٹیلر نے شمٹ کو نمونہ یا معیار بنا کر پیش کیا اور دوسرے مزدوروں کو بھی اسی کی سطح پر لانے کی کوشش شروع کر دی اگرچہ دوسرے مزدور شمٹ کی طرح مضبوط اور توانا نہ تھے اور اس سطح پر نہیں پہنچ سکے تھے لیکن بیشتر مزدوروں نے پہلے کی نسبت زیادہ لوہا لادنا شروع کر دیا۔ اور انکی آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

اسکے بعد سائنٹفک انتظام کے اصول کو مختلف قسم کے کاموں میں استعمال کیا گیا۔ مزدوروں کی اینٹیں جوڑتے ہوئے تصویریں لی گئیں اس سے اندازہ لگایا گیا کہ کام کرتے وقت مزدوروں کو جو نقل و حرکت کرنا پڑتی ہے اسمیں کافی آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کام کو مختلف لوگوں میں اسطرح تقسیم کیا گیا کہ معمولی کام معمولی راج کرے۔ اور مستری کو کہیں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ مثلاً اگر بڑھئی کام کر رہا ہو اور کام کے دوران میں کبھی کبھار میخیں نیچے گر پڑتی ہیں تو اسے ان میخوں کو اٹھانے سے روک دیا گیا۔ جھک کر میخ اٹھانے میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ اس میخ سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھا گیا۔ یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ ہر مزدور زیادہ سے زیادہ تنخواہ حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ محنت و مشقت کی نوعیت ایک سی نہ ہو۔ اسکی یہ خواہش اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ سائنٹفک انتظام نفسیات کے ماہروں کی زیر نگرانی کام کرے۔

پاکستان میں صلہ کا اصول

جو لوگ مذکورہ بالا نظریہ کو فطرت انسانی کے مطابق سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں صلہ کے اصول پر پوری طرح کاربند ہو کر بہت ترقی کی جا سکتی ہے۔ کسان کو اسکی محنت اور کارکردگی کا خاطر خواہ پورا پورا صلہ ملنا چاہیئے اسے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ اسکی پیداوار مناسب قیمت پر بازار میں بک سکے گی۔ اس کی فصلیں اور مویشی حادثوں اور بیماریوں سے بچائے جائیں گے سیلاب اور قحط سے اس کو محفوظ رکھا جائے گا۔ اور ضرورت کے وقت قرض لینے کے لئے اسے سود خوروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا۔ اسے یہ بھی یقین ہونا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی زمین کو بہتر بنا کر پیداوار میں اضافہ کرے گا تو

تو اسکا ذاتی فائدہ اسمیں زیادہ ہوگا۔ یہی ایک صورت ہے جبکی تحریک عملی طور پر سب سے زیادہ عروج تک پہنچائی جاسکتی ہے۔
اسی طرح اگر ایماندار دکان داروں کو بے جا نفع کمانے والے اور بازار چھننے کے لئے سستا بیچنے والوں سے محفوظ رکھا جائے تو عوام کی صحیح خدمت کرنے میں ہی دکانداروں کو سب سے زیادہ حملہ یعنی نفع ملے گا۔ اور جہاں تک تنخواہ پر کام کرنے والے مزدوروں کا تعلق ہے انہیں دو طریقوں پہ حملہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انکی اسامی کی ترقی کر دی جائے یا پھر یہ کہ انکی تنخواہ بڑھادی جائے۔ جہاں تنخواہ کام کے مطابق دی جاتی ہے وہاں مزدوروں کی تحریک عمل بہت زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے۔
کیا ایک مزدور اچھا کام کرکے فورمین یا منیجر کے عہدے تک نہیں پہنچ سکتا؟ کیا یہ ضروری ہے کہ کلرک زندگی بھر کلرک ہی رہے؟ محنت اور لیاقت سے وہ اونچے عہدوں تک کیوں نہ پہنچے؟ البتہ اگر ایک لکچرار تھرڈ ڈویژن ایم اے ہونے کے سبب اپنے پیشے میں ترقی کا مجاز نہ ٹھیرے تو عین ممکن ہے کہ اس میں اچھا استاد بننے اور تحقیق کرنے کی فطری صلاحیتیں دب جائیں یا وہ انکے متعلقہ جملہ محرکات ختم ہو جائیں۔

اب تک ہم نے صلہ اور خوف کے محرکات کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا ہے۔ لیکن بسا اوقات انکا استعمال ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اکثر لوگوں کے نزدیک دونوں یکساں طور پر اہم ہیں۔ ایک مزدور نوکری چھوٹ جانے کے خوف اور زیادہ تنخواہ پانے کی امید دونوں کے سبب جی لگا کر کام کر سکتا ہے۔ کسان کو فصل کے خراب ہونے پر فاقہ کشی کا ڈر اور پیداوار بڑھانے یا اچھی فصل حاصل کرنے کی خواہش دونوں یکساں کام کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح امتحان میں فیل ہونے کا ڈر اور اچھی ڈویژن حاصل کرنے کی خواہش دونوں طالب علم کو محنت کرنے پر آمادہ کر سکتی ہیں۔

اسی مسئلہ کو کسی اور زاویہ نگاہ سے دیکھیے

لیکن محض محرکات بڑی عمدہ اور بہتر پیداوار یا نمایاں کارکردگی کا انحصار تو نہیں ہے۔ صرف انہیں کو پوری اہمیت دینا جبکہ اہم نفسیاتی عوامل کو نظر انداز کر دینا ہے جو کسی طرح درست نہیں ہے۔ اسلئے ہمیں اس مسئلہ کو کسی دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔ موثر

اور غیر موثر محرکات کے متعلق اپنے سوال کو ہمیں کسی اور طریق سے پیش کرنا ہوگا کیونکہ پیداوار کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہماری متذکرہ سعی بارسائی انسانی فطرت سے متعلق اس نظریہ پر قائم کی گئی تھی جو روزمرہ کی زندگی میں کہیں سرگرم کار نہیں ہوتا۔ تیسرے باب میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ مزدوروں کی جماعتیں عام طور پر "کام کے مطابق اجرت" کے اصول کی مخالفت کرتی ہیں۔ انہیں یہ بات پسند نہیں کہ کام کے مطابق انکی اجرت بڑھتی یا گھٹتی رہے۔ کارخانے کے مزدور خوف کے تحت کام کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے، اور نہ انہیں یہ پسند ہے کہ وہ "انعام" کی خاطر مسلسل مقابلہ کرتے رہیں۔ وہ مقررہ اجرت چاہتے ہیں جس میں خلل پڑنے کا امکان نہ ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی چیز صبح و شام انکو مزید محنت کرنے پر اکساتی رہے۔ کیا وہ واقعی اسقدر کاہل الوجود ہوتے ہیں کہ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں؟ کیا اجرت بہ قدر محنت کا اصول رد کر کے مزدور سبھائیں انکی کاہلی میں اضافہ کرنے کا موجب نہیں ہوتیں؟ کارخانہ داروں کا خیال یہی ہے کہ مزدور سبھائیں مزدوروں کو سست اور نکما بنا رہی ہیں اسلئے وہ مزدور جماعتوں کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مزدور جو سزا کے خوف اور صلہ کی امید پہ جیتے ہیں وہ دنیا کے سب سے بہتر اور جفاکش مزدوروں میں سے ہیں۔ جن کارخانوں کی سبھائیں مضبوط و توانا ہیں وہ نہ صرف پیداوار کے لحاظ سے عمدہ ہیں بلکہ کارکردگی میں بھی انکا جواب نہیں ہے۔ اس لئے بہت سے ترقی پسند سرمایہ دار ایسی سبھاؤں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ امریکی صنعت میں جدید ترین اصلاح کے مطابق موٹر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو سال بھر کی تنخواہ کی ضمانت دی جاتی ہے۔ انہیں ان مہینوں کی تنخواہ بھی ملتی ہے جنمیں ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ یہ ساری باتیں صلہ اور خوف کے اصول کے منافی معلوم ہوتی ہیں۔ اب اصل سوال کو دہراؤ کہ پیداوار کو موثر طریق سے کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسی سوال کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کونسا طریقہ ہو سکتا ہے جسکی بدولت انسان اپنے کام سے پوری پوری تسکین اور آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ فرض کر لینا درست نہیں کہ انسان فطرتاً کاہل ہوتا ہے اور کام سے جی چراتا ہے اور وہ محض سزا کے خوف یا صلہ کی امید پر کام کرتا ہے۔ معلوم یہ ہونا چاہیئے کہ انسان کن حالات میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا پسند کریگا۔

یہ تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ اگر انسان کے دل میں کام کرنے کی خواہش ہو اور وہ واقعی کام کرنا چاہتا ہو تو یقیناً وہ کام بھی کرے گا اور اچھا کام کرے گا۔ اکثر والدین اور استادوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ بچے اسکول میں بھی بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں اور پڑھائی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں یہی بچے کھیلوں میں بڑی محنت سے کام لیتے ہیں اور اگر کوئی انہیں رخنہ انداز ہو تو بہت برا مناتے ہیں آپنے اس قسم کے جملے تو اکثر سنے ہوں گے کہ اگر ارشد تاریخ کے سنہ اور الجبرے کے فارمولے اسی طرح یاد کر سکتا ہے جس طرح کرکٹ کے اسکور یاد کر لیتا ہے تو اسکی فرسٹ ڈویژن یقینی تھی یعنی جب ہم کوئی کام دل سے کرتے ہیں تو بہت اچھی طرح کرتے ہیں، اسی اصول کو ہم اپنی معاشی تنظیم پر بھی منطبق کر سکتے ہیں اور یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ اس سے نہ صرف یہ کہ پیداوار میں اضافہ ہوگا بلکہ اس اصول کی مدد سے ہم اپنی روحانی قدروں کو بھی اپنا سکیں گے اور انہیں زندگی میں جاری رکھ سکیں گے۔

کام اور کھیل

آئیے سب سے پہلے "کام" اور "کھیل" کی نوعیت پر غور کریں۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان کو کام سے ہمیشہ نفرت ہی ہو۔ کام بھی اتنا خوش آیند اور تسکین بخش ہو سکتا ہے جتنا کھیل۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہمیں مختلف قسم کے افعال کا جائزہ لینا ہوگا۔ مثلاً (۱) ایسے فعل جنکا کوئی خاص مقصد یا فائدہ نہ ہو یا جن میں ہم محض لطف اندوزی کے سبب حصہ لیتے ہیں مثلاً ہاکی یا ٹینس کا دوستانہ میچ۔ دوستوں کے ساتھ گپ بازی۔ وغیرہ فعلوں کو "کھیل" کہا جا سکتا ہے۔

(۲) ناخوش گوار اور اکتا دینے والے فعل جو سزا کے خوف یا صلہ کی امید میں کئے جاتے ہیں، جوں ہی کام کا وقت ختم ہو جاتا ہے مزدور سب کچھ چھوڑ کر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ امتحان کے بعد طلبا کتابوں اور کاپیوں کو ایک طرف پھینک دیتے ہیں، ایسے ہی فعل یقیناً کام کے تحت آتے ہیں۔

(۳) ایسے فعل جنکی ہیئت میں کھیل اور کام دونوں کے عناصر شامل ہوں مثلاً ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے کسی اہم میچ کے لئے مشق کرنا یا ٹیم میں آنے کے لئے کوشش کرنا۔ یہ فعل بذات خود فطری نہیں ہے اور بہت ممکن ہے خوش آیند بھی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کھلاڑی بجائے ٹیم کے ساتھ مشق کرنے کے سینما جانا زیادہ پسند کرے لیکن اسکو کپتان کی ناراضگی یا دوسرے کھلاڑیوں کا ڈر یا لحاظ مو...

لئے جبراً کھیلنے چلا آیا ہو کیا ایسے کھیل کو کام نہیں کہیں گے

علاوہ بریں کچھ فعل ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہیں انسان پوری عادت کو ہو جائے۔ مثلاً گراموفون کے موجد ایڈیسن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بعض مشکل مسئلوں پر دن رات بغیر کھائے پیئے کام کرتا رہتا ہے اکثر علما کسی نئی حقیقت میں رات رات بھر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسان اپنی فصل اور مویشیوں کی دیکھ بھال نہایت دل سوزی اور محبت سے کرتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی چھٹی کے دن بھی اپنے دفتر یا دکان پر چلا جاتا ہے۔ ایک سرکاری ملازم دفتر کے کام پر اتنا وقت اور محنت صرف کرتا ہے جو اسے ترقی دلانے یا افسر کو خوش کرنے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ متعدد بھٹانوی مزدور جنہیں لاٹری میں بڑی بڑی رقمیں ملی تھیں کچھ دنوں کے بعد اپنے اپنے کام پر لوٹ آئے کیونکہ انہیں کام کرنے کی ضرورت تھی تنخواہ انکے لئے باعث کشش نہیں تھی کیا یہاں ہمارے کام کھیل نہیں بن گئے ہیں؟ جب تک کوئی معاشرتی نظام اس قسم کے کارنامے کھیل وضع نہیں کرتا اور انکا کوئی بندوبست نہیں کرتا اس نظام میں پیداوار معمولی ہوگی اور عوام کا رہن سہن بھی بہت ہی معمولی رہے گا۔

ظاہری اور حقیقی محرکات

اب سوال یہ ہے کہ کام کھیل میں کیونکر تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اسے اتنا دلچسپ اور خوشگوار کیونکر بنایا جائے کہ ہم پوری توجہ سے اس میں حصہ لیں اور آسودگی حاصل کریں؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے ماہرین نفسیات نے ظاہری[۲] اور حقیقی[۳] محرکات کی تفریق وضع کی ہے۔

ظاہری محرکات

ظاہری محرکات متعلقہ فعل سے الگ کسی اور چیز سے مربوط ہوتے ہیں یعنی ان محرکات کے تحت جو کام ہوتے ہیں وہ کام کی غرض سے نہیں بلکہ سزا کے خوف یا صلہ کے لالچ کی خاطر سرانجام پاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر روپیہ بہت عمدہ ظاہری محرک کا کام کرتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک آدمی کوئی کام صرف پیسوں کی خاطر اختیار کرے اور خاطر خواہ پیسے نہ ملنے پر اس کام کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس کام کو صرف ظاہری محرکات کی

1. WORK. 2 PLAY. 3 Extrinsic. 4 Intrinsic.

بنا پر کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص شہرت اور ترقی کے لئے ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہو اور ان کے نہ ملنے پر انہیں دلچسپی لینا چھوڑ دے تو گویا اس کو کام پر اکسانے والا محرک محض ظاہری تھا۔

حقیقی محرکات

اب ذرا حقیقی محرکات کو لیجئے۔ یہ وہ محرکات ہیں جو آدمی کو بلا خیال جبر سزا کام کی غرض سے کام اختیار کرنے پر اکساتے ہیں۔ ان کا انحصار دلچسپی پسند یا اس احساس پہ ہوتا ہے کہ کار متعلقہ ذاتی قابلِ قدر ہے اور اسے سرانجام دینا چاہیئے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں محرکات اکثر ایک ساتھ کار فرما ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے کام میں دلچسپی بھی ہو سکتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ امید بھی ہو سکتی ہے کہ ہمیں کچھ حاصل بھی ہو جائے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ان دونوں محرکات میں سے کونسا زیادہ موثر و مضبوط ہے۔ یہ چنداں ضرورت ہو کہ اگر فقط ظاہری یا حقیقی محرکات ہوں تو کیا ہم اسی طرح کام کرتے رہیں گے یا اسمیں کوئی فرق پڑ جائے گا۔ وضاحت کے لئے انہیں کالج کی تعلیم پر منطبق کر کے دیکھئے۔

محرکات کا جائزہ

آپ اپنے محرکات کا جائزہ اپنے کو طالب علم تصور کر کے مندرجہ ذیل طریقے سے لیجئے۔ ٹسٹ کو حل کرنے کے لئے ہدایتیں یہ ہیں کہ

(۱) اگر آپ بیان الف کی طرف زیادہ مائل ہیں تو اسکے سامنے ۱ کا ہندسہ لکھیں

(۲) " " " " " کچھ تھوڑا سا مائل ہیں " " ۲ " " "

(۳) " " " بیان ب " " " " " ۳ " "

(۴) " " بیان ب " " بہت زیادہ مائل ہیں " " ۴ " "

بیانات ملاحظہ ہوں I الف۔ کیا آپ امتحان سے پہلے معمول سے زیادہ محنت کرتے ہیں

ب :۔ کیا آپ سال بھر یکساں مطالعہ کرتے ہیں۔

II الف :۔ کیا آپ صرف وہی سوال یاد کرتے ہیں جو آپ کے خیال میں امتحان میں پوچھے جا سکتے ہیں۔

ب۔ کیا آپ کسی مضمون میں درک پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھار نصابی چیزوں کے علاوہ بھی کچھ پڑھتے ہیں جو آپ کو مفید اور دلچسپ معلوم ہوتا ہو یا اگر سائنس سے کے

طالب علم ہیں تو کیا آپ کبھی اپنے طور پر تجربے کرتے ہیں۔

III الف :- جب امتحان کے پرچے واپس کیئے جاتے ہیں تو کیا آپ نمبروں کا مقابلہ کرنے کے لئے دوسرے کے پرچے دیکھتے ہیں۔

ب۔ جب امتحان کے پرچے واپس کیئے جاتے ہیں۔ تو آپ دوسروں کے پرچے اس لئے دیکھتے ہیں کہ آپ کو اپنی غلطیاں معلوم ہو جائیں اور آپ اپنی اصلاح کر سکیں۔

IV الف۔ کیا آپ امتحان پاس کرنے کے لئے بازار کے نوٹ اور امدادی کتابچے اور رٹنے کے آسان طریقے استعمال کرتے ہیں۔

ب۔ کیا آپ مطالعہ کے ان طریقوں پر عامل ہیں جن سے آپ مضمون کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں۔

V الف : کیا آپ کو زیادہ تر فقط نمبروں کی ہی فکر رہتی ہے۔

(ب) کیا آپ کو ان مسائل کی فکر ہوتی ہے جو آپ کے مضمون سے پیدا ہوتے ہیں۔

VI الف : کیا آپ اپنے استادوں سے زیادہ نمبر لینے کی غرض سے ملا جلا کرتے ہیں یا اسلئے کہ وہ آپ کے متعلق اچھی رائے قائم کریں گے یا اس خیال سے کہ اس طرح بات چیت کرنے سے امتحان کی تیاری میں کم وقت صرف ہوتا ہے

ب۔ کیا آپ ان مسئلوں پر گفتگو کرتے ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتے یا جنیں آپ کو خاصی دلچسپی ہوتی ہے

VII الف۔ کیا امتحان ختم ہو جانے پر آپ مضمون کا مطالعہ چھوڑ دیتے ہیں

ب۔ کیا امتحان کے بعد بھی مضمون سے آپ کی دلچسپی قائم رہتی ہے ہے اور آپ اسکا مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ اسکے متعلق سوچتے اور گفتگو کرتے ہیں اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

VIII الف۔ کیا آپ اپنے منتخبہ مضامین کی بجائے دوسرے مضامین کا انتخاب کرتے اگر آپ کو یہ یقین ہوتا کہ انکو پڑھکر بھی آپ کو اسی آسانی سے ملازمت مل سکتی ہے اور آپ ان

میں بھی ایسی ہی لیاقت پیدا کر سکتے ہیں۔

VIII ب۔ کیا آپ نے مضامین اپنی پسندیدگی کی بنا پر اختیار کیے ہیں۔

IX الف۔ کیا آپ تعلیم کے معاملہ میں صرف چند ضروری باتوں کو ہی پورا کرتے ہیں۔

(ب) کیا تعلیم کا مقصد اسکے فوائد اور قدر و قیمت سب آپکی پیش نظر رہے ہیں۔

X الف۔ کیا وہ وقت جو آپ پڑھائی میں صرف کرتے ہیں آپ پر گراں گزرتا ہے۔

(ب) کیا آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش آپ کے پاس اور وقت ہوتا تاکہ آپ وہ چیزیں بھی پڑھ سکتے جو امتحان کے لئے اتنی ضروری نہیں ہیں اگر آپ نے سوالات بالا پر نشانات صحیح طور پر بے باکی کے ساتھ اور اچھے بُرے کا لحاظ کیے بغیر لگائے ہیں تو اسکے نتائج سے بڑی حد تک پتہ چل جائے گا کہ آپ کے محرکات کی نوعیت کیا ہے وہ ظاہری ہیں یا حقیقی۔ اگر آپ کے لگائے ہوئے نشانات کا میزان مثبت میں آتا ہو تو آپ کا رجحان ظاہری محرکات کی طرف زیادہ ہے اگر یہ میزان منفی میں ہے تو آپ کا رجحان حقیقی محرکات کی طرف زیادہ ہے۔ دونوں قسم کے محرکات بہت اہم ہیں۔ اور قریباً دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کسی نئے مضمون میں دلچسپی پیدا کرنے اور کسی کام کے بہت سی ناگزیر مایوسیوں اور نامرادیوں پر قابو پانے کے لئے ظاہری محرکات کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن حقیقی محرکات کے دیرپا اور تسکین بخش ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ موثر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

حقیقی محرکات کے لئے سازگار حالات

تمام مطلوبہ کاموں کے لئے وہ حالات کس طرح پیدا کیے جائیں جو حقیقی محرکات کی نشوونما کے لئے سازگار ہوں اور جو انسان کو اسکے کام کی طرف سے مطمئن بنا دیں اور اسے خوبی سے سرانجام دینے کی امنگ کو قوی تر بنا دیں۔ معاشرتی نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سوال کا بہترین جواب مندرجہ ذیل تین نکتوں میں مضمر ہے۔ غور سے دیکھئے یہ تینوں نکتے ایک دوسرے

سے کسطرح وابستہ ہیں۔

(۱) ایسے حالات پیدا کیے جائیں جنمیں مزدور تندرست اور مطمئن رہ سکے انسان فطرتاً کاہل نہیں ہوتا۔ تندرست کسان فاقہ زدہ کسانوں کی بہ نسبت زیادہ محنت سے کام کرتے ہیں۔ ایسے سپاہی جنہیں خوب کھانے کو ملتا ہے بھوکے سپاہیوں کی بہ نسبت زیادہ جانفشانی سے لڑتے ہیں۔ نپولین کا یہ قول کہ فوج اپنے شکم کے سہارے لڑتی ہے اس لحاظ سے بالکل درست ہے۔ ایک آدمی جو غیر ضروری شور و غل، گرمی، سردی، گھنٹوں کھڑے ہوکر یا تکلیف دہ کرسی پر بیٹھ کر کام کرتا ہو اسے خود اپنی تکلیف اور تھکن کا احساس خواہ نہ ہو تو بھی وہ صحیح معنوں میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ وہ لوگ جو غلیظ اور اندھیرے مکانوں میں رہتے ہیں اور جنکی بیویاں ہمیشہ انکو پریشان کرتی ہیں وہ اچھا کام نہیں کر سکتے۔ مزدوروں کے معاملہ میں بھی یہ بات بالکل صادق آتی ہے اچھا رہن سہن اور کام کے لئے سازگار حالات مزدوروں کی کارکردگی اور خوشحالی میں اضافہ کرتے ہیں۔

دوسرا نکتہ پہلے نکتہ کی نسبت بنیادی طور پر زیادہ اہم ہے۔ ایک اچھا مزدور نہ صرف خود اپنی عزت کرتا ہے بلکہ دوسرے بھی اسکا احترام کرتے ہیں۔

ایک قابل قدر مثال

مسٹر محمد مسعود کو جو آجکل محکمہ بحالیات مغربی پاکستان کے سکرٹری ہیں جب سنہ ۱۹۴۲ء میں بھیل قوم کی اصلاح کے لئے بطور ایک اعلےٰ افسر مقرر کیا گیا تو انہوں نے نہایت عمدہ نفسیاتی بصیرت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ ان لوگوں کو اقتصادی اور معاشرتی طور پر بلند کرنے اور انہیں قوم کا ایک مفید عنصر بنانے کا مسئلہ دراصل ان میں عزت نفس کے جذبے کا پیدا کرنا اور بڑھانا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہوا کہ ان لوگوں پر نگرانی رکھنے یا انہیں سخت محنت کے عوض انعام واکرام دینے سے بھی حکومت کا منشا پورا نہیں ہو سکتا۔ تین سال کی قلیل مدت میں مسٹر مسعود نے انہیں گرے ہوئے اپنے آپ پر ترس کھانے

* قدیم ہندوستانی قبیلوں میں سے ایک مفلوک قبیلہ

والے خستہ اور بدحال لوگوں کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ وہ باعزت اور باوقار لوگ بن گئے اب وہ اپنے
حقوق کی خاطر سینہ تان کر کھڑے ہونے لگے انہیں اپنی روایات یا اپنے تمدن کو اپنا کہتے ہوئے کوئی
عار محسوس نہ ہوتی تھی وہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کہیں سے اپنی گم شدہ روح حاصل ہو گئی ہے اور وہ ترقی کی
شاہراہ پر چل نکلے ہیں۔ انکی بڑی مشکلوں میں سے ایک مشکل بنیوں کا ظلم تھا جو انہیں کھائے جا رہا تھا۔ اس
سے نجات دلانے کے لئے انہیں حکومت کی طرف سے بڑے بڑے قرضے دیئے گئے۔
مگر ان قرضوں سے بھی زیادہ ضروری کام جو مسعود صاحب نے کیا وہ انہیں ایک نئی روح کا پھونکنا تھا تاکہ وہ
بنیوں کے ظلم و تشدد کے خلاف لڑ سکیں۔ دوسرے لفظوں میں مسعود صاحب نے انکو اپنے پاؤں پر
کھڑا ہونا اور اپنے حقوق کے لئے لڑنا سکھا دیا[1]۔ سوال یہ ہے کہ مسٹر مسعود نے یہ نمایاں کام کیوں کر انجام دیا
یہ کام نہ لمبی لمبی تقریریں کر سکتی تھیں نہ بار بار اس بات کی تلقین کرنے سے کہ اپنی عزت کرنا سیکھو، اپنی عزت کرنا
سیکھو سے یہ معرکہ ہو سکتا تھا؟ اس کام کو پورا کرنے کے لئے جناب مسعود نے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ خود
انہوں نے ان لوگوں کی عزت کرنا شروع کی۔ انہوں نے انکے ناچ سیکھے تاکہ انکے ساتھ ناچ
سکیں۔ انہیں کی طرح سادہ لباس پہننا شروع کیا۔ وہ انکے لئے محض ایک افسر نہ رہے بلکہ دوستوں
کیطرح انہیں گھل مل گئے۔ انکے بعض آئی سی ایس رفقائے کار نے گلہ کیا کہ بجائے ان لوگوں کو بلند کرنے
کے وہ خود انکی سطح پر اتر آئے ہیں مگر مسٹر مسعود خوب جانتے تھے کہ طریقہ کار یہ نہیں ہے کہ خود بلندی
پر بیٹھ کر ان لوگوں کو اوپر اٹھایا جائے بلکہ طریقہ یہ ہے کہ انکے ساتھ میل ملاپ بڑھایا جائے تاکہ وہ اپنی
مدد آپ کر کے اپنے آپ کو بلند کر سکیں۔ انہوں نے انہیں کی زبان میں ایک گیت بھی لکھا انہیں
کے ساتھ مل کر وہ اکثر اس گیت کو گایا بھی کرتے تھے۔ گیت میں انہوں نے ایک بھیل کو بھیل ہونے
پر فخر کرنا سکھایا تھا گیت سراسر اسی جذبے کا ایک خوبصورت اظہار تھا کہ میں ایک بھیل ہوں میں خوش
ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں ایک بھیل ہوں وہ خود بھیلوں کی طرف سے بانیا لوگوں کے خلاف برسر

1 From Mr. Krishna. Illustrated Weekly of India. Nov. 11. 1945.

بیکار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ نیبوں کے خلاف آواز اٹھا سکیں نیبیں! درعزت نفس کا آپس بڑا گہرا تعلق ہے اور مسٹر مسعود نے پہچان لیا تھا کہ جب تک بھائیوں میں خود اعتمادی پیدا نہ ہوگی انہیں عزت نفس کا جذبہ کبھی نہ ابھرے گا۔ ان حالات میں مسٹر مسعود سے بڑا ماہر کون ہو سکتا ہے!

ہمارا طریق کار

اسی طرح اگر ہم اپنے عام کسانوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کریں اور انہیں پاکستان کے باعزت شہری ہونے کا احساس دلائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اچھے کسان نہ بنیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں ایک جاہل اور ان پڑھ آدمی میں خود اعتمادی کا پیدا ہونا مشکل ہے لیکن لکھ پڑھ سکنے کے قابل ہونا ہی تو کافی نہیں۔ ہمیں اپنے کسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہیئے کہ انہیں یہ احساس بیدار ہو جائے کہ قومی زندگی کو بہتر بنانے میں انکا بڑا ہاتھ ہے اور انکی یہ خدمات محض جسمانی قوت اور اسکے استعمال تک محدود نہیں ہیں۔ اگر ہم انکو جاہل ہی سمجھتے رہے تو اس سے ملک کی بنیادیں مضبوط ہونے کی بجائے کمزور ہوتی جائینگی۔

وہ کلرک یا ادنیٰ افسر جسکی ضروریات زندگی کا خیال نہ کیا جائے وہ کبھی اچھا کام نہیں کر سکتا۔ روزمرہ زندگی میں اسکے ساتھ ہمدردی اور اچھا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ دفتر کے متعلق نئے قواعد و قوانین مرتب کرتے وقت اگر ملازمین کے آرام و آسائش کا خیال نہ رکھا جائے تو نتائد انکا ردیہ کچھ اس قسم کا ہونا بعید نہیں ہے کہ اگر دوسروں کو ہمارا خیال نہیں ہے تو ہم کیوں انکا خیال کریں! اسی طرح اگر کسی طالب علم کے دیانتداری سے پوچھے ہوئے سوالات پر بھی دھیان نہ دیا جائے تو وہ مضمون پر سنجیدگی سے سوچنا ترک کر دے گا۔ اگر والدین یا انتظامیہ کے افسر اساتذہ کو محض تنخواہ دار ملازم سمجھیں جنکا فرض فقط افسران بالا کا حکم بجا لانا ہو تو کوئی اچھا نظام تعلیم کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ کسی استاد کو مجبور کرنا کہ وہ کسی لڑکے کے نمبر بڑھا دے ممکن ہے آپ کے نزدیک اسقدر خطرناک نہ ہو جتنا کسی ڈاکٹر کو مجبور کرنا کہ وہ اپنی تشخیص کے خلاف نسخہ لکھ دے۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اس قسم کی کوشش پورے نظام تعلیم پر ایسا اثر ڈالتی ہے کہ اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ ممتحن کم یا زیادہ نمبر بطور انعام تقسیم نہیں کرتا۔ یہ تو ایک فیصلہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنی سمجھ کے مطابق پوری پوری سنجیدگی سے پہنچتا ہے۔ اس فیصلے کو تبدیل کرانا

گویا معاشرہ پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔"

معاشرتی نفسیات کا ماہر نفسیات کے عالم کی حیثیت سے ان کاموں کو اخلاقی طور پر برقرار دینے کا مجاز نہیں۔ اسکا کام تو فقط اتنا ہے کہ یہ بتا دے کہ ان سے کیا خاص نتائج مرتب ہونگے وہ یہ نہیں مانتا کہ کوئی افسر من مانی بھی کر سکتا ہے اور اسکی کارکردگی پر اسکا کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ وہ تو یہ جانتا ہے کہ جس نے بھی من مانی کرنی شروع کی آخر کار نکما ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے بدخو غلط افسر کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ کام اسکی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا اور بجائے انسانی فطرت کو سمجھنے کے وہ اور زیادہ جابر بننے کی کوشش کرتا ہے اور حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

ہر فرد کو اس احساس سے تسکین ہوتی ہے کہ اس کا کام مفید اور اہم ہے اور جس کمپنی دفتر یا کارخانے میں وہ کام کر رہا ہے اس میں اسکا ایک خاص مقام ہے اگر وہ کام نہ کرے تو اسکی کمی محسوس کی جائے گی۔ ویلز میں کوئلہ کی کان میں کام کرنے والے ایک مزدور نے کسی بیاح سے بڑے فخر کے ساتھ کہا اگر ہم نہ ہوں تو کان کا کام نہیں چل سکتا حالانکہ اس کی اپنی ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ وہ اس لفٹ کو چلاتا تھا جس کے ذریعے مزدور رات کو کان میں اترتے اور چڑھتے تھے۔ ہر گروہ کے کام کا انحصار بڑی حد تک اجتماعی ہمت و حوصلہ پر ہوتا ہے لہذا کسی ادارہ میں محنت کے ضائع ہو جانے سے اجتماعی حوصلہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ اگر مزدوروں سے فضول اور بیکار قسم کے کام کرائے جائیں یا ان سے غلط طریق سے کام لیا جائے تو اس سے انکے حوصلے پر برا اثر پڑتا ہے۔ ایک دفعہ چند امریکی انجینیروں نے جو کسی کمپنی میں ملازم تھے اچھی تنخواہ پانے اور ملازمت کے مستقبل ہونے کے باوجود کام میں دلچسپی لینا یکایک بہت کم کر دیا تفتیش سے معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے انہوں نے کچھ اشیا بنانے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا تھا۔ مگر پھر کارخانے میں یکایک تبدیلیاں ہو گئیں اور وہ اپنا طریقہ استعمال نہ کر سکے۔ وہ اپنے آپ کو بے مصرف محسوس کرنے لگے، باوجود اچھی تنخواہ پانے کے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور کام سے جی چرانے لگے۔

بعض کارخانوں کے مالک اور دفتروں کے افسر اپنے مزدوروں اور ملازموں کو پورے

ادارہ کا کام سمجھاتے ہیں مثلاً وہ ہر ملازم کو بتا دیتے ہیں کہ اسکے اپنے کام کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے اور پھر پورے ادارے کے کام سے اپنے کام کا تعلق بھی سمجھا دیتے ہیں۔ اس صورت میں اسکے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ اسکا اپنا کارخانہ ہے اور اسکو اچھی طرح چلانے کے لیے حقیقی محرکات کام کرنے لگتے ہیں۔

حکومت کے کسی ایسے دفتر کا تصور کیجیے جہاں بہت سے کم تنخواہ پانے والے کلرک بیہودہ میزوں کے پیچھے تکلیف دہ کرسیوں پر بیٹھ کر دستاویزوں کی نقلیں تیار کرتے ہیں۔ انہیں نہ تو دستاویزوں کے معنی سمجھتے ہیں اور نہ انکا مصرف جانتے ہیں۔ یا پھر وہ وہاں بےکار بیٹھے افسر کے احکام کا انتظار کرتے رہتے ہیں جب یا تو کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یا وہ معلوم کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتا کہ کام ہو بھی رہا ہے کہ نہیں اور یہی افسر بعد میں اپنے کلرکوں کے نااہل کام چور سست ہونے کی شکایت کرنے لگتے ہیں اور انکی تنخواہ کی کمی کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایسے کلرکوں کو دھمکی سے یا چھوٹے موٹے لالچ سے محنتی اور اہل نہیں بنایا جا سکتا۔ سب سے پہلے انکے ساتھ انسانوں کا سا سلوک ہونا ضروری ہے کام کرنے کے لئے مناسب ماحول اور آرام دہ دفتر ہو۔ اور انہیں اس بات کا موقع ملے کہ وہ اپنے کام کی نوعیت اور اہمیت سمجھ سکیں۔

احترام کا طریقہ

کسی کی پذیرائی اور احترام کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسکو اسکی قابلیت کے مطابق ترقی کرنے کا موقع دیا جائے مثلاً ہم اسکے لئے ایسے حالات پیدا کر دیں جو اسے یہ احساس دلائیں کہ وہ کلرکی کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور عمر بھر کلرک ہی رہے گا اور ترقی نہیں کر سکتا تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ وہ عام انسانوں سے مختلف تصور کیا جا رہا ہے۔ اگر ایک بھی کلرک کسی اونچے عہدہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے اسکے ساتھی کلرکوں کی عزت نفس بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کارخانے کا مالک یا کوئی نگران اپنے مزدوروں کو فرداً فرداً جانتا ہے اور انکے نام لے کر انہیں پکارے تو اس سے انکا حوصلہ بڑھ جاتا ہے وہ اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگتے ہیں کارخانے کے مالک سے انکا انسانی حیثیت کا احساس بھی مزدوروں میں عزت نفس کو بڑھاتا ہے

وہ سب اپنے افسر یا مالک کی طاقت اور دولت پر فخر کرنے لگتے ہیں کچھ مزدوروں نے ایک بار اس بات کی شکایت کی کہ کمپنی کا منیجر بہت پرانی موٹر پہ دفتر آتا ہے، انکو یہ احساس تھا کہ اسطور پر منیجر کمپنی کی عزت و وقار کو صدمہ پہنچا رہا ہے۔ اسکے برعکس وہ اس بات سے بھی خوش ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی دولت کو یونہی ضائع نہیں کرتا پھرتا۔ اسلئے ایسے موقعوں پر فقط اپنے نظریات کو دھیان میں نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ انفرادی رد عمل پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اسی طرح ریلوے کے کلرک اور دوسرے ملازمین کو اپنی "ریلوے" پر فخر ہو سکتا ہے اور انکم ٹیکس کے ملازمین کو اس بات پر فخر ہو سکتا ہے کہ انکے محکمہ کی بدولت حکومت کو اتنی آمدنی ہوتی ہے۔ نوجوں کو اکثر اپنی رجمنٹ یا اپنے خاص محکمے پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی سرمایہ دار اپنے مزدوروں کو زیادہ مزدوری دینے کی بجائے انکا احترام کر کے انہیں عزت نفس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ایسا کرنے میں اسکو جیب سے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ کیوں نہ اسی "سستے نسخے" کو استعمال کیا جائے مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کی بجائے کیوں نہ انکا زیادہ "احترام" کیا جائے۔ کار پٹرول سے چلانے کی بجائے کیوں نہ سستے ڈیزل سے چلایا جائے لیکن اس سستے نسخہ میں ایک قباحت یہ ہے کہ انسان موٹر کیطرح کوئی مشین نہیں۔ اسکی ضروریات مختلف ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ انسان کے لئے عزت نفس پیسوں سے زیادہ اہم ہوتی ہے مگر مزدوروں کو اسطرح "بے وقوف" نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر کوئی کارخانہ دار واقعی اپنے مزدوروں کی عزت کرتا ہے تو وہ انہیں اچھی تنخواہ اور ملازمت کی بہتر شرائط کا بھی حقدار سمجھے گا۔ زبانی جمع خرچ اور کھوکھلی عزت سے انکو خوش نہیں کیا جا سکتا۔

تنخواہ کا مطلب

تنخواہ کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ ہمیں ضروریات زندگی کے لئے کچھ روپے مل جاتے ہیں۔ تنخواہ کا مطلب کچھ اور بھی ہے مثلاً اسکے معنی عزت اور حیثیت کے بھی ہیں، اچھی تنخواہ، اچھی حیثیت اور عزت نفس کا آپس میں گہرا تعلق ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ مہمانوں کے آرام اور سہولت کا بندوبست کرنا انکی عزت کرنے کے مترادف ہے اسی طرح اگر ہم مزدوروں کی عزت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں انکے آرام اور آسائش کا خیال کرنا ہوگا۔

زیر نظر مسئلہ کے متعلق تیسرا اصول
گروہ کی نوعیت اور مثالی آسودگی

اب تک ہم نے زیر غور مسئلے کے متعلق دو اصولوں کا ذکر کیا ہے یا اچھی تنخواہ کے ساتھ مناسب شرائط ملازمت اور ملازمین کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھنا۔ اب اس مسئلے کے تیسرے نہایت ضروری اصول کا مطالعہ کرنا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ حالات کسطرح پیدا کیئے جا سکتے ہیں جنہیں انسان خود بخود کام کرنے لگے اور جیسے اسکو کام کر کے آسودگی اور اطمینان محسوس ہو۔ حوصلے کے بلند ہونے کا انحصار بڑی حد تک مزدوروں کے گروہوں کی باہم قربت کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ اسکا تعلق گہرے انسانی تعلقات سے پیدا ہونے والی اس آسودگی پر بھی ہوتا ہے جو انسانوں کو باہم مل کر کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گروہ کی نوعیت یا اس بے مثالی آسودگی کے صحیح معنی کیا ہیں اور ماہرین انہیں اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی توجہ پہلے پہل اس طرف اس وقت مبذول ہوئی جب شکاگو کے ہاتھورن ورکس آف جنرل الیکٹرک کمپنی میں چند تجربے اس غرض سے کئے گئے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ بہتر حالات کی موجودگی میں پیداوار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ مزدوروں کے دو گروہ (جو تعداد میں برابر تھے) منتخب کیۓ گئے ایک گروہ بدستور پرانے حالات میں کام کرتا رہا دوسرے گروہ کے لئے بہتر روشنی کا انتظام کیا گیا۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ دوسرے گروہ کا کام یقیناً بہتر ہوگا اور وہ تیزی سے کام کرنے لگیں گے۔ تجربہ کرنے والوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ دونوں گروہوں کا کام یکساں طور پر بہتر تھا پھر دوسرے گروہ کو روشنی میں کام کرنے پر مامور کیا گیا لیکن انکے کام کی رفتار میں کوئی فرق نہ پڑا وہ بدستور تیز رہی آخر کیوں؟ اس بات کی مزید تحقیق کرنے کے لئے دو لڑکیوں کو منتخب کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ اپنی پسند کی چار لڑکیاں چن کر چھ لڑکیوں کی ایک ٹولی بنالیں۔ وہ ٹیلیفون کے متفرق پرزوں کو جوڑ کر ٹیلیفون بنایا کرتی تھیں ان لڑکیوں کا پورے پانچ سال مطالعہ کیا گیا۔ اور انکے کام کا پورا ریکارڈ بڑی احتیاط سے مرتب کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کام کے متعلقہ سہولتوں میں اضافہ ہوتا رہا مثلاً آرام کے لئے خاص وقت مقرر کیا گیا کمپنی کی طرف سے نہایت عمدہ مفت کھانا ملنے لگا۔ تنخواہ کام کے مطابق

دی جانے لگی۔ اور بہتر سہولت کے بعد انکا کام بہتر ہوتا گیا اس سے ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر کام کرنے کے حالات بہتر کر دیئے جائیں تو کارکردگی بہتر ہو جاتی ہے لیکن آخر میں ان سب اصلاحات اور سہولتوں کو ختم کر دیا گیا اور سب مراعات واپس لے لی گئیں۔ مگر اس کا لڑکیوں کے کام پر کوئی برا اثر نہ پڑا بلکہ ان کا کام پہلے سے بھی اچھا ہو گیا۔ وہ پہلے کی نسبت زیادہ ٹیلیفون تیار کرنے لگیں اس تجربے سے یہ نتیجہ نکلا کہ کام کے بہتر ہو جانے کی اصل وجہ اجتماعی جذبہ تھا ان لڑکیوں کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ کمپنی انکے گروہ کا خاص خیال رکھتی ہے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان مراعات کو واپس لے لینے کا مطلب یہ نہیں کہ اب کمپنی کے مالک انکی قدر نہیں کرتے بلکہ یہ انکے تجربے کا ایک جزو تھا۔ کام کرنے کے موزوں ترین حالات تو فقط انفرادی ضروریات پوری کرتے ہیں لیکن صحت مند اجتماعی جذبہ پورے معاشرے کی ضروریات اکتفا کرتا ہے۔ اور معاشرتی ضروریات انسان کی اہم ترین ضرورتوں میں شمار کی جاتی ہیں جنگ میں سپاہی بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتے ہیں انہیں طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ان کا اجتماعی حوصلہ اگر بلند ہے تو وہ بہادروں کی طرح لڑتے ہیں ورنہ انہیں سے کوئی فرد واحد بھی دلیرانہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لنڈن کے قصابوں کا ایک گروہ کسی نہایت غلیظ، تاریک اور سرد کمرے میں کام کیا کرتا تھا جہاں باہر کا کوئی آدمی شاید پل بھر کے لئے بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرے لیکن یہ سب وہاں بڑے اطمینان سے اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انکی تنخواہیں معقول تھیں۔ انہیں اپنے فن پر ناز تھا اور ایک دوسرے کی صحبت پسند تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی گروہ کے افراد آپس میں شیر و شکر ہوں تو انہیں کام میں کتنی آسودگی حاصل ہوتی ہے اور وہ کس خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔

کسی گروہ کے حوصلے اسی وقت بلند ہو سکتے ہیں جب اس گروہ کی تشکیل فطری ہو اسکے سب ممبر اپنا رہنما خود منتخب کریں اور بعض معاملوں میں انہیں فیصلہ کرنے کا اختیار اور آزادی ہو۔ اگر ہم اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو کوئی کام سونپ دیں اور اس بات کا خیال نہ کریں کہ انکے آپس میں تعلقات کیسے ہیں۔ یا پھر خود ہی انہیں سے کسی کو انکا سردار بنا دیں اور بغیر انکے مشورے کے انکو نت نئی ہدایتیں دیتے رہیں تو ان سے بلند حوصلگی اور اعلےٰ کارکردگی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ ایک بار کسی کارخانے میں

روشنی کا انتظام بدل کر پہلے سے بہتر کر دیا گیا تاکہ آنکھوں پر جو بوجھ پڑتا تھا وہ نہ پڑے لیکن ایسا کرنے
پہلے وہاں کے مزدوروں کو بتلایا تک نہ گیا۔ اور نہ کبھی مجوزہ تبدیلی کے بارے میں ان سے مشورہ
لیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں پر اسکا اچھا اثر پڑنے کی بجائے برا اثر پڑنے لگا۔ انہوں نے شکایتیں کرنا شروع
کر دیں کہ موجودہ روشنی انکی آنکھوں کو بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک آدھ باقاعدہ شکایت نامہ بھی افسران کی خدمت
میں پیش کر دیا گیا۔ جب مزدوروں کو اعتماد میں لے کر سب باتیں ان پر واضح کر دی گئیں تو انکی شکایات
خود بخود رفع ہو گئیں۔ اسی طرح ایک اور موقع پر کسی مزدور عورت نے اپنے افسر کے پاس شکایت کی
کہ انہیں جو کھانا ملتا ہے وہ اچھا نہیں ہوتا متعلقہ افسر نے اسکی بات سنی۔ اور اطمینان دلایا کہ وہ بنفس نفیس
تحقیق کر کے سب شکایات دور کر دے گا۔ چند دنوں بعد وہی عورت پھر اسکے دفتر میں شکریہ ادا
کرنے کیلئے پہنچی کہ کھانا اب اچھا ہو گیا ہے۔ وہ خوش تھی کہ اسکے طفیل سارے گروہ کا فائدہ ہو گیا تھا
حقیقت یہ تھی کہ کھانے میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ افسر نے فقط اسے یہ احساس دلا دیا تھا
کہ وہ بذات خود اس معاملہ کی جانچ پڑتال کرے گا اور یہ کہ وہ انہیں اپنا جیسا ایک انسان سمجھتا ہے لہذا انکی ہر
مشکل دور کرنا اسکا فرض ہے اور وہ اپنا فرض پورا کرے گا۔

پاکستان میں تجربات کی طرف سے غفلت

یہ تصور کر لینا کہ پاکستان میں اس قسم کے تجربوں کے نتائج مختلف ہونگے درست
نہیں یہ جواز پیش کرنا کہ یہاں حالات مختلف ہیں اور بھی قابل افسوس بات ہے۔ یہ کہنا گویا یہ بھول جانا
ہے کہ انسانی فطرت سبھی جگہ ایک سی ہے۔ البتہ ایک معاشرہ یا تمدن کو سامنے رکھ کر کسی دوسرے
معاشرے یا تمدن کے متعلق نتائج اخذ کرنا اور انہیں من وعن ایک ہی سانچے میں ڈھالنا کسی طرح درست
نہیں ہے اندھا دھند تقلید تو کسی حالت میں بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بار بار اس بات پر زور دیا
ہے کہ ہر معاشرے کی اپنی رسوم ہوتی ہیں جو اسکے لئے خاص معنی اور اہمیت رکھتی ہیں۔ اسلئے ذہانت
کا تقاضا یہی ہے کہ ہم جو کچھ ایک جگہ سیکھیں اسکو دوسری جگہ استعمال کرتے وقت کافی غور و خوض کر
لیں۔ اگر یہاں حالات مختلف ہیں تو ہمیں اس اختلاف کا تجزیہ کر کے سمجھنا چاہیئے اور پھر کوئی مناسب

اقدام کرنا چاہیے ماحول کی ناسازگاری کو محض "بہانے" کے طور پر پیش کرنا اور متعلقہ مسائل کے بارے میں چپ سادھ لینا تو نا قابلِ عفو جرم ہے اس رویے سے تو کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ احمد آباد (ہندوستان) کی اتیرا[1] مل میں ان تجربوں سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا گیا۔ جب وہاں نفسیاتی عوامل پیشِ نظر رکھے گئے جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تو اسکا ہر لحاظ سے اچھا اثر پڑا مثلاً جب مزدوروں کو آپس میں مشورہ کرنے کا موقعہ دیا گیا تو نہ صرف انکا اجتماعی حوصلہ بڑھ گیا بلکہ اس کا پیداوار پر بھی بہت خوشگوار اثر ہوا اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ ہو گئی۔ لاہور کے قریب دیہاتی عورتوں کی کئی جماعتیں کشیدہ کاری سے اچھے خاصے پیسے کما لیتی ہیں۔ ان عورتوں کو جب اپنا نمائندہ آپ چننے کی اجازت دے دی گئی اور منیجر سے بات چیت کرنے کا کام وہی ایک نمائندہ عورت کرنے لگی تو ان کا کام بہت بہتر ہو گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں انکا نمائندہ پورے گروہ کے مفاد سے غافل نہ ہو جائے ہر گروہ میں سے ایک عورت باری باری تنخواہ لیتے وقت یا منیجر سے بات کرنے وقت اسکے ساتھ رہتی تاکہ انہیں معلوم ہوتا رہے کہ منیجر سے کیا بات چیت ہوتی ہے منیجر کی خواہش تھی کہ ان عورتوں کو بیماری سے بچانے یا کسی دوسرے بُرے وقت پر امداد دینے کے لئے کوئی بیمہ کی سکیم شروع کی جائے مگر ان عورتوں نے اسکے متعلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی اپنی مدد کرنے کی ایک اسکیم بنائی ہوئی تھیں۔ جو کامیاب طریق پر چل رہی تھی۔ دنیا میں ہر جگہ دیہاتی اپنے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن جوں جوں صنعتی ترقی ہوتی جاتی ہے یہ گروہ بندی ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہے اور اجتماعی حوصلہ بھی پست ہو جاتا ہے۔

موجودہ صنعتی دور اور طرزِ زندگی میں ہمیں ایسے موقعے پیدا کرنا ہونگے جنمیں لوگ خود بخود اپنی گروہ بندی کر سکیں۔ جہاں جہاں اس قسم کی جمہوریت کو آزمایا گیا ہے وہاں تعجب انگیز حد تک کامیاب نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کارخانے دار، دفتر کا حاکم یا استاد طالب علموں یا کاریگروں کے خود ساختہ گروہوں کو توڑنے کی سعی کرتا ہے تو وہ بہت بڑی غلطی کرتا ہے۔ اگر وہ اکٹھے ہو جائیں تو ہو سکتا ہے

1. ATTIRA Mills.

وہ کبھی کبھار مشکلات بھی پیدا کردیں خصوصاً جب اس کا اپنا رویہ غیر منصفانہ ہو جائے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس گروہ بندی کے بغیر انکے حوصلے بلند نہیں ہو سکتے۔ جو مزدور ایک دوسرے کا بچاؤ نہ کریں یا اپنے گروہ کے وفادار نہ ہوں وہ کارخانے کے ساتھ کیا وفاداری کریں گے؟

کسان میں انفرادیت

کسانوں کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ کیا وہ انفرادیت کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ کیا ان میں سے ہر شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی زمین کی خود دیکھ بھال کرے۔ یا اگر اس کا جی چاہے تو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ پانی اور مویشیوں کے لئے لڑ بھی پڑے۔ ان میں زر، زمین اور زن کے جھگڑے تو اسقدر عام ہیں کہ ضرب المثل بن گئے ہیں۔ عام طور پر وہ ماسوائے اپنے خاندان کے لوگوں کے اور کسی کے ساتھ مل کر کام نہیں کرنا چاہتا۔ ان کسانوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ عام طور پر ان کا معاشرتی گروہ فقط انکے اپنے خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان حالات میں گروہ بندی یا اجتماعی حوصلہ انکے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

لیکن یہ تو ہمارے کسان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ پاکستانی کسان گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور گاؤں کی زندگی گروہی زندگی ہوتی ہے۔ گاؤں والوں کی بہت سی مشکلات مشترکہ ہوتی ہیں۔ انہیں اچھی سڑکوں اچھی منڈیوں اور آبپاشی کے اعلےٰ انتظام کی ضرورت ہے۔ اور سیلاب کے وقت ایک دوسرے کی مدد درکار ہوتی ہے۔ شادی اور موت کے موقعوں پر ایک دوسرے کی مدد ہی انہیں ساہوکار کے پنجے سے بچا سکتی ہے۔ انکی تفریحات بھی مشترکہ ہوتی ہیں چوپال پر بیٹھ کر باہم گپ الاپ اور گاؤں بھر کے قصے نہ ہوں تو گاؤں کی زندگی بے مزہ ہو جائے۔ یہی انکی معاشرتی ضروریات ہیں جو اگر پوری نہ ہوں تو بے حد اقتصادی نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کسان کی معاشرتی زندگی جامد ہو جائے تو سارے ملک کا مستقبل خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ اسلئے اسکی قوتوں کے اظہار کے لئے اسکے اجتماعی حوصلہ کو بلند رکھنے کے لئے نئی نئی راہیں نکالنا چاہیں نئے گروہ تشکیل کرنے چاہیں اور ایک نئی اجتماعی روح دوڑانا چاہیے۔ یہ کام نصیحتوں کے ذریعے تو نہیں ہو سکتا اس کے لئے تو ہمیں ایسے سازگار اقتصادی معاشرتی اور سیاسی حالات پیدا کرنے

ہونگے جو کسانوں کو مناسب گروہ بنانے میں مدد دے سکیں۔ جب تک کسان بھرپور گروہی زندگی
بسر نہ کریں گے، آسودہ اور خوش حال نہ ہونگے پیداوار کے بڑھنے کی توقع رکھنا فضول ہے۔

جوں جوں زراعت زیادہ ترقی یافتہ طریقوں پر ہونے لگے گی زیادہ اچھے بیج کھاد اور
جانوروں کی ضرورت پڑے گی نسبتاً بہتر آبپاشی پر زور دیا جائے گا۔ زمینیں سائنٹفک طریقہ پر
جوتی جائیں گی مگر یہ سب کام اس صورت میں کئے جا سکتے ہیں۔ جب کسان آپس میں ایک دوسرے
سے تعاون کریں، اور حکومت کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اگر دیہاتی لوگ حکومت کے عملے
کو صرف لگان وصول یا انکے چھوٹے چھوٹے قصوروں پر سزا دینے والے افسر سمجھیں تو بھلا انکے
ساتھ وہ تعاون کیسے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ پولیس سے ڈرتے ہیں تو ان سے راہ و رسم کیسے
بڑھائیں گے۔ دیہات سدھار کا وہی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے جس کا مرکزی اصول یہ نہ ہو کہ "آؤ
کسانوں کی مدد کریں" بلکہ یہ کہ "آؤ کسانوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے سے
تعاون کرنے میں مدد دیں۔ کسانوں کو سال کا بیشتر حصہ بیکار گذارنا پڑتا ہے اس لئے انکے یہاں
باعمل معاشرتی زندگی کی ترویج کے امکانات بہت وسیع ہیں۔

صنعت و حرفت میں جب پیداوار وسیع پیمانے پر بڑھنے لگے تو ہر آدمی کو اسکی محنت کے برابر
اجر دینا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ایک موٹر، ایک انجن یا جوتوں کا ایک صرف جوڑا فقط تنہا ایک مزدور یا گنتی
کے دو چار کاریگر تو نہیں بناتے۔ اسلئے اس بات کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی ایک
چیز کے بنانے میں ایک خاص مزدور کا کتنا حصہ ہے۔ بڑے پیمانے کے کاروباروں کا نظام اب
بالکل حکومت کے بڑے بڑے دفتروں کی طرح ہو گیا ہے جن میں گروہی جذبہ اور باہمی تعاون
کا ہونا بہت ضروری اور اہم ہے۔ پیداوار کا انحصار انفرادی قوت اور ہنر کی بجائے اجتماعی کوشش
اور مزدوروں کے باہمی اشتراک پر زیادہ ہوتا ہے۔

ہمارے نظام تعلیم کا ایک نقص

ایک بار پھر ذرا اپنے نظام تعلیم پر نظر ڈالیے جہاں گروہی
جذبے کی طرف سے بے پروائی برتی جا رہی ہے

اگر پرنسپل اساتذہ کے نام محض احکام جاری کیا کرے اور استاد طلبا کو صرف لکچر دیا کریں اور کبھی ایک دوسرے سے گفتگو نہ کریں تو ایسی تعلیم یقیناً ناقص ہوگی چاہے وہ بظاہر کتنی ہی کامیاب نظر کیوں نہ آئے کھیل کے میدان میں لڑکے اپنی صلاحیتوں کو ایک گروہ کے رکن کی حیثیت سے بڑھاتے ہیں مگر جماعت میں وہ اکثر استاد سے سنی ہوئی یا کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں کو رٹ لیتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں وہ اپنے کالج، جماعت یا ہوسٹل کی کسی ٹیم کے رکن ہوتے ہیں، ان کے مقاصد بھی ایک ہوتے ہیں۔ میچ میں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھیلنا ہوتا ہے ورنہ وہ میچ ہار جاتے ہیں کھیلوں کی تربیت دینے والا استاد وہی اچھا سمجھا جائے گا جو کھلاڑیوں کے اندر گروہی جذبہ پیدا کر سکے اور انہیں ایک ساتھ مل کر کھیلنا سکھا سکے جماعت میں استاد عام طور پر گروہ بندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور لڑکوں کے اندر گروہی جذبے کو پیدا کرنے کی کوئی خاص سعی نہیں کرتے ہر لڑکے کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ استاد کی بات سنے اور اپنے ساتھی سے باتیں نہ کرے چنانچہ لڑکے فقط استاد کی باتیں سنتے ہیں اور خود آپس میں مل کر پڑھنے اور لکھنے کا کوئی خاص پروگرام نہیں بناتے۔ ہم چھٹے باب میں پڑھ آئے ہیں کہ اگر ایک لڑکا کسی دوسرے لڑکے کی مدد کرتا ہے یا اس سے مدد لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ کبھی استاد کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کر دیتا ہے تو استاد اسکا شکریہ ادا نہیں کرتا ہے لہذا اگر طلبا کا حوصلہ پست ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ان حالات کو درست کرنا اور اس قسم کی خامیوں کو ٹھیک کرنا آسان نہیں ہے۔ استادوں کے درمیان گروہی جذبہ کو تو پیدا کیا جا سکتا ہے گاہے بگاہے سارے اسٹاف کی میٹنگ کی جا سکتی ہے مختلف شعبوں کے جلسے کیے جا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبہ کا جائزہ لے سکیں۔ بالخاص خاص مشکلات کے لئے الگ کمیٹیاں بنا جا سکتی ہیں اسی طرح استادوں کو اگر اپنے کام اور اپنی بہبودی کے متعلق باتوں کا فیصلہ کرنے کا حق دے دیا جائے تو ان میں از خود کام کرنے کی صلاحیت بہت تیز ہو جاتی ہے مگر جہاں تک طالب علموں کا تعلق ہے حالات کو درست کرنا خاصا مشکل کام ہے کیونکہ یہاں ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ انفرادی کامیابی اور محنت کی بنا پر تقسیم کیے جاتے ہیں تاہم کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا جا سکتا ہے

مثلاً ہر جماعت اپنے چند نمائندے منتخب کرسکتی ہے جو جماعت کی مخصوص دقتوں کے متعلق اساتذہ سے بات چیت کرسکیں۔ اور پڑھائی کو بہتر بنانے کے بارے میں تدابیر سوچ سکیں مصنفین کتاب میں سے ایک کے پاس ایک بار ایک جماعت کے دو نمائندے آئے تاکہ لڑکوں کو انکے درس کے دوران جو مشکلات پیش آرہی تھیں ان سے آگاہ کریں اور انہیں بتائیں کہ وہ کس طرح دور کی جاسکتی ہیں۔ طالب علموں نے اپنی طرف سے چند نہایت اچھے مشورے بھی دیئے اور مصنف کی باتیں بھی توجہ سے سنیں جاتے ہوئے انہوں نے یہ کہا کہ اگر انکی جماعت میں سے کسی کا کام بھی تسلی بخش نہ ہو کرے تو انہیں بتا دیا جائے۔ انہوں نے بھی اپنی طرف سے مصنف کو یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ انکے کسی ساتھی کا کام غیر تسلی بخش نہ ہوگا اور وہ سب مل کر ایک دوسرے کو محنت کرنے میں مدد دیں گے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد جماعت کے سب لڑکوں کا کام بہت بہتر ہو گیا۔

منصوبہ بندی

جماعت میں "منصوبہ بندی" کے طریقے سے بھی کام لیا جاسکتا ہے اس طریقے میں کسی مضمون کے مختلف حصے مختلف لڑکوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں پڑھ کر اور اچھی طرح سمجھ کر ایک دوسرے کو سمجھا دیں۔ جماعت میں یا کہیں کسی دوسری محفل میں اگر کسی مسئلے پر نہایت عمدہ بحث مباحثہ کرانا مقصود ہو تو آجکل ایک اور طریقہ استعمال کیا جارہا ہے۔ اسے "غوغائی مجلس"[1] کہتے ہیں۔ اس مجلس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے پر گفتگو کرنی ہو تو جو گروہ حصہ لے رہا ہو اسے پانچ پانچ چھ چھ اشخاص کی ٹولیوں میں بانٹ دیا جاتا ہے ہر شخص کو بولنے کا موقعہ دیا جاتا ہے تاکہ پھر ایک چھوٹے گروہ کے بحث مباحثے کے نتائج کو پورے گروہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور مزید تبادلہ خیالات کیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو غوغائی[2] اسی لئے کہتے ہیں کہ جب ایک کمرے میں پانچ یا چھ ٹولیاں باتیں کر رہی ہوں تو بھینی بھنبھناہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔

گروہی فکر کو ابھارنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے جسے "مسئلہ حل کرنے والے گروہی مباحثے"[3] کہا جاتا ہے مثلاً ہم تین تین آدمیوں کی دو ٹولیاں بنالیں اور انہیں ایک ہی مسئلے پر اپنے اپنے خیالات

1. Buzz Session. 2 Buzz. 3 Problem-solving panel discussion.

کا اظہار کرنے کی دعوت دیں لیکن اسمیں اہتمام یہ کریں کہ جب پہلی ٹولی اظہار رائے ختم نہ کرلے دوسری
ٹولی وہاں نہ آئے۔ اُسے اس جگہ آنیکی اجازت اس وقت دی جائے جب پہلی ٹولی کے ممبر بحث
ختم کر چکے ہوں۔ اسکے بعد عام سننے والے یا جج یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس ٹولی نے زیادہ اچھی بحث کی
اور مسئلے کو سمجھنے اور سلجھانے میں کون زیادہ کامیاب رہا۔ گروہ کے ممبروں کا ایک دوسرے کے
ساتھ تعاون از حد ضروری ہے اسی سے کوئی خاص مسئلہ یا زندگی کے مختلف مسائل سلجھائے جا سکتے
ہیں جو نظام تعلیم متحدہ عمل[1] اور اجتماعی کوششوں کو اہمیت نہیں دیتا اور انکی طرف سے غفلت برتتا ہے وہ
کبھی اچھی تعلیم کو فروغ نہیں دے سکتا۔ ہمارے ہاں جماعتوں میں یا اصلاح و مشورہ کے کمروں میں غوغائی
مجلس کا طریقہ کا زیادہ کامیاب نہیں رہتا کیونکہ یہاں لمبے لمبے بنچ رکھے ہوتے ہیں یا انمیں اس قسم
کی کرسیاں ہوتی ہیں جو چھوٹے چھوٹے گروہ بنانے کے لئے جو آسانی ادھر ادھر کھسکائی نہیں جا سکتیں
گویا یہاں مجلس بس گفت و شنید تو منعقد ہو سکتی ہے لیکن تفکر کرنے کا موقعہ حاصل نہیں ہو
سکتا۔ پھر دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ اس طریقہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے مسلسل مشق کی ضرورت ہے
ہماری ساری تعلیم و تربیت اسکے بالکل مخالف سمتمیں جا رہی ہے۔ خود اساتذہ کو خود پرستی کی تربیت ملتی
ہے انہیں یہ فکر کیوں ہو کہ شاگردوں کو باہمی تعاون کی تعلیم ملنی چاہیئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں یہ بھی
معلوم نہیں کہ یہ تعلیم کیونکر دی جائے اور حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اوقات درس کے علاوہ تو وہ لڑکوں
کو ایسی تفریحی اور تعلیمی سیر کے لئے لے جاتے ہیں جہاں متحدہ عمل کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور
جنکی تعلیمی اہمیت بھی مسلم ہوتی ہے مگر اسی جذبہ کو جماعت کے اندر بتدریج دینا انہیں مشکل نظر آتا ہے
حالانکہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آغاز کار کرنے کی ضرورت ہے کبھی کبھار جماعت میں چھوٹی چھوٹی
بحثیں ہونا چاہئیں۔ طالب علموں کو درجہ میں سوال پوچھنے کی ترغیب دلانا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ
اس بات کا بھی التزام کرنا چاہیئے کہ طالب علم ہی ایک دوسرے کے سوالوں کا جواب دیا کریں۔

1. Team Work.

زندگی میں نکھار

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کارکردگی اور پیداوار میں اضافہ ملک و قوم کی بقا اور مضبوطی کے لئے ضروری ہے ورنہ پیداوار خود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہمارا نصب العین تو یہ ہے کہ زندگی میں نکھار پیدا ہو انسانی شخصیت کی قدر و منزلت بڑھے اور وہ صحت مند طریق پر نشو و نما پائے صحیح معنوں میں روحانی قدریں یہی ہیں۔ ہم بخوبی دیکھ چکے ہیں کہ پیداوار کا مسئلہ بھی اس وقت تک نہیں سلجھ سکتا جب تک ہم انسانوں کے ساتھ انسانوں کا سلوک کرنا سیکھ لیں انہیں مشینیں نہ سمجھیں بلکہ اپنی طرح گوشت اور پوست کے انسان سمجھیں اور ہر گھڑی اسکے متوقع نہ رہیں کہ وہ ہماری عزت کیا کریں ہمیں بھی انکا احترام کرنا چاہیئے اور ان سے خوشگوار مراسم استوار کریں معاشی مسائل کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا مزدوروں میں باہمی قدر و عزت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے گھروں میں سماجی زندگی میں حکومتی اداروں میں اور مذہبی عبادت گاہوں میں ایک دوسرے کے لئے اس محبت اور عزت و احترام کے جذبات کو فروغ دینے کی کوشش کریں گھر کے اندر باہمی قدر و عزت کے مسئلہ پر ہی غور کر لو۔ ایک روایاتی قسم کے زمیندار کے گھر میں باپ کو حاکم مطلق کی حیثیت حاصل ہوتی ہے بیٹوں کو رہن بھی باپ سے ہی ملتی ہے۔ انکو کھیتی باڑی کی تعلیم بھی تجربہ کار بوڑھا باپ ہی دیتا ہے بچپن سے یہ بچے باپ کو دانش مندی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

صنعتی ترقی کا معاشرتی رشتوں پر اثر

پاکستان کا معاشرہ بنیادی طور پر ایک زرعی معاشرہ ہے۔ اور یہاں عام طور پر گھریلو تعلقات کا دارومدار بھی زرعی طرز زندگی پر ہے لیکن صنعتی ترقی کے ساتھ معاشرتی تبدیلیوں کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے۔ ماں باپ اور بچوں کے رشتے جنکا انحصار باپ کی عظمت پر ہوتا ہے کمزور ہوتے جاتے ہیں شہروں میں نوکریاں ملنے لگتی ہیں بیٹیوں اور کہیں کہیں بیٹوں کو والدین کی مدد کے بغیر اور انکے اثر سے آزاد روزی کمانے کے مواقع مل جاتے ہیں تعلیم میں ترقی کے سبب اسکولوں میں نئی نئی چیزیں پڑھائی جانے لگتی ہیں اور بچے کئی ایسی باتیں سیکھ لیتے ہیں جنکا انکے والدین کو قطعاً کوئی علم نہیں

ہوتا۔ اسکے علاوہ وہ اب وہ اپنا کام اپنے باپ سے نہیں سیکھتے بلکہ ان کارخانوں اور دفتروں میں سیکھتے ہیں جہاں وہ ملازمت کرتے ہیں لیکن ان حالات میں بھی کچھ تو روایات اور رسوم کی بنا پر اور کچھ اس اخلاقی تعلیم کے سبب جو باپ بچوں کو ابتدا ہی میں دیتا ہے اسکی عظمت و برتری قائم رہتی ہے کبھی کبھار محض باپ کے اثر و رسوخ سے ہی بچوں کو اچھی ملازمت مل جایا کرتی ہے۔ اسلئے وہ اسکی عظمت کے قائل رہتے ہیں۔ اور اسی طرح بعض اوقات ایک فرسودہ نظام تعلیم باوجود قابل اصلاح ہونے کے قائم رہتا ہے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ قومی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جوں جوں صنعت و تعلیم ترقی کرتی ہے والدین کے لئے بچوں کو محض دب کر قابو میں رکھنا مشکل ضرور ہوجاتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا معاشی ترقی سے گھریلو رشتے واقعی کمزور ہوجاتے ہیں؟ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو گھریلو زندگی کے رشتوں کی جڑیں تو انسانی فطرت میں دور تک پھیلی چلی گئیں ہیں۔ اور اس ہر آن منقلب دنیا میں تو ان مضبوط اور سنگین نفسیاتی رشتوں کی اہمیت اور ضرورت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جس گھر میں ہر فرد کی شخصیت قابل احترام سمجھی جاتی ہو۔ جہاں والدین اور بچے ساتھ مل کر ہنستے کھیلتے سوچتے اور فیصلے کرتے ہوں جہاں افہام و تفہیم کی ہمدردانہ اور صلح جویانہ فضا ہو اور جمہوری قدروں کی پذیرائی ہو وہاں بہترین معاشرہ کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے اسلئے اگر ہم سائنسی ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی گھریلو زندگی کو زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانا چاہیئے۔

جمہوریت یا آمریت

گھر کے بعد حکومت کا نمبر آتا ہے۔ ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ جمہوری طرزِ حکومت کی کیا ضرورت ہے آمریت کیوں نہ ہو طاقت ایک آدمی یا ایک گروہ کے ہاتھوں میں کیوں نہ سونپ دی جائے عوام کو اسکا اہل کیوں قرار دیا جائے؛ نفسیات کے ماہر اس سوال کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت دولت یا زمین کی طرح قابل تقسیم شے نہیں ہے اور نہ وہ یوں بانٹی جاسکتی ہے۔ کہ اگر ایک کے پاس زیادہ ہے تو دوسرے کے پاس نسبتاً کم ہونا چاہیئے۔ قوت کے حقیقی معنی خواہشات کو پورا کرنے

کی قابلیت ہے ممکن ہے ایک ایسا طبقہ ہو جسمیں ہر فرد صاحب "قوت" ہو اور دوسرے گروہ کے ایک فرد میں بھی یہ "قوت" نہ ہو۔ آج کی دنیا میں "قوت" کے لئے تنظیم کی خاص ضرورت ہے مثلاً اگر چند بچوں کو کسی بڑے "کیک" کے لئے جھگڑنے کی کھلی اجازت دیدی جائے تو ہو سکتا ہے کہ آپس کی چھینا جھپٹی میں کیک ضائع ہو جائے اور کسی کو کچھ نہ ملے۔ اور اسکا بھی امکان ہے کہ چند طاقتور بچے سالم کیک ہتھیالیں گو کھا نہ سکیں اور دوسروں کے حصے میں اسکا چھوٹا سا ریزہ بھی نہ آ سکے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ دوسرے بچے شور مچاتے رہیں اور طاقتور بچے بیٹھ کر اطمینان سے کیک نہ کھا سکیں۔ اگر ان میں سے کوئی طاقتور بچہ اپنے آپ کو ڈکٹیٹر بنا لے اور تقسیم کا کام اپنے ہاتھ میں لے لے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہر بچے کو اسکا جائز حصہ دے کر خوش کر دے یا فقط اپنے حواریوں میں ہی سارا کیک تقسیم کر دے۔

سیاسی قوت نہ تو کبھی صرف ایک ہی آدمی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور نہ اسے عوام میں برابر تقسیم کیا جا سکتا ہے کوئی آمر یا ڈکٹیٹر محض جسمانی طاقت سے حکومت نہیں کر سکتا بلکہ اسے تسلط قائم رکھنے کے لئے عوام یا کم سے کم اپنے خاص حواریوں کی مدد ضرور لینا پڑتی ہے۔ جب وہ اپنا اقتدار کھو بیٹھتا ہے تو اسکی سیاسی قوت بھی ختم ہو جاتی ہے یوں تو ہر آدمی کا ایک ووٹ ہوتا ہے مگر ووٹ کی یکسانیت انکے اثر و رسوخ کو تو یکساں نہیں بنا سکتی۔ کچھ لوگ اپنی تعلیم معاملہ فہمی یا دولت کے سبب دوسروں کی نسبت زیادہ بارسوخ ہو جاتے ہیں۔ اسلئے سیاسی قوت کی برابر تقسیم بڑی حد تک ناممکن ہے۔

کسی سیاسی نظام کو خواہ وہ آمریت ہو یا جمہوریت اچھا یا برا کہنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ نظام عوام کی طاقت بڑھانے انکی شخصیتوں کو صیقل کرنے، انکی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے اور انکی خواہشات کو پورا کرنے میں کس حد تک معاون ہوتا ہے۔ انسان کی خواہشات ہمیشہ کارآمد تو نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات تو انسان خود نہیں سمجھتا کہ کونسی چیز اسکے لئے مفید ہوگی اور کونسی غیر مفید یا اسے وہ کسطرح حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں آمریت لوگوں کو اس بات سے آگاہ کر دے کہ انکی بھلائی کس چیز میں مضمر ہے اور کونسی تعلیم انکے لئے موزوں ہے اور وہ اپنی زندگی کو کیونکر منضبط اور منظم رکھ سکتے

ہیں تو یقیناً ایسی آمریت اس جمہوریت سے کہیں بہتر ہے جس میں لوگوں کو آزادانہ ووٹ دینے کا حق تو حاصل ہو لیکن اصل حالات سے انہیں بے خبر رکھا جائے۔ اور جہاں رائے عامہ کی باگ ڈور چند خود غرض اور طاقت ور سیاسی آدمیوں کے ہاتھ میں ہو کیونکہ اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ اچھی آمریت وہی ہے جو جلد سے جلد موزوں طریقوں پر جمہوریت کے لئے راستہ ہموار کر دے اور خود موت سے ہمکنار ہو جائے۔ لیکن کیا آمریت یوں خود کشی پر تیار ہو گی؟

فطرت انسانی اور معاشرتی ترقی کے ان دو نظریوں کو دیکھنا چاہیے جن میں سے ایک نظریے کے مطابق بیشتر انسان پیدا ہی اسلئے ہوتے ہیں کہ محکوم اور غلام رہیں، وہ کبھی اپنے لئے ٹھیک فیصلے نہیں کر سکتے۔ جمہوریت کا مطلب ہجوم کی حکومت یا افراتفری کے سوا اور کچھ نہیں اس نظریے کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ معاشرتی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب حکومت چند ایسے طاقتور آدمیوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو عوام سے مختلف ہوں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانیت کی ارتقا باہمی قدر و منزلت اور ایک دوسرے سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ انسان اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب وہ خود اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ معاشرتی ترقی کا مطلب شائستہ اجتماعی جذبہ کی نشو و نما ہے۔

ماہرین نفسیات اور اکثر و بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ دوسرا نظریہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ اسکی بنیادیں روحانی قدروں پر قائم ہوتی ہیں اور پہلے نظریے کی بہ نسبت زیادہ قومی استحکام کی ضامن ہیں آپ پوچھ سکتے ہیں کہ پھر اس نظریے کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جاتا۔ اسکے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ (۱) ہم میں سے اکثر لوگوں کو اجتماعی کوشش یا ضبط نفس کی بہت کم تربیت دی جاتی ہے زیادہ تر فرماں برداری اور اطاعت کی تلقین و تعلیم ہوتی ہے۔ جو لوگ ایک بار حکومت اور آمریت کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں وہ دوسروں کے ساتھ جمہوری سلوک ذرا مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ جو بچہ اپنے باپ کی عزت اسکی قوت دلوانائی یا اسکے خوف کے باعث کرتا ہے بہت ممکن ہے وہ صرف دوسروں پر اپنا رعب قائم کرنے کے لئے جلد از جلد بڑا ہونے کا آرزو مند ہو۔

ایک مظلوم بہو جب ساس بنتی ہے تو عام طور پر وہ بہو کے ساتھ بُرا ہی سلوک کرتی ہے جب ہمیں اپنی کمتری کا احساس دلایا جاتا ہے تو ہم اپنی "برتری" جتا کر اسکا "ازالہ" کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر آدمیوں کے لئے دوسروں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا۔ انکے نقطۂ نظر کو بھی صحیح سمجھنا یا انکی تجاویز اور تنقید کو قبول کرنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔ بایں ہمہ انسان اپنے قدیم مسلک و مشرب سے جدا اور قدیم روایات اور ماحول سے گریز کر سکتا ہے کیونکہ جمہوریت آمریت کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوتی ہے اسلئے ہمیں امید رکھنا چاہیئے کہ جو بچے جمہوریت پسند گھروں میں پلتے ہیں وہ آئیندہ چل کر معاشرے کے اچھے راہنما ثابت ہونگے۔ اور جمہوری جذبہ کو فروغ دیں گے لیکن ہمارا یہ فرض ہے کہ ان اسباب کا مطالعہ کریں جو صحت مند اجتماعی جذبہ کو جلد ترقی کرنے سے روکتے ہیں۔ آخر اس جذبہ کی رفتار ترقی اتنی سست کیوں ہے؟

فطرت انسانی کے متعلق دوسرا نظریہ جو ہم نے پیش کیا تھا اسکے عمل میں نہ آنے اور کامیاب نہ ہونے کا ایک سبب ہم دیکھ چکے اب اسکے دوسرے سبب پر غور کرنا چاہیئے۔ بعض لیڈر اپنے حلقہ اثر کے لوگوں میں خود ضبطی۔ اجتماعی کوشش، خود سے کام کرنے یا خود سے صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت کو موثر بنانے کے لئے انکے اختیارات کچھ وسیع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس انہوں نے مناسب اقدام کر دیا ممکن ہے اسکا تھوڑا بہت اچھا اثر پڑے اور وہ کسی حد تک یہ سمجھ جائیں کہ اختیارات کو آزادانہ طریق پر استعمال کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں لیکن آزادی کا صحیح مفہوم سمجھانے کے محض اختیارات کا وسیع کر دینا کافی نہیں ہے۔ یوں "آزادی دے دینے سے" تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا کہیں آزادی یوں دی جاتی ہے؟

موثر راہنمائی

معاشرتی نفسیات کے مشہور ترین تجربوں میں سے ایک تجربہ وہ بھی ہے جہاں لڑکوں کے گروہوں میں تین مختلف قسم کی راہنمائی کا موازنہ کیا گیا لڑکوں کے ان گروہوں کو نقاب بنانے سے دلچسپی تھی۔ ایک گروہ کا قائد اپنے لڑکوں کے

1. Compensation.

ساتھ آمرانہ سلوک کرتا تھا اس نے اپنے گروہ پر سخت قسم کی پابندیاں قائم کر رکھی تھیں کسی کو اس کے احکام کے خلاف جانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے گروہ کے لیڈر نے سب کام گروہ کے ممبروں پر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ جس طرح چاہتے کام کرتے۔ اگر کبھی اسکی مدد کی ضرورت پڑتی تو وہ خاطر خواہ مشورہ دے دیتا بہرحال اس گروہ کو کافی آزادی حاصل تھی تیسرے گروہ میں لیڈر بھی ایک تجربہ کار ساتھی کی حیثیت سے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ وہ سب اکٹھے مل کر منصوبہ بندی کرتے اور تنظیم کار میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تینوں گروہوں کے نتائج کا بغور مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تیسری قسم کی راہنمائی سب سے اچھی اور موثر تھی گروہ پر قطعی تسلط رکھنے یا اسے مکمل آزادی دے دینے سے وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو انکے ساتھ ایک خاص کام کر کے حاصل ہوئے تھے۔

اجتماعی کوشش کے جذبے کو صحیح طریق پر رائج کرنے سے بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدائی نتائج تسلی بخش نہ ہوں تو اسمیں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہر نئی عادت شروع شروع میں عجب بے ڈھنگی اور مشکل نظر آتی ہے۔ اور اسے پوری طرح آزمائے بغیر چھوڑ دینا اور پرانے طریق کار کو پھر سے اپنا لینے میں ہی سلامتی تصور کی جاتی ہے۔ ان طالب علموں کی حالت کا اندازہ لگائیے جنہیں کبھی ذاتی طور پر غور و فکر کرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا ایک استاد انہیں اپنے فیصلے آپ کرنے اور خود اپنی رہنمائی کرنے کی ترغیب دلاتا ہے ممکن ہے شروع شروع میں انکی سمجھ میں کچھ نہ آئے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ انکا بیشتر وقت فضول ضائع ہو جائے۔ اور وہ استاد سے درخواست کریں کہ وہی انکی پوری پوری مدد کیا کرے اگر استاد ایسے موقعوں پر طالب علموں کی درخواست منظور کر لے اور خود انکی ہر طرح سے رہنمائی کرنے لگے تو یقین ہے کہ طالب علم کچھ سیکھ سکیں گے لیکن اگر استاد صبر و تحمل سے کام لے اور اپنا طریق کار نہ بدلے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے کامیابی نہ ہو اور طلبا اپنی مدد آپ کرنے میں اسقدر ماہر نہ ہو جائیں کہ استاد اور شاگرد اپنی ابتدائی ناکامی اور گرفت بھول جائیں اسی طرح اگر کسی دفتر یا کارخانے کا افسر اعلیٰ اپنے ماتحتوں سے تجاویز مانگے تو ہو سکتا ہے کہ انکی

طرف سے پیش کردہ تجویزیں ناقابلِ عمل بھی اور وہ انہیں بے کار سمجھ کر آئندہ کبھی ان سے کچھ نہ پوچھے یا ممکن ہے جب ملازمین سے یہ پوچھا جائے کہ کارکردگی کو بڑھانے کے لئے کیا کیا جائے تو وہ آپس میں بیٹھ کر یہ سوچنا شروع کر دیں کہ اپنے لئے کیا کیا آسانیاں حاصل کی جائیں اگر کام انکے لئے دشوار ہوگا تو یقیناً انکا فائدہ اسی میں ہے کہ اسے آسان بنایا جائے لیکن اگر وفا کی جذبے کی نشوونما کے سلسلے میں انکا ہاتھ بٹایا جائے تو وہ بہت جلد کام کو محض آسان کرنے کی تدبیر نہیں کریں گے بلکہ یہ سوچیں گے کہ اسے بہتر سے بہتر طریق پر کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

محیطی اثرات

ماہرین نفسیات "محیطی اثرات"[1] پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ تخریبی[2] اور تعمیری[3]۔ دونوں قسم کے اثرات بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہتے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ حالات یا تو بدسے بدتر ہو جاتے ہیں یا بہتر سے بہتر' اگر لوگوں پر خوف طاری کر کے حکومت کی جائے تو انکی ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے' اور جب ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے تو ان پر اسطرح حکومت کرنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح عوام پر سختی سے قابو رکھنے کے سبب ان کی قوت خود اختیاری زائل ہو جاتی ہے' اسکے بعد لازماً نگرانی اور بھی سخت کرنا پڑتی ہے یہ اصول صرف اسی ایک جگہ پورا نہیں اترتا بلکہ زندگی کے اور دوسرے حالات میں بھی اسی طرح صادق آتا ہے۔ فرض کیجیے لوگوں کے دو گروہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اگر ایک گروہ میں فرقہ پرستی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دوسرے فرقہ میں بھی فرقہ پرستی بڑھ جائے گی۔ دونوں گروہوں کے اندر آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے لئے نفرت و حقارت بڑھتی اور ترقی کرتی رہے گی۔ جب کسی ملک میں ایک بار خفیہ پولیس قائم ہو جاتی ہے تو اسکی طاقت اکثر بڑھتی ہی جاتی ہے کیونکہ پولیس کا بھی اپنا ایک گروہی جذبہ ہوتا ہے' اسکے اندر اپنی اہمیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور اپنی طاقت بڑھانے کی خواہش مضبوط ہو جاتی ہے چنانچہ لامحالہ خفیہ پولیس کے افسر حکومت کو ایسی رپورٹیں بھیجتے ہیں جس سے حکام کو یہ احساس ہو کہ ملک کے تحفظ کے لئے خفیہ پولیس کا ہونا ضروری ہے اور اسکی

1. circular effects. 2. vicious 3. constructive

قوت کو بڑھانا چاہیئے۔ ان حالات میں لوگ خود بخود خفیہ پولیس سے زیادہ خوف کھانے لگتے ہیں اور اسکی مخالفت کرتے گھبراتے ہیں۔ معاشرتی نفسیات کے ماہر انہیں تخریبی چکروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ انکو ختم کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

تعمیری چکر بھی اسی طرح چلتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ انکی حرکت تعمیری ہوتی ہے۔ اگر لوگوں پر ذمہ داریاں عائد کر دی جائیں تو وہ عموماً ان ذمہ داریوں کی سنبھالنے کے لائق ہو جاتے ہیں پھر ان ذمہ داریوں کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی برائیوں کا علاج مزید جمہوریت میں پوشیدہ ہے نہ کہ اسے ختم کرنے میں۔ اگر اس سے ہماری مراد یہی جمہوریت ہے تو یہ نظریہ صحیح ہے۔ اگر ایک فرقہ کسی دوسرے فرقہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے تو قرین قیاس یہی ہے کہ دوسرا فرقہ جواباً پہلے سے زیادہ دوستانہ رویہ اختیار کرے گا۔

نظام تعلیم اور گورکھ چکر

یہی چکر جنکا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے ہمارے نظام تعلیم میں بھی پائے جاتے ہیں جب ایک بار امتحان میں غیر اصولی حرکات تعصب اور طرف داری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر یہ برائیاں پھیلتی ہی جاتی ہیں۔ ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ دوسرے ایسا کرتے ہیں، اسلئے اسے بھی اپنے بچاؤ کے لیے یہی کرنا پڑے گا۔ بے ایمانیوں اور سفارشوں کے متعلق مبالغہ آمیز کہانیاں اور طرح طرح کی افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ ایک طالب علم جو پہلے ہی نقل کرنے یا سفارش تلاش کرنے کی فکر میں ہو وہ آسانی کے ساتھ یہ یقین کر لیتا ہے کہ تھوڑی بہت نقل سب کرتے ہیں اور سبھی سفارش کے پیچھے دوڑتے ہیں اسی طرح جب ہر دوسرے تیسرے سال گذشتہ امتحانات کے سوال دہرا دیئے جائیں تو طلبا انہیں سوالوں کو یاد کرتے ہیں اگر انکے علاوہ یا ان سے ذرا مختلف سوال پوچھ لیئے جائیں تو شور مچ جاتا ہے کہ سوالات بہت مشکل تھے یا مقررہ نصاب سے باہر تھے۔ ممتحن اور طلبا دونوں اسی طرح الٹے چکروں میں پھنس جاتے ہیں طلبا طوطے کی طرح رٹنے کا سہارا لیتے ہیں اور آزادی فکر کی قوت کھو بیٹھتے ہیں اور انکی کامیابی

کا دارومدار حافظے پر رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آزادانہ طور پر سوچنے کی سعی کریں تو انکی قوت فکر کے بڑھنے کے امکان ہمیشہ روشن رہیں گے۔

معاشرتی تبدیلی اب معاشرتی تبدیلی کو لیجئے۔ ہم اسکے متعلق کچھ زیادہ تو نہیں کہیں گے صرف دو اصولوں کے مختصر سے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے۔ معاشرتی تعلقات اور اجتماعی حوصلے کے متعلق جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے، پہلا اصول اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ اصول صرف یہ ہے کہ معاشرتی طور پر ترقی کرنے کے لئے افراد پر اثر و رسوخ ڈالنے کی بجائے گروہوں کو متاثر کرنا چاہیئے۔ ایک فرد کی بجائے ایک گروہ کا نقطہ نظر بدلنا آسان ہے۔ کیا ایک فرد اپنے گروہ سے کٹ کر کمزور و بے آسرا محسوس نہیں کرتا۔ پچھلی جنگ عظیم میں حکومت برطانیہ نے غذا کی اہمیت اور کم یابی کے پیش نظر اس بات کا عورتوں میں عام پرچار کیا کہ اگر وہ اپنے کھانے کے اوقات اور عادات میں تبدیلیاں کر لیں تو انکا کھانا بھی بہتر ہو جائے گا اور ملک کی مدد بھی ہو جائے گی۔ آئے دن عورتوں کے سامنے اس مسئلے پر جامع اور پر مغز تقریریں کی جاتی تھیں، رفتہ رفتہ عورتوں نے ان تقریروں میں دلچسپی لینا شروع کر دی، خوراک کی تبدیلی کے جواز میں جو دلائل دیئے جاتے تھے بہت کم عورتیں انہیں بے معنی سمجھتی تھیں، اور شاید ان سے بھی کم عورتوں نے نئے کھانوں کا تجربہ کیا۔ اسکے بعد یہ التزام کیا گیا کہ خود عورتوں کے مختلف گروہ خوراک کے متعلق تبادلہ خیال کیا کریں اور جس قسم کی معلومات کی انکو ضرورت ہو وہ انہیں بہم پہنچائی جائیں۔ ان مباحثوں کا اثر یہ ہوا کہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی خوراک میں متعدد تبدیلیاں کر لیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ خوراک میں کفایت شعاری کا مسئلہ ان کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے، مردوں کا براہ راست اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اب انکے اندر اجتماعی جذبہ پیدا ہوا، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی انہوں نے تبدیلیاں نافذ کرنی شروع کر دیں۔ ہر عورت اپنے تئیں یہ محسوس کرنے لگی کہ حالات کا تقاضا بھی یہ ہے اور اچھا بھی یہی لگتا ہے کہ خوراک میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔ اگر انکے سامنے محض تقریریں ہی ہوتی رہتیں اور باہمی مباحثوں کیلئے سہولتیں نہ بہم پہنچائی جاتیں تو انکی معلومات میں اضافہ تو ضرور ہو جاتا مگر شاید انکے اندر مطلوبہ کفایت شعاری

اور "خوراک بچانے" کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوتی۔ اسی قسم کے دوسرے تجربوں کے قریب قریب ایسے ہی نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ نتائج صرف مباحثوں کے سبب بھی پیدا نہیں ہوتے۔ اصل چیز تو اجتماعی جذبہ ہے۔ اجتماعی جذبے سے بڑھ کر اجتماعی فیصلہ ہوتا ہے جس میں سارے کا سارا گروہ کوئی عملی اقدام اٹھانے کی ٹھان لیتا ہے اور کچھ کر گذرتا ہے۔ لکچر دینے یا فقط تلقین کرنے کا سلسلہ اسلئے جاری رکھا جاتا ہے کہ یہ ایک آسان اور رسمی طریقہ ہے نہ یہ کہ لوگوں کے کردار کو متاثر کرنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ ہے۔

معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم بجائے یہ سوچنے کے کہ کیا ہونا چاہیئے یہ دیکھیں کہ عملی دنیا میں کیا ہونا ہے کسی چیز کو تکمیل تک پہنچانے کی سعی کرنا چاہیئے اور پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہونا ہے اور اسے کس طرح مزید خوبی سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی کا نام عملی عمرانیات[1] ہے۔ عمرانیات اور معاشرتی نفسیات کے ماہر کسی بات کا محض مشاہدہ نہیں کرتے رہتے اور اس پر بحث مباحثہ کرتے ہیں بلکہ اسے عمل کرنے کے لئے وہ اصل حالات کا پورا پورا جائزہ لیتے ہیں اور پورے انہماک سے ان مشکلات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس سعی و کاوش میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ انکے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے نظریے اور طریق کار کے معائب اور محاسن پر غور کرتے ہیں اور انہیں اچھی طرح قابو میں لانے کی تدبیر کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر اس قسم کے جملے سُنے ہونگے کہ نظریاتی طور پر تو یہ بات درست ہے لیکن عملی دنیا میں اس سے کام نہیں چلتا لیکن حق تو یہ ہے کہ جو نظریہ عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اترے اسمیں کوئی خامی ضرور ہوتی ہے یقیناً اسمیں چند ضروری عوامل نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے عملی عمرانیات کے ماہر اپنے اپنے نظریے کو عمل کی بھٹی میں ڈال کر تپاتے ہیں اسکے کھرے اور کھوٹے ہونے کو پہچانتے ہیں۔ اگر انکے نظریات عملی دنیا میں بیکار ثابت ہو جاتے ہیں تو وہ انکو بدل ڈالتے ہیں۔ ذیل کی دو مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ مثالوں سے پوری بات اچھی طرح واضح ہو جائے۔

بھارت میں ایک تجربہ بھارت کے ایک ضلع میں پیداوار کو بڑھانے کی اشد ضرورت

[1] Action Sociology.

تھی۔ ماہرین زراعت کو یقین تھا کہ اگر کسان ایک خاص قسم کا بیج استعمال کریں تو پیداوار میں خاصا اضافہ ہو
جائے گا۔ کسانوں کو بھی ماہرین کی اس تجویز سے کچھ اتفاق تھا۔ اسلئے حکومت نے ضلع کی ایک
مرکزی دکان پر اس قسم کے بیجوں کا کافی ذخیرہ لاکر جمع کر دیا اور اعلان کیا کہ جس کو ضرورت ہو وہ وہاں
سے سستے داموں انہیں خرید سکتا ہے۔ دیہی امداد کے کارکنوں کو یقین تھا کہ جلدی سارے بیج فروخت
ہو جائیں گے۔ مگر چند دنوں بعد انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بہت کم کسانوں نے انہیں خریدا۔ کارکنوں کا
خیال یہ ہے کہ اگر بیج گھر گھر پہنچا دیئے جائیں کسانوں سے جا کر ملا جائے اور ان سے فرداً فرداً استعمال
کرنے کے لئے کہا جائے تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ مگر جس شخص کے سپرد یہ سارا کام کیا گیا تھا اس نے اس
تجویز کی مخالفت کی۔ اسکی خیال میں یہ طریقہ کار مفت کی دردسری مول لینے کے برابر تھی۔ اگر کسانوں کو
ضرورت ہوتی وہ خود بیج خرید لیتے۔ ضلع کے حاکم اعلیٰ نے کارکنوں کا ساتھ دیا کیونکہ اگر ساری
اسکیم ناکام ہو جاتی تو اسکی کارکردگی پر بھی حرف آتا۔ چنانچہ جب کارکنوں نے گھر گھر پہنچ کر کسانوں سے
بات چیت کی۔ تو انہیں نمایاں کامیابی ہوئی۔ دوسرے سال جس قدر بیج اس علاقے میں فراہم کیے
گئے وہ ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔ دیہی کارکنوں اور انکے نگران میں سے ایک تو درست
راہ پر ہو سکتا تھا لیکن مثال بالا سے ظاہر ہو گیا کہ اس قسم کی باتوں کا فیصلہ عام اصولوں پر بحث کر کے
نہیں کیا جا سکتا۔ کسی دلیل کی سچائی کا واحد ثبوت عمل اور تجربہ ہے۔ تجربے نے کارکنوں کی دلیل کو
بین طریق پر صحیح ثابت کر دکھایا۔ بات صرف اتنی تھی کہ کسانوں کی ایک بھاری اکثریت کو حکومت پر
بھروسہ نہ تھا۔ وہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے کہ حکومت بھی کبھی ان کے
فائدے کے لئے کوئی اسکیم تیار کر سکتی ہے۔ حکومت کے افسر فقط اپنا رعب جمانے کے عادی
ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کی خواہشات اور ضروریات کو کب مدنظر رکھتے ہیں؟ کسانوں نے جب
یہ دیکھا کہ حکومت کے بھیجے ہوئے کارکن انکی خاطر تکلیف اٹھانے کو تیار ہیں۔ انکی مشکلات کو اپنی
مشکلات سمجھتے ہیں تو حکومت کی طرف سے ان کا رویہ اور احساس بدل گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ
نفسیاتی رویہ کس قدر اہم چیز ہے کسانوں میں علم کی کمی نہ تھی۔ انہیں یہ خوب معلوم تھا کہ یہ بیج واقعی بہت

عمدہ ہیں مگر انہیں تو حکومت کی نیت پر شبہ تھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ بیج انکے اپنے بیج ہیں اور صرف حکومت کے نہیں۔ تو انہوں نے نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ انہیں استعمال کیا کسانوں نے افسروں کی طرف سے اپنا رویہ کیوں بدل دیا اسکا جواب اس رپورٹ میں ملتا ہے جو اس سارے واقعہ کے متعلق شائع کی گئی اسمیں لکھا ہے کہ افسروں نے (تربیت یافتہ دیہی کارکنوں نے) کسانوں کے ساتھ نہایت اچھا اور مساویانہ سلوک کیا اور انکی باتنی عزت و قدر کی کہ کسانوں کو ان افسروں کے ساتھ اسکے بدلے اسی قدر احترام اور برابری کا سلوک کرنا پڑا اسلئے کہ اس سے پہلے تو کبھی کسی نے انکے ساتھ ایسا عمدہ سلوک نہ کیا تھا!

جنوبی امریکہ میں ایک تجربہ اسی طرح جنوبی امریکہ میں ایک دفعہ حکومت کے کسی افسر نے گاؤں میں کنواں کھدوانا شروع کیا گاؤں میں کنوئیں کی شدید ضرورت تھی۔ اس سے لوگوں کو واقعی بہت فائدہ تھا لیکن دیہات والوں نے اسکی پرزور مخالفت کی یہاں تک کہ آخر میں کنوئیں کی کھدائی روک دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ متعلقہ ماہر نے کام شروع کرنے سے پہلے گاؤں کے سربراہوں کی رائے نہ لی تھی۔ پردیسیوں کا کیا اعتبار اور اگر انکی مدد کے بغیر گاؤں میں کوئی بڑا اصلاحی کام ہو جاتا۔ تو انکی عزت و وقار میں کمی آجاتی حکومت کا افسر اپنے کام میں ہوشیار ذہین اور بے غرض آدمی تھا لیکن اسے دیہاتیوں اور دیہات کے کاموں کا تجربہ نہ تھا۔ اس نے وہی کیا جو اسکے "خیال" میں درست تھا۔ اگر وہ سارے حالات کا جائزہ لے لیتا اور گاؤں کے چودھریوں سے بھی مل لیتا تو شائد اسے ان دقتوں کا سامنا کرنا نہ پڑتا! اسی لئے ہم نے اس کتاب میں شروع ہی سے اس بات پر زور دیا ہے کہ معاشرتی نفسیات نظریات کا کوئی سلسلہ نہیں ہے کہ جسے پڑھ کر ازبر کر لیا جائے۔ یہ تو طریقہ ہے جسمیں یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان گروہوں میں کسطرح رہتا اور کام کاج کرتا ہے۔ اسکی مدد سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ان گروہوں کے رکن ہونے کی حیثیت سے ہم کیونکر ایک دوسرے کی زندگی بہتر بنا سکتے ہیں۔

اس باب کا مقصد اس سارے باب کا یہی ایک مقصد تھا کہ مادی اور روحانی ترقی

کے مابین جو تعلقات ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی جائے چنانچہ ان صفحات میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مادی ترقی کا انحصار عوام کی قوتوں اور صلاحیتوں کو آزاد کرنے پر ہے اور معاشی قوت حاصل کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نفسیاتی اور روحانی مسئلہ ہے۔ زیر نظر باب میں اس مسئلہ کو ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے پاکستان میں لوگ رشوت سفارش۔ خود غرضی اور اقربا پروری کے سبب بے حد پریشان اور نالاں ہیں۔ اسکے برعکس امریکہ میں لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر وہ ہر دل عزیز ہونے کے لئے گروہی وحدت کے پیچھے پڑے رہے تو انکی انفرادیت ختم ہوجائے گی۔ ہر ملک کی مشکلات کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے لیکن بنی نوع انسان کی بنیادی مشکلات ہر جگہ یکساں ہیں۔

آخر میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانہ بڑی بڑی تبدیلیوں کا زمانہ ہے، اسمیں ساری دنیا میں ایسے ایسے انقلاب آئے ہیں جنکی مثال انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے اسلئے اگر ہمارے سامنے نئی نئی مشکلات آن پڑی ہیں تو اسمیں تعجب کی کوئی بات نہیں تکنیکی ترقی جہاں ہمارے مسائل حل کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے وہاں وہ نئے نئے مسائل بھی پیدا کر دیتی ہے۔ معاشرتی نفسیات دان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ان مشکلات اور مسائل کو سمجھیں اور ایک نئی اور بہتر دنیا تعمیر کرنے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔

دسواں باب

تفہیم کے معانی اور اکتساب کے ذرائع

معاشرتی نفسیات کا مطالعہ دراصل انسانوں ہی کا مطالعہ ہے کیونکہ معاشرتی مسائل انہیں کے مسائل ہوتے ہیں اور وہ خود ہی ان کے وجود میں آنے کا سبب ہوتے ہیں۔ اگر ہمارا یہ مطالعہ ہمیں انسانی تعلقات کو نسبتاً اچھی طرح سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کرتا ہے تو اسکے بیکار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

تفہیم کے مختلف معانی

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کو سمجھنے یا انہیں جاننے سے ہماری کیا مراد ہے۔؟ لفظ "تفہیم" یا "سمجھنا" دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) حقائق و اصول کا درک یا علت و معلول کا جاننا یا بطور روزمرہ استعمال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ وہ شخص علم کیمیا کو سمجھتا ہے میں جانتا ہوں کہ ٹائپ رائیٹر کیسے چلتا ہے۔ ڈاکٹر "سمجھتا ہے" کہ مریض کو کیا مرض ہے کسان "جانتا" ہے کہ فصل کیسے اگائی جاتی ہے یا اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ماہر نفسیات لوگوں کے کردار، محرکات، صلاحیتوں اور ماحول سے انکی عدم مطابقت وغیرہ سب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور سائنس دان چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے

انکی جماعت بندی کرتا ہے اور نہ صرف ان پہناووں کو "جانتا" ہے بلکہ انکے متعلق کوئی پیشین گوئی بھی کر
سکتا ہے۔ ان تمام مثالوں میں تفہیم کا مفہوم بہت واضح ہے تفہیم کے ایک اور معنی بھی ہیں مثلاً ہم کہتے
ہیں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دوست مجھے "سمجھتا ہے" وہ خوب جانتا ہے کہ میرے کیا احساسات
ہیں کیونکہ وہ میری ہی طرح محسوس کرتا ہے۔ اگر مجھے شدید دکھ ہو یا میں کسی امر میں انتہائی مایوس ہو
جاؤں تو وہ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اچھی طرح "سمجھتا ہوں" کہ تم پر کیا بیت رہی ہے
ایسے وقتوں میں وہ میرا اسطرح "مطالعہ" نہیں کرتا جسطرح کہ وہ کسی کیڑے کو یا موٹر کار کے
انجن کا جائزہ لیتا ہے۔ گویا میرے متعلق اسکا مطالعہ محض "خارجی" نہیں ہوتا بلکہ میرے احساسات اور
محسوسات اسکے اپنے احساسات و محسوسات ہو جاتے ہیں یعنی وہ میری ہی طرح سوچتا ہے اور میری
ہی طرح محسوس کرتا ہے اور گردوپیش کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ میری آنکھوں سے
بھی دیکھتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں اور میرا ایک دوست پہاڑوں کی سیر کر رہے ہیں، اچانک میرے
دوست کو کچھ دور پر درختوں سے پرے کوئی جاذب توجہ چیز نظر آتی ہے اور وہ مجھے متوجہ کرکے
اسطرف اشارہ کرتا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ جس چیز نے اسے متاثر کیا ہے، میں بھی اس سے
لطف اٹھاؤں چنانچہ میں یہ بات "سمجھ" جاتا ہوں اور اسکے دوش بدوش اس نظارہ سے محفوظ ہوتا
ہوں جس نے چند لمحے پہلے اسکا دامنِ دل اپنی طرف کھینچا تھا۔ زیر نظر باب میں سمجھنے کو نہیں
دوسرے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور افراد یا لوگوں کے مختلف گروہوں کے درمیان جو اس
قسم کی باہمی "سمجھ" پیدا ہو جاتی ہے ۔ اگلے چند صفحوں میں وہی موضوع بحث ہے۔
کسی دوسرے آدمی کو سمجھنے کے یہ معنی نہیں کہ اسکے خیالات اور آرا سے کلی اتفاق کر
لیا جائے۔ اگر آپ رشید کو "سمجھتے" ہیں تو اسکے یہ معنی نہیں کہ آپ اسکی ہر موقعہ پر ہاں میں ہاں ملاتے
ہیں۔ یا فرض کیجئے میں نہایت افسردہ رہا ہوں۔ اور آپ کا خیال ہے کہ مجھے اسقدر غمگین نہ ہونا
چاہیئے، حالات اتنے خراب تو نہیں ہیں جتنے میں سمجھ رہا ہوں مجھے چاہیئے کہ اپنا قنوطی نقطہ نگاہ
بدل دوں اور رجائی ہو جاؤں اسکے باوجود اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے میری طرح محسوس

کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لیتے ہیں جو مجھے شکستہ خاطر بنا رہی ہے تو آپ مجھے "سمجھنے" میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے آپکو کسی کی جگہ رکھ کر اسی کی طرح محسوس کرنا اور سوچنا بھی اسکو سمجھنے کے مترادف ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی سے اتفاق رائے ہونے کی صورت ہی ہو تو ہم کہیں کہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔ ایک مشہور نفسیاتی طریق علاج[1] کا دارومدار اسی قسم کی سمجھ پر ہے جس میں مریض کو اپنی اصلاح اور علاج کی راہ خود معلوم کرنے میں ڈاکٹر کم سے کم مدد کرتا ہے کیونکہ نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس قسم کی "سمجھ" کی مدد سے لوگوں کے باہمی تعلقات نسبتاً زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں وہ مقابلتاً زیادہ خوش بھی ہو سکتے ہیں اور بعض جگہ انکے درمیان بے جا تکلفات کے باعث جو بیگانگی ہوتی ہے وہ بھی اسی نوع کی سمجھ سے مٹائی جا سکتی ہے۔

کسی دوسرے کے نقطۂ نگاہ کا صحیح جائزہ

اب آئیے ذرا تفصیل سے یہ دیکھیں کہ کسی خاص موضوع پر کسی شخص کا نقطۂ نگاہ نسبتاً اچھی طرح کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں اور آپ آپس میں بحث کر رہے ہیں۔ آپ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور میں اپنا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے کمزور دلائل سامنے رکھ کر انکا رد پیش کرتے ہیں۔ کیا اس طریق کار سے ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو اچھی طرح سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ غالباً نہیں۔ کیونکہ موضوع کے حق میں میں نے جو کمزور دلیلیں پیش کیں ان سے صرف دلائل کی تعداد بڑھانا مقصود ہے لیکن میرے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتیں میں نہیں چاہتا کہ آپ انہیں اہم سمجھیں بلکہ میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آپ صرف ان دلائل کو سامنے رکھیں جنہیں میں خود اہم اور وزنی سمجھتا ہوں یعنی آپ زیر بحث مسئلہ کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھیں جس سے کہ میں دیکھتا ہوں۔ اپنے زاویہ نگاہ کی وضاحت کرتے وقت میں زیر بحث مسئلہ کو آپکے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتا میں بس اس انتظار میں رہتا ہوں کہ آپ اپنی بات ختم کریں اور میں اپنے دلائل شروع کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ اسطرح ہم دونوں ایسے دلائل بھی پیش کر دیں جنکے وزنی ہونے کے متعلق

1 "Non Directive" or Client - Centered.

خود ہمیں زیادہ یقین نہ ہو۔ اور جب بحث کسی نتیجے پر پہنچتی دکھائی نہ دے تو ہم خود یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمارا مخالف نہایت ضدی اور متعصب آدمی ہے اور معمولی حقائق سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا ہے چنانچہ اکثر موقعوں پر یہی ہوتا ہے پھر ایک دوسرے کو صحیح طریق پر سمجھنے کے لئے کیا کیا جائے؟ ذرا یہ طریقہ استعمال کر کے دیکھئے میں آپ سے کہوں کہ آپ اپنا نقطہ نگاہ واضح کریں تاکہ میں اپنی جگہ پر یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ اس سارے مسئلے کی آپکے نزدیک کیا اہمیت ہے اور صرف ان نقطوں پر توجہ مرکوز کر دوں جنہیں آپ نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے ذہنی طور پر آپ کا ہمنوا بن جاؤں اور آپ ہی کے زاویہ نگاہ سے موضوع بحث کا جائزہ لوں مگر اسکا اندازہ کیونکر کیا جائے کہ مجھے آپکا نقطہ نگاہ سمجھنے میں کامیابی ہوئی کہ نہیں؟ عالم نفسیات کی رائے ہے اسکے لئے مجھے کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا پڑے گا کہ میں اپنے مخالف سے کہوں کہ دیکھئے آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ غالباً یہ ہے کہ .... آپکو اختیار ہے کہ جہاں آپ کو مجھ سے اختلاف ہو آپ مجھے ٹوک دیں اور میری اصلاح کر دیں اور اگر آپ چاہیں تو از سر نو اپنا نقطہ نگاہ بیان کر دیں تاکہ میں پھر کوشش کروں کہ جو کچھ میں سمجھا ہوں اسے پیش کروں۔ آپکے الفاظ دہرانا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ اپنے الفاظ میں آپ کا مدعا بیان کرنا مقصود ہے۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو باتیں آپ نے "اب" یعنی مزید وضاحت کے بعد۔ بیان کی ہیں انکو سمجھوں۔ کیونکہ جب کسی آدمی کا ذہن پوری طرح فعال ہو تو اس کا نقطہ نگاہ ہمیشہ بالکل ایک نہیں رہتا۔ جب صورت حال یہ ہو تو اس بات کی کوشش اکثر فضول ہوتی ہے کہ مخالف کی کوئی ایسی دلیل پکڑ لی جائے جو اسکے اپنے کسی سابقہ بیان کی نفی کرتی ہو۔ میں اگر آپ کو واقعی سمجھنا چاہتا ہوں تو مجھے ہر آن اور ہر لمحہ آپکو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ آپکی کسی گذشتہ بات پر اگر میں اڑ جاؤں تو عین ممکن ہے کہ آپکو سمجھنے میں ناکامیاب رہوں۔

اپنا اپنا نقطہ نگاہ

ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مجھے آپ سے اتفاق نہ ہو ہم دو مختلف آدمی ہیں اور ہمارا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ دوسروں کے نقطہ نگاہ کو سمجھنا اپنے زاویہ نگاہ کو ترک کر دینے کے مترادف تو نہیں ہے لیکن اسکا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے

کہ ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کن باتوں میں ہمیں دوسروں سے اختلاف ہے اور کن میں اتفاق۔ اختلاف اور اتفاق کے پہلو زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جب میں آپکو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو گویا میں آپکو دعوت دیتا ہوں کہ آپ جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اسے واضح طور پر بیان کر دیں اور اسی طرح جب آپ مجھے سمجھنے کی سعی کرتے ہیں تو مجھے اپنے خیالات اور احساسات آپ تک پہنچانے کی پوری پوری ہمت ہوتی ہے نتیجتاً ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اپنے احساسات و اعتقادات وغیرہ سے نسبتاً زیادہ واقف و باخبر ہو جاتے ہیں۔

ثقافتی گروہوں کا ایک دوسرے کو سمجھنا اور متعلقہ مشکلات

یہ تو تھا دو افراد کے باہم ایک دوسرے کو "سمجھنے" کا ایک موزوں طریق کیا ایک ہی ثقافت کے مختلف گروہ یا مختلف ثقافتی گروہ بھی ایک دوسرے کی پسند و ناپسند رسوم اور دلچسپیوں یا مذہبی اور اخلاقی اعتقادات اور خیالات کو اسی طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں میرا اپنا طریق کار مجھے صحیح اور درست دکھائی دیتا ہے اور دوسروں کی روش ہمیشہ غلط اور نا واجب نظر آتی ہے لیکن کیا میں انکی آنکھوں سے بھی کبھی کسی چیز کا جائزہ لے سکتا ہوں؟ اگر میں ایسا کر سکوں تو میں یقیناً انکو کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا ہوں محض دوسرے انکی رسوم اعتقادات وغیرہ کے سرسری مطالعہ سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا؟ ذرا غور کیجئے کہ ایک بہت بڑی عمارت ہے اور آپ ہمیشہ ایک ہی زاویہ سے اسکو دیکھتے ہیں ممکن ہے آپ کا مطالعہ درست رہے لیکن یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ آپکا مطالعہ جزئی اور محدود ہوگا۔ اگر آپ عمارت کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھ لیں یا مختلف زاویوں سے اسکا جائزہ لینے کی سعی کریں تو آپ کے جملہ نتائج اور تاثرات نہ صرف درست ہونگے بلکہ ہر لحاظ سے انکا اطلاق پوری عمارت پر ہوگا۔

چیزوں کو اس انداز سے سمجھنے کی سعی کرنا آسان نہیں ہے ہم بچپن ہی سے کچھ ایسی عادتیں تعمیر کر لیتے ہیں کہ دوسروں کی طرف سے سوچنا اور محسوس کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے بھی چیزوں کا جائزہ نہ لے سکیں۔ اگر

کبھی کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو تھوڑی دیر کے لئے سوچئے اور دیکھئے کہ کیا آپ وہی سمجھ رہے ہیں جو آپ کے تاثرات ہیں۔ ایسا کرنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم کس حد تک ٹھیک سمجھ رہے ہیں اور کہاں بھٹک گئے ہیں۔

مشکل نمبر۱ دوسروں کا نقطۂ نگاہ معلوم کرنے وقت متعدد اور مخصوص مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً ایک مشکل تو اس وقت پیش آتی ہے جب ہم کسی کردار کا جائزہ لیتے وقت مخالف کے تو عام کردار کو سامنے رکھتے ہیں اور اپنے مثالی اصولوں کو حالانکہ ہم دونوں اصولی طور پر اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمیں دیانت دار ہونا چاہیئے مگر عین ممکن ہے کہ بعض مواقع پر ہم دونوں عملی طور پر دیانت دار نہ رہیں ہم اپنے حقائد کا دوسروں کے روزمرہ کے افعال سے موازنہ کرتے ہیں۔ اور دوسرے بھی اپنے عام افعال کو بھول جاتے ہیں اور صرف اعلیٰ آدرشوں کا حوالہ دیتے رہتے ہیں حالانکہ ایسا کرتے وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے روزمرہ کے افعال پر کڑی نظر رکھتے ہیں جو کبھی ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے مثال کے طور پر اگر ہم امریکیوں کو ان کی بعض غیر جمہوری سرگرمیوں پر ٹوکیں تو ہو سکتا ہے وہ یہ جواب دیں کہ اس سے کیا ہوتا ہے ہماری قوم جمہوریت کی علم بردار ہے۔ اسی طرح اگر کوئی پاکستانیوں کو متوجہ کرکے یہ کہے کہ دیکھئے صاحب آپ کا یہ اقدام اسلامی جذبہ اخوت کے منافی ہے تو جواب عموماً یہی ملتا ہے کہ اسلام میں سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایسی کوتاہیوں کے باوجود ہم دوسروں کو کبھی معاف نہیں کرتے اور ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کو جتلانے سے کبھی نہیں چوکتے۔

مشکل نمبر۲ پچھلے باب میں ہم نے وفا کیشی کی نشوونما کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ بتایا تھا کہ کسی خاص فرد یا افراد کے کسی گروہ سے وفا نباہنا آسان ہے اور کسی خاص اصول سے وفاداری کا دم بھرنا نسبتاً مشکل ہے۔ دیانت داری انصاف یا وفا کا صحیح مفہوم سمجھنے سے پہلے ہی بچہ اپنے والدین کھلونوں یا پالتو جانوروں سے محبت و انس کرنا سیکھ چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاسی اقتدار کی کشمکش میں اصولوں سے بحث کم ہوتی ہے اور ذاتیات کا ذکر زیادہ رہتا ہے

اور لوگ ووٹ دیتے وقت بھی اصولوں کی نسبت افراد کا عموماً زیادہ خیال کرتے ہیں قومی پرچم
کی عظمت کی خاطر جان لڑا دینا تو آسان ہے مگر جس اصول یا آدرش کا وہ مظہر ہوتا ہے اسکے لئے
جان کی بازی لگانا اتنا آسان نہیں ہے اسلئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جتنا عرصہ کوئی آدمی یا
کوئی گروہ حزب مخالف میں رہتا ہے وہ آزادی گفتار پر بے حد زور دیتا رہتا ہے اور اسے انسان کا
پیدائشی و بنیادی حق سمجھتا ہے مگر اقتدار کی کرسی حاصل کرتے ہی اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں
کی آزادی گفتار سلب کر لی جائے کیونکہ اپنی جماعت کا وفادار ہونا جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ور آزادی
گفتار ایسے اصول کی حفاظت مشکل ہے۔ اسی طرح جب ہمارے گروہ کے مفادات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے
تو ہمیں بے حد غصہ آتا ہے لیکن جب ہمارا اپنا گروہ کسی دوسرے کے مفادات کو پامال کرتا ہے
تو ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

مشکل نمبر ۳

ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی دوسرے گروہ کے ممبر بھی آخر انسان ہوتے
ہیں انکی بھی بحیثیت فرد کوئی اہمیت ہوتی ہے وہ کسی گروہ کے محض کل پرزے نہیں
ہوتے انکی ذات کے متعلق کوئی ایک آدھ خصوصیت جو انہیں دوسرے سے ممیز کرتی ہے چن
لی جاتی ہے اور پھر اسکے مطابق انہیں ایک گروہ میں جمع کر دیا جاتا ہے مثلاً وہ چینی جن کو غیر
ملکی لوگوں سے ملنے کے زیادہ موقعے نہیں ملتے اور انہیں ذاتی طور پر جاننے کا اتفاق نہیں ہوتا
تمام غیر ملکی لوگوں کو "لمبی ناکوں والے لوگ" کا خطاب دے دیتے ہیں کیونکہ انکے مقابلے میں
ان سب لوگوں کی ناک قدرے لمبی اور اونچی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مغربی لوگ چینیوں کو "ٹیڑھی[1] آنکھوں
والے" کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ انکی آنکھ کے گوشہ پر ایک خاص قسم کی شکن پڑی ہے۔ جوں جوں آپس
ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقعہ ملا اور انہوں نے ایک دوسرے کو بحیثیت افراد کے
جاننا شروع کیا اس قسم کے معمولی اور فضول سے اختلافات کی اہمیت جاتی رہی تاہم اس نوع
کے بندھے ہوئے معیار اکثر باقی رہ جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے متعلق ہماری واقفیت کو

1. Slant eyes.

بسا اوقات کثیف کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم ایسے تمام حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو مذکورہ بالا تعصبات کو تقویت نہیں دیتے مثال کے طور پر برگنٹ کا یہ خیال ہے کہ عورتیں کبھی منطقی طور پر نہیں سوچ سکتیں۔ جب بھی کوئی دوسرا آدمی اسکے سامنے عورت کی لکھی ہوئی کوئی چیز پڑھتا ہے تو وہ فوراً یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ چھوڑیئے اسمیں کیا رکھا ہوگا۔ لیکن جب وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زیر نظر تحریر میں استدلال عین منطقی ہے تو اسکا جواب یہ ہوتا ہے یہ عورت تو مردوں کی طرح لکھتی ہے کیونکہ اسکی تحریر میں مخصوص نسائی انداز کا فقدان ہے۔ غرضکہ عورتوں کی قوت فکر و استدلال کے متعلق اس نے جو نظریہ قائم کر رکھا ہے وہ اسے کسی قیمت پر بھی بدلنا نہیں چاہتا۔ غالباً ایسے آدمی کے نظریات میں کوئی لچک نہیں ہوتی اور موزوں حقائق کی موجودگی میں بھی وہ اپنا ہی راگ الاپتا رہتا ہے اسی طرح اگر کسی آدمی کا یہ خیال ہو کہ ہر دکاندار دھوکے باز ہوتا ہے اور اگر وہ انکے دام میں نہیں پھنسا تو اسکا سبب یہ ہے کہ اس نے ہر ممکن احتیاط برتی نہ یہ کہ دکانداروں نے دھوکہ دینے میں کوئی کمی کی ہے بعینہٖ اگر مجھے کوئی آدمی ناپسند ہے اور وہ کوئی نامعقول حرکت کرے تو میں اسے بُری طرح ہوں اور ہر ملنے جلنے والے آدمی کو بتاتا ہوں کہ وہ آدمی واقعی نامعقول ہے اور عقل کی کوئی بات کر ہی نہیں سکتا لیکن یہی حرکت اگر میرا کوئی دوست کرے تو میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا اگر حکومت وقت جسے میں پسند کرتا ہوں شہری آزادی پر پابندیاں لگا دے تو میں اسے درست قرار دیتا ہوں اور اسکا جواز یہ پیش کرتا ہوں کہ ملکی دفاع اور سالمیت اسی بات کے متقاضی ہیں کہ تخریب پسند عناصر کو سختی سے دبا دیا جائے اگر یہی پابندیاں کوئی دوسری حکومت عائد کر دے تو میں اسے آمریت اور فسطائیت سے موسوم کرتا ہوں۔ آج تک شاید ہی کسی قوم نے اپنے آپکو جارحانہ اقدام کا ملزم گردانا ہو۔ ہر ملک اپنے آپکو امن پسند سمجھتا ہے جب بھی کوئی جارحانہ اقدام کیا جاتا ہے تو ذمہ دار فریق مخالف ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے چنانچہ ہر قوم یہ سمجھتی ہے کہ جب بھی کبھی اس نے کوئی جنگ لڑی تو اپنی حفاظت ہی کی خاطر لڑی۔ کوئی اپنا قصور تسلیم نہیں کرتا ہمیشہ دوسروں کو مورد الزام قرار دیا جاتا ہے۔

جب انسانی فطرت کا خاصہ یہ ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو سمجھنا اور انکی ثقافت کو بہ نظر استحسان دیکھنا کیونکر ممکن ہے۔ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے بشرطیکہ ہم ان دشواریوں کو نگاہ میں رکھیں اور ان پر قابو پانے کی پوری پوری سعی کریں ہمیشہ اپنے زاویہ نگاہ سے چیزوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کے نقطہ نگاہ کو بھی اہم جانیں۔

تمثیلی طریقہ

اس طریق کار کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی ہے جو اس سلسلہ میں نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اسے تمثیلی طریقہ[1] کا نام دیا جاتا ہے۔ عمرانیات اور معاشرتی نفسیات کے عالم اس طریقہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسکی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسکی مدد سے ہم مختلف معاشرتی تمثیلیں ادا کرنا سیکھتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے یا تو ہمیں خود ممثل بننا پڑتا ہے یا دوسروں کو یہ تمثیل پیش کرتے وقت مشاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ ٹیکنیک اسکی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ فرض کیجئے ہمیں مختلف مراتب کے باہمی امتیاز کا مطالعہ کرنا ہے تو ہم چند لوگوں پر مشتمل ایک گروہ کے مختلف افراد کو وہ مراتب بانٹ دیتے ہیں یعنی مثال کے طور پر ایک کو بنک کا افسر دوسرے کو غریب دکاندار اور تیسرے کو حکومت کے کسی محکمے کا افسر بنا دیتے ہیں۔ اب غریب دکاندار اور سرکاری افسر دونوں باری باری بنک میں اس غرض سے داخل ہوتے ہیں کہ بنک سے کچھ روپیہ قرضہ مانگا جائے تینوں آدمی اپنی جگہ اپنے آپکو بنک کا افسر، دکاندار اور سرکاری افسر محسوس کرنیکی کوشش کرتے ہیں اور پھر کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جو عین فطری ہو اور جس سے ظاہر نہ ہو کہ کسی سوچی سمجھی ہوئی تدبیر کے تحت یہ اقدام کیا گیا ہے گویا وہ اتنی کامیابی سے اپنا اپنا رول ادا کریں کہ بجائے اداکاری کے یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ واقعی بنک کے افسر، دکاندار اور سرکاری ملازم ہیں۔ گروہ کے دوسرے ممبروں کی حیثیت خاموش تماشائی کی ہوتی ہے۔ کچھ منٹوں کے بعد گروہ کا لیڈر اس "کھیل" کو ایک دم سے بند کر دیتا ہے اور متعلقہ تینوں افراد کے علاوہ باقی سب ممبر یہ بحث کرتے ہیں کہ ممثلوں نے ایک دوسرے کے متعلق کیا "محسوس" کیا اور انکا ایک دوسرے کے متعلق جو احساس تھا اسکو تبدیل کیا جا سکتا ہے یا نہیں

1. Role-playing & Sociology.

اور ساتھ ہی اسکے جو طرزِ عمل وہ اختیار کرتے ہیں انکی نوعیت پر بھی گروہ کے دوسرے ممبر اپنی
رائے پیش کرتے ہیں۔ اس تبادلۂ خیال کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ متعلقہ افراد کی "ایکٹنگ" پر تنقید کی جائے
اگر آپ یہ "محسوس" کرتے ہیں کہ دکاندار حقیقی دکاندار معلوم نہیں ہو رہا تھا تو آپ خود دکاندار کی حیثیت
اختیار کرکے یہ جاننے کی سعی کرتے ہیں کہ دکاندار ہونا کیا ہوتا ہے بحث مباحثہ کے بعد مثلاً یہ
یہ پوچھا جاتا ہے کہ کھیل کے دوران میں اسکے اپنے "احساسات" کیا تھے اور انہیں کیونکر تبدیل
کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اداکاری کا مقصد اور مدعا یہ ہوتا ہے کہ معمولی معاشرتی حالات کو عام لوگوں
کے احساسات کے رنگ روپ میں دیکھا جائے ہم اپنے آپکو مختلف لوگوں کی حیثیت میں رکھ
کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتے اور محسوس کرتے ہیں مختصر یہ کہ اس نفسیاتی
طریق کار سے ہم دنیا کو دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے دیکھتے اور جانتے ہیں۔

شروع شروع میں اس قسم کی "اداکاری" بہت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ متعلقہ افراد "کامیاب"
اداکار بننے کی فکر کرنے لگتے ہیں اور بجائے اسکے کہ وہ اپنے آپ کو مطلوبہ اداکاری میں محو کر دیں
اور جو کچھ محسوس کریں کر گذریں اچھی اور کامیاب "ایکٹنگ" کے چکر میں پڑ جاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ
اپنے آپ کو دوسروں کے قالب میں ڈھالنا آسان ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات اداکاری کے ذریعہ کسی حقیقی واقعہ کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً چند
دن ہوئے ہمارے ایک واقف کار انور کی کسی سے "تو تو میں میں" ہو گئی۔ اس لڑائی کا جائزہ لیجیے
انور سے کہیے کہ وہ اس سارے ماجرے کا حال چند لفظوں میں اختر سے بیان کرے۔ پھر
دونوں اس قصہ کو دہرائیں۔ پہلے انور انور کا پارٹ کرے اور اختر اسکے مخالف کا! پھر اختر انور
بن جائیں اور انور اختر مقصد یہ نہیں کہ اصل لڑائی دہرائی جائے بلکہ مدعا یہ ہے کہ "اصل واقعہ" کو پیش نظر
رکھ کر اسکے مطابق عین فطری اداکاری کی جائے ممکن ہے جو اس "اداکاری" کو دیکھ رہے ہوں انمیں
سے ایک شخص کا "جی" یہ چاہے کہ وہ خود اختر یا انور کا پارٹ ادا کرکے اپنے احساسات کا جائزہ لے
اسطرح اکثر اوقات اپنے سے متضاد طبع کے آدمی کا طرزِ عمل اختیار کرنا بہت مفید ثابت ہوتا کہ

